میرے حصے کی دنیا

خود نوشت

پرتپال سنگھ بیتاب

میرے حصّے کی دُنیا

(سوانح عُمری)

پرتپال سِنگھ بیتابؔ

میرے حصے کی دُنیا (سوانح عُمری)

مصنف : پرتپال سنگھ بیتاب (پیدائش ۲۶ جولائی ۱۹۴۹ء)

موبائل-۰۹۴۱۹۱۸۰۸۲۴

پرنٹر : مہاویر پریس، وارانسی

سرورق : عظمیٰ اسکرین، وارانسی

کمپوزنگ : دیپک آرتی (سارتھ کریئیشنز) جانی پور کالونی، جموں توی

رابطہ: 9858667006, 9419488170

سنِ اشاعت : ۲۰۲۰

تعداد : ۵۰۰ (پہلا ایڈیشن)

ناشر : Tahreek-e-Adab Publication

Urdu Ashana 167 Afaq Khan ka Ahata Manduadih

Bazar,Varanasi-221103(U.P) cell- 9936957330

e.mail: tahreekeadab2008@gmail.com

Mere Hissae Ki Duniya – Autobiograph of

Pritpal Singh Betab IAS (Rtd.)

Year of Publication-2020

ISBN:978-81-942142-0-5

Rs.500/-

اِنتساب

اُن کے نام

جو سچ کو سمجھتے ہیں

سچ کہنے کی جُراُت رکھتے ہیں

سچ سُننے کی ہمّت رکھتے ہیں

اور ہمیشہ سچ کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں

جو سُنا تھا اور تھا لیکن جو دیکھا اور ہے
ہم نے بویا اور کُچھ ہم نے جو کاٹا اور ہے
(پرتپال سنگھ بیتابؔ)

پیش لفظ

عُمر کے پچاس سال مُکمّل ہوتے ہی سوانح عُمری لِکھنے کا بھوُت میرے سر پر سوار ہوگیا۔ ایک خیال یہ تھا کہ فی الحال عُمر کی آدھی صدی کا قِصّہ لِکھ دِیا جائے۔ باقی جو بچے گی اُس کو بعد میں دیکھ لوُں گا۔ کئی بار لِکھنا بھی شروع کِیا لیکن کبھی کِسی وجہ سے تو کبھی کِسی وجہ سے اِس کام کا آغاز ہی ڈھنگ سے نہ ہوسکا۔ سب سے بڑی اڑچن یہ تھی کہ زِندگی کے تمام تر تلخ وتُرش حقائق کو کیسے قلم بند کِیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ آدمی دُنیا کا سب سے زیادہ خطرناک جانور ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آدمی کے اندر اُن تمام جانوروں کی خصلتیں موجود ہیں جن کے وجودی مراحل سے گُزر کر اُس نے اِرتقا کی منزلیں طے کی ہیں۔ خصلتیں تو اُن تمام جانوروں کی لاشعور میں موجود ہیں مگر شعور میں یعنی یاد میں فوری طور پر صِرف بندر سے آدمی تک کا سفر ہی موجود ہے۔ ہاں مگر آدمی کو وہ سب یاد رہتا ہے جو اِس زِندگی میں اُس پہ گُزرا ہوتا ہے۔ اپنے اعمال جب یاد کے پردے پر ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں تو اُن میں کئی ایک تو وحشی سے وحشی جانوروں کی حرکتوں سے مِلتے جُلتے نظر آتے ہیں۔ خطرناک سے خطرناک حرکتیں، گندی سے گندی حرکتیں، کئی حرکتیں تو سرزد ہو چُکی ہوتی ہیں، کئی حرکتوں کے سرزد نہ ہوسکنے کا ملال باقی رہ جاتا ہے۔ کئی

حرکتوں کے سرزد نہ ہو سکنے پر آدمی خُدا کا لاکھ لاکھ شُکر ادا کرتا ہے۔

اپنے اندر کا سچ سب سچ لِکھنا کِتنا مُشکل ہے اِس بات کی صحیح معنوں میں سمجھ صِرف اُس وقت آ سکتی ہے جب آپ سب سچ لِکھنے بیٹھتے ہیں۔ اُف توبہ! کئی کئی باتوں پر تو خُود سے گھِن آنے لگتی ہے۔ گورُو نانک دیو جیسے مہاپُرش نے شاید اِسی لِئے کہا تھا،

بھُلّن اندر سب کو(ئی)
ابھُلّ گورُو کرتار۔

سچ کا سامنا کر سکنے میں ناکام رہ جانے کی وجہ سے کئی بار مَیں نے اپنی سوانح عُمری لِکھتے لِکھتے چھوڑ دی۔ اِسی اُدھیڑبُن کے ایّام میں کہیں مندرجہ ذیل نظم بھی معرضِ وجُود میں آئی تھی:-

میرے پاس بہُت سی رنگ برنگی
اعلیٰ قِسم کی خوبصورت ڈائریاں ہیں،
لیکن مَیں نے اپنی روزانہ ڈائری
کبھی نہیں لِکھی
حالانکہ مَیں لمحہ لمحہ
اپنی روزانہ ڈائری سوچتا رہتا ہُوں
کئی بار اپنی سوانح عُمری لِکھنے کا خیال
میرے دِل میں آ چُکا ہے
کئی بار اِس کا آغاز بھی ہو چُکا ہے

کبھی کِسی کبھی کِسی خوبصورت رنگ برنگی ڈائری پر

لیکن جب بھی کوئی کڑوا سچ راہ میں آیا

یہ کام وہیں چھوٹ گیا

اپنا سچ سب سچ لِکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے

شاید نا مُمکن

اکثر یہ سوچ کر حیران و پریشان ہو جاتا ہوں

کہ موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنا سچ

اِتنے خوبصورت رومانی انداز میں

کیسے لِکھ دِیا

جِسے پڑھنے کے بعد بھی

لوگ اُس کی عِزّت کرتے ہیں

اور اُسے مہاتما کہتے ہیں

میں حلفاً بیان کرتا ہوں کہ مَیں اپنی سوانح عُمری میں اپنی زِندگی کی تمام تر تلخ و تُرش سچّائیاں شامِل نہیں کر سکا۔ مَیں کوئی مہاتما نہیں ہوں ایک عام آدمی ہوں۔ مَیں سچ سچ سب سچ لِکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ لیکن میں یہ بھی حلفاً بیان کرتا ہوں کہ مَیں نے اپنی سوانح عُمری میں کُچھ بھی جھوٹ یا غلط نہیں لِکھا ہے۔ جِتنا سچ لِکھنے کی جرأت میں جُٹا پایا ہوں وہ صِرف سچ ہی نہیں بلکہ میری یادمیرے یقین اور میرے عِلم کے مطابق بالکل صحیح ہے۔ مَیں جانتا ہوں سچ کا یہ محدوُد حِصّہ بھی میرے لِئے کئی قِسم کی پریشانیاں پیدا کر سکتا ہے لیکن مُجھے اپنے ضمیر کا سامنا

بھی ہے۔حقائق کئی بار کڑوے بلکہ بہت کڑوے ضرور ہوتے ہیں۔

فی الحال اپنی پیدائش سے لے کر سرکاری نوکری سے اپنی سُبکدوشی تک یعنی عُمر کے 60 سال کو "میرے حصّے کی دُنیا" میں شامِل کر رہا ہوں۔ اکثر سوچتا ہوں کہ باقی ماندہ زِندگی کے معاملات و تجربات کا کیا ہوگا۔ پھِر سوچتا ہوں کہ اگر خُدا نے چاہا تو بچی کھچی عُمر کا حِساب کہیں آخرِ عُمر کے قریب میرے حصّے کی دُنیا کے ضمیمے کے طور پر لِکھوں گا لیکن یہ صِرف اُسی صورت میں ممکن ہو سکے گا اگر خُدا مجھے اِس کی مہلت دے گا۔

کبھی مُہلت مِلی تو سوچیں گے
زِندگی میں لِیا دِیا کیا ہے

پرتپال سِنگھ بیتابؔ

باب-۱

۱۹۴۷ء میں جہاں ایک طرف ہندوستان دوٹکڑوں میں بٹ کرآزاد ہورہا تھا اور نتیجتاً دونوں طرف ہجرت اور مارکاٹ کا ماحول تھا تو دوسری طرف ریاست جموں وکشمیر میں ایک عجیب قسم کی کشمکش کا ماحول تھا، ریاست کے مہاراجہ کی طرف سے ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ اِلحاق میں مُسلسل تاخیر کی وجہ سے ریاست کے کئی حِصّوں میں شورش، ہجرت اور عناد وفساد کا خودرو خودساختہ ماحول پیدا ہو چُکا تھا۔ جن حِصّوں میں مُسلم اکثریت تھی وہاں سے غیر مُسلم ہجرت کر رہے تھے اور جہاں ہندوُ آبادی اکثریت میں تھی وہاں سے مُسلم باشندے ہجرت پر آمادہ تھے۔

حالانکہ شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس نے سری نگر اننت ناگ اور بارہ مؤلہ کے تین ضِلعوں میں ہندو مُسلم فسادات ہونے دِیئے نہ اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں سِکھوں کے لئے ہجرت کرنے کی نوبت ہی آنے دی مگر جموں کے ہندو اکثریتی عِلاقوں میں مُسلم کُش فسادات اور مُسلمانوں کی ہجرت اور میرپور مظفّر آباد اور پونچھ جیسے مُسلم اکثریتی عِلاقوں میں ہندو سِکھوں کی قتل وغارت اور ہجرت کو روک سکنا اُن کے بس میں نہیں تھا یا شاید اِس کے لِئے اُنہوں نے کوشش ہی نہیں کی۔

قبائلی حملہ آور پاکستانی فوج کی مدد سے ایک طرف کشمیر میں مظفّر آباد سے ہوکر بارہ مؤلہ سے ہوتے ہوئے بڈگام تک پُہنچ چُکے تھے اور شہر سری نگر پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں تھے وہیں دوسری طرف میرپور کے پورے عِلاقے پر قابض ہو چکے تھے اور پونچھ کے باغ

،دتھان، پلندری، سُدھنوُتی وغیرہ علاقوں پر اپنا قبضہ مکمّل کرنے کے بعد شہر پونچھ پر حملہ کرنے کی تیاری میں تھے۔ قبائلی شہر پونچھ کے بالکل قریب تھے اور دریائے بے تار کے پار کی طرف شہر کے قریبی علاقوں پر قابض ہو چکے تھے۔

اِس دوران میں بھارتی فوج کا ایک سِکھ افسر پریتم سِنگھ جسے پونچھ میں برگیڈیر پریتم سِنگھ کے نام سے ایک ہیرو کے طور پر جانا جاتا ہے، پونچھ کو قبائلیوں کے حملوں سے بچانے کی کوششوں میں جُٹا ہُوا تھا۔ شہر پونچھ کے گردونواح سے آئے ہوئے ہِندو سِکھ مہاجر اُس کی رضا کارانہ مدد کر رہے تھے۔ قبائلیوں کے حملے کا خطرہ اِس قدر شدید تھا کہ برگیڈیئر پریتم سِنگھ نے بھارتی فوج کے ڈکوٹہ جہازوں کے ذریعے کُچھ ایک ہِندو سِکھ خاندانوں کو پٹھانکوٹ بھیجنا شروُع کر دِیا تھا۔

شہر پونچھ سے دریائے بے تار کے پار کی طرف کھڑی دھرم سال نام کا گاؤں قریب قریب قبائلیوں کی گرفت میں تھا۔ ہِندو سِکھ لوگ وہاں سے نِکل کر شہر میں داخل ہو چُکے تھے۔ انہی ہِندو سِکھ مہاجروں میں گیانی پریم سِنگھ کا کُنبہ بھی شامِل تھا۔ گیانی پریم سِنگھ اپنی ۵ سال کی بیٹی اور ۳ سال کے بیٹے کے ساتھ شہر پونچھ میں مہاجروں کی طرح بھٹک رہے تھے۔ اپنے دونوں بچّوں کو ننہال والوں کے پاس چھوڑ کر وہ ایک ڈکوٹہ جہاز پر سوار ہو کر پٹھانکوٹ چلے گئے۔ گیانی پریم سِنگھ سِکھوں کی مذہبی کِتاب گوُروگرنتھ صاحب میں درج کلام کو گانے والے ایک سِکھ راگی تھے۔ پٹھانکوٹ سے ہوتے ہوئے وہ اپنی اہلیہ اجیت کور کے ہمراہ ہِندوستان کے الگ الگ علاقوں مثلاً کانگڑہ، انبالہ، لکھنؤ، دہلی وغیرہ وغیرہ میں مہاجروں کی طرح بھٹکتے رہے اور حتّی الوسع گوُردواروں میں کیرتن کر کے (گوربانی کا

گائن کر کے) اپنا اور اپنی اہلیہ کا پیٹ پالتے رہے اور تھوڑا بہُت پیسہ اپنے بیٹے بیٹی کے لِئے پونچھ بھیجتے رہے جواب وہاں کے سکوُل میں داخل ہو چُکے تھے۔

گاؤں کھڑی دھرم سال حالانکہ بعد میں ہندوستان کے قبضہ والے عِلاقے میں آ گیا (بلکہ ایک طرح سے ہندوستان اور پاکستان کے قبضے والے کشمیر میں سرحد کی حیثیت اِختیار کرگیا) لیکن گیانی پریم سِنگھ کی مُسلسل ہجرت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ کیفیت یہ تھی کہ:-

خیمہ بستی کوئی نہ راس آئی
ہم وہ اُجڑے کہ پھِر بسے ہی نہیں

پھِر اُس کے بعد پاؤں ہمارے نہ جم سکے
ٹوٹے زمیں سے ہم تو اُڑا لے گئی ہوا

میری ہجرت عجیب ہجرت ہے
روز بستا ہوُں روز اُجڑتا ہوُں

ہندوستان بظاہر آزاد ہو چُکا تھا مگر افراتفری، تذبذب اور مہاجروں کی بازآبادکاری کے مسائل سے عوام اور سرکار برابر دوچار تھے۔

بیقراری اور بے چینی کے اِسی عالم میں گیانی پریم سِنگھ اور اُن کی اہلیہ مُسلسل بھٹکتے ہوئے انبالہ میں تھے (جو اُس وقت پنجاب میں تھا آج ہریانہ میں ہے) جب ۲۶ جولائی ۱۹۴۹ء کی صُبح قریب سات بجے اُن کے ہاں میری پیدائش واقع ہوئی۔ میں اُن کا تیسرا بچہ

تھا۔ میرے بعد بھی اُن لوگوں کے ہاں دو بیٹے اور ایک بیٹی نے جنم لیا۔ ظاہر ہے یہ لوگ بھی ہمارے والدین کی ہجرت کے عالم میں ہی پیدا ہوئے۔ اِس طرح ہمارے خاندان میں سب سے بڑی (بہن) ست نام کور، اُس سے چھوٹا (بھائی) گورچرن سِنگھ، اُس کے بعد مَیں، میرے بعد ایک بھائی امرجیت سِنگھ، پھر ایک بھائی ستِندر پال سِنگھ اور سب سے چھوٹی بہن نرِیندر کور ہیں۔ ہمارے ماں باپ مُسلسل ہجرت کے عالم میں مُجھے اور میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو ساتھ رکھتے تھے جب کہ بڑی بہن اور بڑے بھائی پونچھ ننہال ہی میں رہتے کیونکہ اُن دونوں کی تعلیم وہاں جاری تھی۔

والدین کے مُسلسل یہاں وہاں بھٹکنے کی وجہ سے میری اور مُجھ سے چھوٹے بھائی بہنوں کی تعلیم بُری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ مُجھے یاد ہے جب مَیں چھ برس کا تھا کُچھ عرصے کے لِئے مُجھے پونچھ شہر کے ایک گورنمنٹ پرائمری سکول میں داخل کروایا گیا تھا۔ مُجھے یاد ہے مَیں نے تختی پر گاچنی مل کر کانی سے بنائے ہوئے قلم سے اب پ ت ٹ ث لِکھنا سیکھا۔ مُجھے نہیں یاد کہ مَیں پہلی جماعت اُس مدرسے میں مکمّل کر سکا یا نہیں لیکن اِتنا ضرُور یاد ہے کہ دُوسری اور تیسری جماعت میں بھی کُچھ دیر مَیں اُسی سکوُل میں تختی پر اُردُو لِکھتا رہا اور سلیٹ پر چاک سے حِساب کے سوالات حل کرتا رہا۔ مُجھے یاد ہے حِساب کی کِتاب اُردُو میں تھی، شاید اُن دِنوں تک جموں و کشمیر میں اُردُو اپنی سرکاری زبان کی حیثیت میں پوری طرح سے فائز تھی۔ شاید اُن دِنوں ابھی جموں کشمیر کے سابقہ ہِندُو راجاؤں کی قائم کردہ سرکاری زبان اُردُو اپنے بھرپور تاثر کے ساتھ قائم و دائم تھی۔ بعد میں آنے والے جموں و کشمیر کے مُسلم حُکمرانوں نے اُردُو کی سرکاری زبان کی حیثیت محض آئین کی کِتاب تک محدُود کر دی تھی۔

مُجھے یاد ہے میری پہلی اور دُوسری جماعت کی تعلیم کِسی حد تک بستی شیخ جالندھر کے ایک چھوٹے سے پنجابی ذریعۂ تعلیم والے سکوُل میں بھی ہوتی رہی۔ یاد نہیں کہ اِن جماعتوں کے اِمتحانات مَیں نے پونچھ میں پاس کِئے یا پنجاب میں۔ مُجھے یہ بھی یاد نہیں کہ چوتھی اور پانچویں کی تعلیم مَیں نے کونسے سکوُل میں حاصِل کی۔ یاد ہے تو اِتنا کہ اِس دوران میں میرا ذریعۂ تعلیم اُرُدو ہی تھا۔ چاہے ہم لوگ پونچھ میں تھے یا پنجاب میں۔ پنجاب کے سکوُلوں میں اُردو کی پڑھائی کا کوئی اِنتظام نہیں تھا۔ اُردو ذریعۂ تعلیم کا تو سوال ہی نہیں۔ میری تواریخ کی کِتاب ''ہماری کہانی'' اُردو میں تھی۔ میری جُغرافیہ کی کِتاب ''ہماری دُنیا'' اُردو میں تھی اور میری حِساب کی کِتاب بھی اُردو میں ہی تھی۔ فیروز پُور میں میری ماں کے دو موسیرے بھائی ہردِت سِنگھ اور سیوا سِنگھ بیچ بیچ میں مُجھے پڑھانے کے لِئے گھر آیا کرتے تھے۔ مُجھے ہر مضموُن میں دِلچسپی تھی سِوائے جُغرافیہ کے جِس میں ٹانگانیکا، نِکاراگووا اور گوئی آنا جیسے الفاظ میرے سر سے اُوپر اُوپر سے ہی گزر جاتے، جَیسے تَیسے کر کے پانچویں جماعت تک کی تعلیم خانہ بدوشوں کی سی حالت میں ہی پوری کی تھی۔

مُجھے آج بھی یاد آتا ہے وہ دِن جب میرے والِد مُجھے پونچھ شہر کے گورنمنٹ ہائی سکوُل (جو آج کل ہائر سیکنڈری سکوُل ہے) میں لے گئے اور اُستادوں کے ایک گروہ (penal) نے میرا پانچویں جماعت کا خصوُصی اِمتحان لِیا اور مُجھے چھٹی جماعت میں داخِل ہونے کا موقع مِلا۔ مَیں نہیں جانتا کہ وہ سارا سال مَیں نے پونچھ میں گزارا یا نہیں لیکن اِتنا یاد ہے کہ چھٹی جماعت کا اِمتحان مَیں نے پونچھ کے اِسی سکوُل میں پاس کِیا تھا۔

چھٹی جماعت کی ایک اور بات یاد آتی ہے کہ ہمارے ایک اُستاد جناب محمد دین

بانڈے (جو بعد میں سیاست میں چلے گئے اور منسٹر بھی رہے) ہمیں انگریزی کا مضمون پڑھاتے تھے۔ انگریزی اُس زمانے میں چھٹی جماعت سے شروع ہوتی تھی۔ اے بی سی سے شروع کر کے ہمیں اُسی سال میں ایک مکمّل انگریزی کتاب کا اِمتحان پاس کرنا پڑتا تھا۔ ماسٹر محمدّ دین بانڈے خود بھی کھڑے ہو جاتے بچّوں کو بھی کلاس میں کھڑے ہونے کے لِئے کہتے اور باقاعدہ رقص کرتے ہوئے بولتے۔

This is my right hand.
This is my left hand.
This is my right leg.
This is my left leg.

وغیرہ وغیرہ وغیرہ

بچّوں کے لِئے یہ مشغلہ رقص کا موقع بھی فراہم کرتا۔ بچّوں کی کثرت بھی ہو جاتی اور خوشی خوشی انگریزی کی پڑھائی بھی ہو جاتی۔ ماسٹر محمدّ دین بانڈے کی انوٗکھے انداز میں سِکھائی ہوئی انگریزی نے زِندگی کے ہر مرحلے پر میرا ساتھ دِیا۔

یہ تعلیم کا پہلا مرحلہ تھا جو اِس قدر ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے کہ مُجھے خود اِن حصّے بخروں کی گِنتی یاد نہیں۔ ہاں اِتنا ضرور یاد ہے کہ میری سب سے زیادہ دِلچسپی اُردو کے مضموٗن میں رہتی۔ بعد میں دوٗسرے نمبر پر انگریزی کا مضموٗن میرا چہیتا مضموٗن بن گیا۔ آج پیچھے مُڑ کے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں پتہ نہیں کیسے مَیں اپنی ابتدائی تعلیم مکمّل کر پایا۔ ورنہ جس طرح کی بھاگ دوڑ میرے ماں باپ کی زِندگی میں اُس دَور میں رہی ہے کِسی بچّے کا تعلیم مکمّل کر پانا لگ بھگ ناممکن تھا۔

اِسی دوران میں میری بڑی بہن ست نام کور کی شادی میرے بہنوئی رگھبیر سنگھ سے پونچھ میں واقع ہوئی۔ اُن دِنوں میری بہن نے دسویں جماعت کا اِمتحان دے رکھا تھا۔ مَیں شاید چھ یا سات برس کا تھا۔ بڑے بھائی صاحب (ڈاکٹر) گورچرن سنگھ ۱۱ یا ۱۲ سال کے رہے ہونگے۔

میری بڑی بہن ست نام کور کی شادی میں پونچھ کا مودی خانہ دُلہن کی طرح سجا ہُوا تھا۔ مودی خانے کے آنگن میں شامیانے اور شامیانوں میں قُمقمے۔ گویا رات میں بھی دِن کا عالم تھا۔ مُجھے یاد ہے مَیں اپنی عُمر کے کُچھ اور بچّوں کے ساتھ اُس طرف سے آتی ہوئی بارات میں شامل ہو گیا تھا۔ اور ہم سب بچّے باراتیوں کے ساتھ ناچتے ہوئے لڑکی والوں کے گھر کی طرف رَواں دَواں تھے۔

مودی خانہ میری زِندگی اور میری نفسیات میں ایک Archetype کا درجہ رکھتا ہے۔ مودی خانہ پونچھ کے راجے کی ایک عمارت تھی جِسے میرے نانا جی نے گاؤں سے مہاجر بن کر آنے کے بعد کرائے پر لے رکھا تھا۔ ایک صف میں کُچھ ایک کمرے، بیچ میں بہت بڑا آنگن اور پار کی طرف بھی کچھ کمرے جِن میں اُس وقت مہاجروں کے کُچھ اور کنبے رہتے تھے۔ مودی خانے میں میرے ہوش سنبھالنے سے لیکر میری کچّی جوانی تک اِبتدائی مراحل کے کُچھ راز پوشیدہ ہیں جِن کا اِنکشاف آگے آنے والے صفحات میں اپنے اپنے وقت پر کِیا جائے گا۔

باب-۲

شاید 1957ء کا سال تھا۔ وہ میری دانست میں میری زندگی کا پہلا ریل کا سفر تھا۔ مُجھے ریل گاڑی میں بیٹھنے کا موقع مِلا۔ ایک اِکّے تانگے پر ہم لوگوں کو بٹھا کر میرے والِد لے گئے ساز وسامان کے ساتھ۔ اِکّے میں بیٹھنا یاد ہے۔ اِکّے کا سڑک پر چلنا یاد ہے اور پھِر ریل کے ڈِبّے میں میرے ماں باپ مَیں اور میرے دونوں چھوٹے بھائی، سب سے چھوٹی بہن کے بارے میں مَیں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ ہمارے ساتھ تھی یا نہیں۔ مُجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ ابھی تک پیدا بھی ہُوئی تھی یا نہیں۔ اِتنا ضرُور یاد ہے کہ اُس عُمر میں ریل کا سفر بڑا راحت افزا تھا اور میرا دِل چاہتا تھا کہ ریل چلتی رہے چلتی ہی رہے اور مَیں سوتے جاگتے ہوئے جھُولتے جھلاتے ہوئے اُس ڈبّے میں بیٹھتا، لیٹتا، چلتا، پھِرتا رہوں۔ ریل گاڑی کے سفر کے لِئے میری یہ محبت آج بھی قائم ہے۔

یہ سفر جالندھر سے فیروز پور تک کا تھا۔ حالانکہ سفر تو میرے ماں باپ کی زِندگی میں میری پیدائش سے پہلے ہی جاری وساری تھا۔ سفر بھی کیا تھا اِک مُسلسل ہجرت تھی۔ یہاں سے وہاں وہاں سے کہاں کہاں کہاں کہاں۔ اِتنا ضرُور یاد ہے کہ اِس نہ ختم ہونے والی ہجرت کے دوران وہ لوگ پونچھ شہر میرے ننہال والوں کے پاس بھی آتے تھے۔ ہمیں ساتھ لیکر۔ ایک تو میرے بڑے بہن بھائی وہاں تھے۔ دوسرے اُس وطن کی کشِش بھی تھی جو اُن سے

چھِن چُکا تھا۔ ہم لوگ ہجرت کے جِس مرحلے میں ہوتے جہاں بھی ہوتے حالت یہ رہتی کہ:-

منظرِ سرو وسمن یاد آیا
پھر سے گُمگشتہ وطن یاد آیا

پیچھے اب کیا ہے غبارِ رفتہ
دہر میں باغِ عدن یاد آیا

جب ایک جگہ سے دوُسری جگہ جاتے، تھوڑی دیر کے لِئے وہاں قیام کرتے اور سوچ لیتے کہ ہم وہاں آباد ہو جائیں گے مگر پھر:-

بیتابؔ ہم بسا بھی چُکے تھے نیا نگر
لیکن پُرانا شہر بھی چھوُٹا کبھی نہ تھا

اور

جِس شہر میں پہنچوں اُسے منزل جانوں
کچھ دیر میں کُچھ سوچ کے چل دوں پھر سے

پونچھ کی یعنی اپنے گُمگشتہ وطن کی اپنے Paradise lost کی کشِش ہی تھی جِس نے ہم لوگوں کو کہیں اور آباد نہ ہونے دِیا۔ جہاں بھی جاتے عالم یہ ہوتا کہ:-

ہم بس گئے وہاں مگر آباد ہو نہ پائے
کُچھ شہر وہ جدید تھا کُچھ ہم قدیم تھے

البتہ

ہم جو مارے ہوئے سفر کے ہیں

اِس ڈگر کے نہ اُس ڈگر کے ہیں

جالندھر سے ہم فیروز پوری چھاونی پہنچ گئے۔ اِکّے پر سوار ہو کر ایک گوردوارے میں پہُنچے۔ بہُت بڑا گوردوارا جِسے وہاں صدر گوردوارا کہا جاتا تھا۔ مسجد جیسے گوردوارے کا ایک بڑا حال۔ باہر بہُت بڑا مستطیل احاطہ جس کے ایک طرف دیوان حال دوسری طرف لمبی قطار میں کمرے۔ گوردوارے کے بڑے دروازے میں داخِل ہوتے ہی بائیں طرف پہلے سات آٹھ کمرے مسافروں کے لِئے پھِر دو تین کمرے دوسرے ملازمین کے لِئے پھِر ایک کمرہ سٹور (Store) کا پھِر تھوڑی خالی جگہ۔ شاید لنگر کے لِئے اور پھِر ایک چھوٹا کمرہ اور ایک بڑا کمرہ ہیڈ گرنتھی کے لِئے۔ میرے والد ہیڈ گرنتھی کی حیثیت سے وہاں آئے تھے۔ صدر گوردوارے کے ہیڈ گرنتھی کی حیثیت وہاں کافی محترِم تھی اِس بات کا اندازہ ہم لوگوں کو بعد میں ہُوا۔

فیروز پور چھاونی میری زِندگی کا وہ شہر ہے جس میں ہم لوگ لگاتار سات سال تک رہے۔ وہاں میرے والِد کی بہُت عِزّت تھی۔ بھارتی فوج کے بہُت بڑے بڑے آفیسر اُن کی عزّت کرتے تھے۔ مُجھے یاد ہے اَیسے لوگوں میں کرنل، برگیڈئیر اور (ایک) میجر جنرل بھی شامل تھے۔

میرے والِد جنہیں ہم لوگ پیار سے باوُ جی (بابُو جی) یا باوٗ جی کہا کرتے تھے وہ وہاں اپنے راگی جتھے کے ہیڈ راگی کے طور پر صُبح ''آسا دی وار'' کا کیرتن کرتے۔ آسا دی وار سِکھوں کے پانچویں گوُرو ارجن دیو کی قائم کردہ سِکھ گورووُں کے کلام پر

مشتمل وہ وار (شاعری کی ایک صِنف) ہے جِس کا گائن دُنیا بھر کے گوردواروں میں صُبح کے وقت کِیا جاتا ہے۔

اِسی طرح پِتا جی شام کے وقت ''رہ راس'' کا پاٹھ کرتے ''رہ راس'' بھی ایک ایسی تخلیق ہے جو سِکھ گوروؤں کی شاعری پر مشتمل ہے اور شام کے وقت اِس کا پاٹھ ساری دُنیا کے گورودواروں میں کِیا جاتا ہے۔

''رہ راس'' کے پاٹھ کے بعد پِتا جی یعنی باؤ جی مہا کاویہ گور پرتاپ سوُرج (جِسے عُرفِ عام میں سوُرج پرکاش بھی کہا جاتا ہے) کی کتھا کرتے۔ سوُرج پرکاش میں سِکھ گوروؤں کی زِندگی کے واقعات تواریخی شکل میں درج ہیں اور بیچ بیچ میں ہِند و اساطیر یعنی دیو مالا کے بے شُمار حوالے درج ہیں۔ ''سوُرج پرکاش'' برج بھاشا کی شاعری ہے جِس کے مصنّف بھائی سنتو کھ سِنگھ ہیں۔ مَیں نے اپنی زِندگی میں جو گیان، آتم گیان اور برہم گیان تھوڑی بہت ماترا میں حاصِل کِیا ہے وہ اپنے باؤ جی سے ''سوُرج پرکاش'' کی کتھا سُن سُن کر حاصل کِیا تھا۔ اِس کتھا کے دوران گوردوارے کا حال تو پورا بھرا ہی ہوتا گوردوارے کے اُونچے کُھلے دروازوں کے باہر تک کھڑے ہو کر لوگ باؤ جی سے یہ کتھا سُن رہے ہوتے۔ یہ کتھا سُننے والوں میں سِکھ بھی ہوتے، ہِند و بھی، مسلمان تو اُس عِلاقے سے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان جا چُکے تھے۔

فیروز پور چھاونی کی ساری سِول آبادی مغربی پنجاب (پاکستان) سے آئے ہوئے ہِند و سِکھ مہاجروں پر مشتمل تھی۔ آس پاس کے دیہات میں مشرقی پنجاب کے اصل باشِندے (جِن میں زیادہ تر جٹ / جاٹ سِکھ ہیں) آباد تھے / ہیں۔

چھٹی جماعت کا اِمتحان مَیں نے پونچھ کے گورنمنٹ ہائی سکوُل میں پاس کر لیا تھا۔ اب تک میرے والدین کو یقین ہو چلا تھا کہ فیروز پور چھاونی ہی اُن کی زِندگی کی منزلِ مقصوُد ہے۔ اُن لوگوں نے میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کو لعلہ منوہر لعل میموریل (جونیَر) سکوُل میں پانچویں درجے میں داخِل کروا دِیا جب کہ مُجھے لعلہ منوہر لعل میموریل ہائر سکینڈری سکوُل میں ساتویں جماعت میں داخلہ مِل گیا۔ پنجاب میں ذریعہ تعلیم ہندی اور پنجابی ہی ممکن تھا۔ وہاں اُردُو کا چلن شاید ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہو چُکا تھا۔ میرے لِئے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا پنجابی زبان تو مُجھے آتی تھی لیکن ہندی سے مَیں بالکل نابلد تھا۔ دونوں زبانیں وہاں لازمی تھیں ۔ میرے والِد نے ایک ہِندی قاعدہ لا کر مُجھے گھر میں ہی پڑھایا اور اِس قابل بنا دِیا کہ مَیں سکوُل میں ساتویں جماعت کے بچّوں کے برابر ہِندی کی پڑھائی کر سکا۔

مُجھے یاد ہے سکوُل میں کبھی کبھار اُردُو کا کوئی اخبار یا کوئی کِتاب پڑھ کر مَیں طلبہ کو اور اساتذہ کو حیرت میں ڈال دِیا کرتا تھا۔ وہ لوگ سوچتے مَیں کِسی دوُسری دُنیا کا باشِندہ ہوں۔ اُس سکوُل میں مَیں نے ساتویں آٹھویں اور نویں جماعت پاس کی۔ آٹھویں جماعت میں میرے ہِندی میں ۸۳ فیصد نمبر آئے۔ اُن دِنوں پنجاب میں آٹھویں جماعت کا اِمتحان پنجاب سکول بورڈ کے ذریعے ہوتا تھا۔ یہ بورڈ آج کے پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش کے تمام سکوُلوں کے اِمتحانات منعقد کرواتا تھا۔

فیروز پور میں ہم لوگ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۴ء تک رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ماسٹر تارا سِنگھ کی قیادت میں پنجابی صوبہ بنانے کے لِئے پوُرے پنجاب میں اکالیوں کی تحریک چل رہی تھی۔ کانگریس پارٹی اِس تحریک کے خِلاف تھی۔ مُجھے تحریک کا آنکھوں دیکھا حال پوُرا تو یاد

نہیں آتا۔ ہاں پنجابی صوبے کے حمایتیوں اور مخالفوں کے درمیان ہونے والے اِکا دُکا جھگڑوں کے بارے میں بہت کُچھ سُننے کو مِل جاتا تھا۔ اُن دِنوں پنجاب کے اکثر سِکھ لوگ یہ شِکوہ کرتے کہ پنجابی بولنے والے کئی کئی ہِندو اپنی مادری زبان ہِندی خواہ مخواہ پنجابی صوُبے کی مخالفت میں لِکھواتے ہیں۔ کئی قصّے بھی اُن دِنوں ماحول میں گردِش کرتے رہتے تھے۔ ایک قِصّہ یہ تھا کہ سِکھوں کے ایک مذہبی جلوس کے دوران گورو گرنتھ صاحب پر سگریٹ کی ڈبّیاں پھینکی گئی ہیں اور اُس کے نتیجے میں فِرقو فسادلڑائی جھگڑا بھی ہُوا۔ اِسی طرح ایک اور افواہ مُجھے یاد ہے کہ ہِندو سِکھ فسادات کے ماحول میں (شاید لُدھیانہ میں) کُچھ شرارتی سِکھ نوجوانوں نے ایک لڑکی اغوا کرلی اور ایک ہفتے کے بعد اُسے چھوڑ دِیا۔ لڑکی کے گھر واپس آنے پر لڑکی والوں نے اُس سے دریافت کرنا چاہا کہ اُن لوگوں نے اُس سے کِسی طرح کی جنسی زیادتی تو نہیں کی۔ لڑکی نے بتایا کہ اُن لوگوں کا برتاوٗ اُس کے ساتھ بہُت اچھا رہا۔ صِرف ایک لڑکا بیچ بیچ میں اُس کی طرف جھانکتا رہتا تھا۔ جب ایک دوسرے لڑکے نے اُس سے پوچھا کہ وہ بار بار آگے پیچھے اُوپر نیچے کیا دیکھتا ہے؟ تو اُس نے جواب دِیا ''یار مُنہ سے تو پنجابی بولتی ہے۔ مَیں یہ دیکھنا چاہتا ہوں ہِندی کہاں سے بولتی ہے۔''

منوہر لعل میموریل ہائر سیکنڈری سکوُل کے وائس پرِنسپل امرناتھ گوئل حقیقی معنوں میں پرِنسپل کے تمام فرائض نبھاتے تھے۔ پرِنسپل صاحب تو برائے نام تھے جِن کی شکل تو مُجھے یاد ہے نام یاد نہیں۔ امرناتھ گوئل کِسی بھی جماعت میں کبھی بھی گھُس جاتے، اُستاد کو ہٹا کر خود پڑھانا شروع کردیتے۔ وہ ہمیشہ ہِندی بولتے۔ پنجابی صِرف پنجابیوں اور خاص طور سے سِکھوں کا مذاق اُڑانے کے لِئے بولتے۔ عجیب عجیب قِسم کی شکلیں بنا کر وہ سِکھ طلبہ کا مذاق

اُڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ سِکھوں کے بارے میں گھڑے گھڑائے لطیفے (جنہیں میں اکثر نسلی تذکرے یعنی Racial remarks کہتا ہوں) سُناتے اور سِکھ طلبہ کو اپنی بغلیں جھانکنے پر اور دُوسرے طلبہ کو کِھلکھِلا کر ہنسنے پر آمادہ کرتے۔

آج اِتنے برسوں بعد (۲۰۱۱ء میں) مَیں سوچتا ہوں کہ بیسویں صدی کی نوویں دہائی میں سر اُٹھانے والی سِکھ انتہا پسندی کی داغ بیل امرناتھ گوئل جیسے مدرّسوں نے پنجاب میں بہُت پہلے سے ڈال دی تھی۔

اُسی سکوُل میں راجیش کُمار نام کے ایک اُستاد تھے۔ خوبرُو نوجوان، انگریزی پڑھاتے تھے اور پنجابی بولنے میں فخر محسوُس کرتے تھے۔ مُجھے یاد ہے ایک بار اُنہوں نے نوویں جماعت میں انگریزی کے اِس فقرے کا ترجمہ کرنے کو طلبہ سے کہا :-

A Stitch in time saves nine.

کئی طلبہ نے اس کے اپنی اپنی طرح سے ترجمے کِئے۔ مَیں نے پنجابی میں کہا:-

"ویلے دا اِک ٹانکا کویلے دے نو ٹانکیاں دے برابر ہے۔"

اُستاد راجیش کُمار بہُت خوش ہوئے اور کلاس کے سبھی طلبہ سے میرا بتایا ہوُا ترجمہ نوٹ کرنے کو کہا۔

سکوُل میں پنجابی کا مضمون پڑھانے والے دو اُستاد تھے جو آپس میں سگے بھائی تھے۔ کِرپال سِنگھ چمنؔ اور گوپال سِنگھ کِرنؔ دونوں بھائی پنجابی شاعر تھے اور مَیں دونوں کا چہیتا طالب ِعلم تھا۔ پنجابی ادب کے مضموُن میں مُجھے شاعری سے خصُوصی لگاؤ تھا۔ دونوں

بھائی سکوٗل کے پروگراموں میں مُجھ سے اُستاد شاعروں کی پنجابی شعری تخلیقات پڑھواتے۔ وہ پنجابی میں مُجھ سے تقار پر بھی تیار کرواتے اور سکوٗل کے پروگراموں میں پیش کرواتے۔

میرے اندر شاعری کے جو عناصر پیدا ہوئے وہ اکثر و بیشتر گورو گرنتھ صاحب کا کلام سُن سُن کر، باوٗ جی کی سوٗرج پرکاش کی کتھا اور گیانی کِرپال سِنگھ چمؔن اور گیانی گوپال سِنگھ کِرنؔ کے پڑھائے ہوئے پنجابی زبان وادب کے مضموٗن کی وجہ سے ہی پیدا ہو سکے ہیں۔

امر ناتھ گوئل مُجھ سے خاص طور سے اُکھڑے اُکھڑے رہتے تھے۔ اِس کی وجہ میرا پنجابی زبان وادب اور پنجابی تہذیب و ثقافت سے متعلق پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حِصّہ لینا تھا۔ ایک بار وہ اُردُو کی کوئی کِتاب اُٹھائے ہوئے کہیں جا رہے تھے جب کُچھ بچّوں نے اُنہیں گھیر لِیا اور اُس کِتاب کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پوچھنے شروٗع کر دئے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر جھٹ سے کِسی صفحے کے دو چار جُملے پڑھ ڈالے۔ امر ناتھ گوئل نے کِتاب مُجھ سے چھین لی اور گویا ہوئے'' آپ لوگ اپنی پڑھائی پر دھیان دیں تو زیادہ اچھّا ہو گا۔''

ایک دِن نوہیں جماعت میں ماسٹر راجیش کُمار کو کلاس سے باہر بھیج کر امر ناتھ گوئل نے انگریزی مضموٗن کی کمان خود سنبھال لی۔ میرے کِسی سوال کے صحیح جواب دینے پر بھی پورے پیریئڈ میں وہ مُجھے لعن طعن کرتے رہے اور دُوسرے طلبہ کو مُجھ سے دوٗر رہنے کی تاکید کرتے رہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ مَیں سکوٗل میں پنجابی صوبے کا اندولن چلا رہا ہوں اور دوٗسرے بچّوں کو گمراہ کر رہا ہوں۔

مَیں نہیں جانتا کہ امر ناتھ گوئل آج زِندہ ہیں یا نہیں لیکن اگر کہیں مِل جائیں تو

مَیں اُنہیں بتاؤں کہ مُجھے تو اُس زمانے میں پنجابی صوبے کے معنی بھی معلوم نہیں تھے۔ پنجابی زبان وادب سے لگاؤ البتہ میرا گُناہ ضرور تھا۔

اُس واقعے کے بعد میرا دِل اُس سکوُل سے اُکھڑ گیا۔ میرے کئی اچھے دوستوں نے مُجھ سے مُنہ موڑ لیا تھا۔ مَیں سکوُل میں سب سے کٹا کٹا رہتا۔ امر ناتھ گوئل کی شکل کا تصوّر ہی میرے لِئے کِسی بھیانک راکشس جَیسا تھا۔ خوف کا ایک عجیب سا عالم مُجھ پر ہر لمحہ طاری رہتا۔

سکوُل میں میرے لِئے اُمید کی کِرن صِرف ماسٹر گوپال سِنگھ کِرنؔ اور کرپال سِنگھ چمنؔ کی موجودگی تھی۔ تہذیبی وثقافتی پروگراموں کے انچارج اکثر یہ دونوں بھائی ہوتے اور میرا وہاں ضرور کچھ نہ کُچھ رول ہوتا۔ ڈر اور خوف کے اِسی عالم میں مَیں نے نوہیں جماعت اُسی سکوُل میں پاس کی اور مَیں دسویں جماعت میں داخل ہو گیا۔

سکوُل میں ایک اور استاد تھے منوہر لعل۔ وہ ہنس مُکھ تھے مگر ایک لطیفہ وہ اکثر جماعت میں سُنایا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے ہِندوستان میں تین قومیں رہتی ہیں۔ ہندو، مُسلمان اور سِکھ۔ ہِندو لوگ کوئی کام کرنے سے پہلے سوچتے ہیں پھر اُسے سرانجام دیتے ہیں۔ مُسلمان کام پہلے کرتے ہیں سوچتے بعد میں ہیں اور سِکھ وہ قوم ہے جو کام کرنے سے پہلے سوچتی ہے نہ بعد میں۔ دوسرے طلبہ کے ساتھ ساتھ اِس لطیفے پر سِکھ طلبہ بھی خوب ہنستے لیکن مَیں اندر اندر جانتا تھا کہ منوہر لعل بھی ایک ہنس مُکھ قِسم کا امر ناتھ گوئل ہی ہے۔

مُجھے بڑے دُکھ کے ساتھ لِکھنا پڑ رہا ہے کہ مَیں نے سکوُل کے زمانے سے لیکر آج تک سِکھوں کے بارے میں طرح طرح کے گھڑے گھڑائے لطیفے اپنی ذات پر جھیلے ہیں۔

بے شک اَیسے لطیفوں سے ہمیشہ میری رُوح زخمی ہوتی رہی ہے۔ اَیسے لطیفوں سے اکثر یہ ثابت کرنا مقصوُد ہوتا ہے کہ سِکھ لوگ دُوسری ہندوستانی قوموں کے مُقابلے میں نہایت بیوقوُف ہوتے ہیں اور خاص طور سے دِن کے بارہ بجے سِکھوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ سکوُلوں میں سِکھ بچّے دفتروں اور دوُسرے اِداروں میں کام کرنے والے سِکھ لوگ ظاہر ہے کہ اَیسے لطیفوں سے احساسِ کمتری کا شِکار بنائے جاتے ہیں۔ یہ دراصل ایک قِسم کی حسد ہے جو کئی لوگوں کو سِکھ قوم سے اِسلئے ہے کہ سِکھ لوگ بِھکاری نہیں ہوتے جب کہ باقی تمام ہندوستانی لوگوں میں بِھکاریوں کی تعداد اچھّی خاصی ہے۔ سِکھ لوگ محنتی ہیں اور زِندگی کے ہر مَیدان میں اپنی محنت کے ذریعے ترقّی کی منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ اِن لطیفوں اور دُوسرے anti Sikh racial marks سے تنگ آ کر ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں رہنے والے کئی سِکھ لڑکوں نے بال کٹوا کر اپنی سِکھ شناخت کو چھُپا دینے میں ہی عافیت سمجھی۔ جانے کب تک ہندوستان میں سِکھوں کی آنے والی نسلیں اِن Racial Remarks کے سائے تلے جینے پر مجبوُر رہیں گی۔

مَیں ہندوستان میں کُچھ لوگوں کی طرف سے چلائی گئی خالِصتان کی تحریک کا کبھی حمایتی نہیں رہا ہوُں اور ہمیشہ مانتا رہا ہوُں کہ ہندوستان ہمارے لِئے ایک بہُت بڑا خالِصتان ہے تو پِھر ہم ہندوستان کے اندر کِسی چھوٹے سے خالِصتان کی مانگ کیوُں کریں۔

مُجھے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے۔ مَیں ہندوستانی اساطیر یعنی ہند و دیو مالا کو اپنی تہذیب و ثقافت کی جڑ مانتا ہوُں۔ مَیں وقت پڑنے پر اپنے مُلک ہندوستان پر جان تک قُربان کر سکتا ہوُں، لیکن اِس سب کے باوجود کئی بار میرے دِل میں یہ خیال آیا ہے کہ دُنیا بھر

کے سِکھ عوام آپس میں مِل کر حتی الوسّع اپنا اپنا مالی حِصّہ ڈال کر دُنیا کے کِسی کونے میں کوئی بڑا سا جزیرہ خرید لیں اور اُس میں خالِصتان یا کِسی اور نام سے ایک اَیسا مُلک بسائیں جہاں سکوُلوں میں سِکھ بچّوں کو Anti Sikh Racial Remarks سے متعلق لطیفوں کا شِکار ہو کر احساسِ کمتری کے سائے میں اپنی تعلیم مکمّل نہ کرنا پڑے۔ جہاں سِکھ ملازموں کو دفاتر میں اِن لطیفوں کا شِکار نہ ہونا پڑے جہاں گلیوں بازاروں میں اِن لطیفوں کی وجہ سے سِکھوں کو ہر گھڑی پریشان ہونے کو تیار نہ رہنا پڑے۔ جہاں سِکھوں کی روحیں اِن لطیفوں کی وجہ سے قدم قدم زخمی نہ ہوں۔

ہم لوگ فیروز پور چھاونی میں رہتے تھے جو ایک نہایت ہی صاف سُتھری خوبصورت نگری تھی۔ وہ صاف و شفاف سڑکیں آج بھی اکثر میرے خوابوں کی زینت بنتی ہیں۔ پونچھ کے مودی خانے کی طرح ہی فیروز پور چھاونی بھی میری نفسیات میں ایک Archetype کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ چھوٹا سا شہر، وہ گوردوارا، وہ سکوُل جب بھی خواب میں آتے ہیں تو لگتا ہے میرے وہاں دوبارہ جانے کی خواہش پوری ہوگئی لیکن خواب کے ٹوٹتے ہی لگتا ہے کہ یہ خواب شاید اِس زِندگی میں پورا ہونے والا نہیں۔

فیروز پور شہر میں فیروز پور چھاونی سے چار پانچ مِیل دُور بلکہ شہر سے سٹے ہوئے کِسی گاؤں میں میری ایک دُور کی خالہ رہتی تھیں۔ اُن کے خاوند جو میرے دُور کے خالوُ تھے میرے باؤجی کے دوُر کے بھائی بھی تھے۔ اِس رِشتے سے وہ میرے دوُر کے چچّا بھی ہوتے تھے۔ وہ لوگ ہمارے گھر آتے ہم لوگ اُن کے ہاں جاتے۔ اُن لوگوں کی مُجھ سے عُمر میں دو سال چھوٹی ایک بڑی خوبصورت بیٹی تھی۔ ہم بچّوں کو ساتھ ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ کر میرے

والدین اکثر کہا کرتے اِن دونوں کی شادی کروادیں گے۔ جب یہ دونوں بڑے ہو جائیں گے۔ مَیں نہیں جانتا کہ اُس لڑکی کے ماں باپ کو اِس بارے میں پتہ بھی تھا یا نہیں لیکن میرے دِل میں اُس کی محبّت کے انکوُر بچپن ہی سے پھوُٹنے شروُع ہو گئے تھے۔ غالبِ امکان ہے کہ وہ بھی اِس صوُرتِ حال سے واقف تھی۔ نوہِں جماعت پاس کرتے کرتے مَیں تو اپنے دِل میں یہ تہیّہ کر چُکا تھا کہ شادی اُسی سے کروُں گا۔ اِظہار کرنے کی شاید ابھی عُمر بھی نہیں تھی اور شاید یہی ایک غلطی مُجھ سے اِس سلسلے میں سرزد بھی ہوگئی۔

اپنے فیروز پور کے قیام کے دوران بھی ہم لوگ گرمیوں کی چھٹّیوں میں پونچھ چلے جاتے۔ پونچھ میں پنجاب کے مقابلے میں گرمی کافی کم ہوتی ہے۔ مودی خانے میں ہمارا بڑا سا کمرہ مختص ومحفوظ رہتا۔ میری ماں خود کھانا پکاتی ۔ پونچھ شہر چاروں طرف سے اُونچے پہاڑوں میں گھِری ہوئی ایک نہایت خوبصورت وادی پر مبنی ہے۔ پونچھ حدودِ اَربعہ اور وہاں بولی جانے والی زبان کے لحاظ سے مغربی پنجاب کے عِلاقہ پوٹھوہار سے مِلتا جُلتا ہے ۔ پوٹھوہار راول پنڈی اور اُس کے گردونواح کو کہا جاتا ہے۔ پونچھ سے راول پنڈی کا فاصلہ بھی ڈیڑھ دوسو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔

پونچھ شہر کے چاروں طرف کھڑے اُونچے پہاڑ کبھی کبھار برف سے لدے ہوئے ہوتے تو اُنہیں دیکھنا بھر بھی بجائے خود ایک راحت افزا عمل ہوتا۔ اِنہی پہاڑوں سے پگھلتی ہوُئی برف پانی بن کر زمیں دوز سفر کرتی ہوُئی پونچھ شہر کی کُچھ ایک خوبصورت باولیوں (چشموں) اور جھرنوں کی شکل میں صدیوں سے پونچھ کے لوگوں کی تہذیب وثقافت کا ایک ضروُری حِصّہ بنی ہوئی ہے۔ مُجھے یاد ہے بچپن میں مَیں کُچھ دوُسرے لوگوں کے ساتھ (کبھی

باوُ جی کے ساتھ کبھی بھائی صاحب کے ساتھ، کبھی اَپنے اِکلوتے ماموں کے ساتھ تو کبھی ماں کے ساتھ)۔ ''سپّاں والی باولی''، یا ''ٹہناں والی باولی'' یا ''سائیاں دی باولی'' نہانے کے لئے جایا کرتا تھا۔ یہ خوبصورت میٹھے پانی کی باولیاں (چشمے) پکّے پتھّروں کی ایسی باولیاں ہیں جن میں ایک طرف (پینے کے لِئے) پانی نِکلتا ہے پھِر آگے نہانے کے لِئے کھُلی جگہ چلا جاتا ہے۔ اِن باولیوں کے عِلاوہ پونچھ میں ''کھکھا ناون'' اور ''ڈونگس'' کے جھرنے اپنے پینے والے میٹھے اور ہاضم پانی کے لِئے مشہُور رہیں۔ وہ چشمے وہ باولیاں وہ جھرنے آج مُجھ سے چھِن چُکے ہیں لیکن وہ میرے ساتھ ہیں میرے اندر موجود ہیں۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں وہ میری نفسیات کے مضبوط Architypes بن کے میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ''کھکھا ناون'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس چشمے (جھرنے) کا پانی پی کر آپ کھائے ہوئے پتھّر بھی ہضم کر سکتے ہیں۔

پونچھ کی یہ باولیاں یہ جھرنے اپنے اِرد گرد ایک قائم و دائم رومانی فضا بھی رکھتے ہیں۔ صبح شام اور کبھی کبھار دِن میں بھی خوبصورت لڑکیاں اور خوبصُورت عورتیں اپنی مٹکیاں لِئے یہاں پانی بھرنے آتی ہیں تو پانی پینے کے بہانے رُکنے والے تشنہ لبوں کے ساتھ ٹکراتی ہوُئی مٹکیاں اور آنکھیں کئی کئی سُنے ان سُنے کہے ان کہے افسانے ہواؤں فضاؤں اور گھٹاؤں میں بکھیر دیتی ہیں۔

میرے بڑے بھائی اور بڑی بہن پونچھ میں ہی رہتے تھے۔ بہن کی تو اب تک شادی ہو چکی تھی لیکن بڑے بھائی گور چرن سنگھ مودی خانے میں ہی رہتے تھے۔ ننہال میں وہاں ہمارے رِشتے کی ایک لڑکی آیا کرتی تھی جِس کی شکل اُس زمانے کی مشہُور فِلمی اداکارہ

وِجینتی مالا سے ہُو بہُو مِلتی تھی۔ اندر کھاتے سبھی جانتے تھے کہ وہ میرے بڑے بھائی سے مِلنے کی غرض سے ہی آتی تھی۔ مَیں نے کئی بار اُن کو چھُپ چھُپ کر بغل گیر ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی میرے اندر کا کامدیو بھی زور مارنے لگتا اور فیروز پور کی اپنی خاموش محبت میں غلطان مَیں اپنے اندر ہی اندر شرابور ہو جاتا۔ بھائی صاحب (بعد میں) پونچھ میں بارہویں جماعت تک کی پڑھائی کر کے سری نگر .M.B.B.S کرنے کے لِئے چلے گئے۔ پونچھ کی اپنی محبت کو بھُول بھال کر، بلکہ اُنہوں نے تو اُس کے بعد بھی کئی کئی محبتیں کی ہیں اور ایک ایک کر کے سب کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانے میں ہی بہتری سمجھی۔

مودی خانہ میرے لِئے جذباتِ عشق و محبت کی ایک آماجگاہ کی حیثیت اِختیار کر چُکا تھا۔ ایک بار تو مَیں نے بھائی صاحب کی کِتابوں میں کُچھ گندے قِسم کے (Porno) فوٹو بھی برآمد کِئے۔ مَیں اُنہیں مزے لے لے کر دیکھ ہی رہا تھا کہ بھائی صاحب اچانک کہیں سے آ گئے اور مُجھ سے چھین کر وہ فوٹو ماں جی کو دِکھائے اور میری شِکایت کر دی۔ ماں جی نے مُجھ سے کُچھ نہیں کہا۔ شاید وہ جانتی تھیں کہ معاملے کی اِصلیت کیا ہے۔

میرے بھائی صاحب مُجھ سے یوں بھی کُچھ اُکھڑے اُکھڑے رہتے تھے۔ پہلے پہل تو مَیں اِس کی وجہ سے انجان ہی رہا لیکن بعد میں معلوم ہُوا کہ ماں باپ کا اُن کو ننہال میں چھوڑ دینا اور ہم لوگوں کو اپنے ساتھ رکھنا اِس کی بڑی وجہ تھی۔ وہ بات بے بات میری پٹائی کر دیتے۔ برادری بھائی چارے میں مشہور تھا کہ مَیں پڑھائی میں دِل نہیں لگاتا ہوں۔ اِس لِئے مُجھے اُن کے عتاب کا شِکار ہونا پڑتا۔ بھائی صاحب ڈاکٹری کی پڑھائی کرتے تھے۔ اُنہوں نے نویں جماعت سے ہی مُجھے بھی میڈیکل پڑھائی کے مضامین دِلوا دِئے۔ مَیں کچّی عُمر کچّی

سمجھ اور امرناتھ گوئل کا ستایا ہوا یہ فیصلہ ہی نہ کر سکا کہ مجھے کونسے مضامین پڑھنے چاہئیں کونسے نہیں۔ یہ بات مُجھے تین چار سال بعد معلوم ہوئی کہ میڈیکل پڑھائی کے مضامین میری طبعیت سے بالکل میل نہیں کھاتے تھے۔ مَیں تہذیب و ثقافت و زبان وادب ونفسیات و سیاسیات ومعاشیات وغیرہ مضامین کے لِئے بنا تھا۔

میرے لِئے پونچھ میں یا فیروز پور میں وہی لمحے راحت افزا ہوتے جو بھائی صاحب کی غیر موجودگی میں گذرتے۔ M.B.B.S. میں پڑھتے ہوئے بھائی صاحب کو شاید پِتا جی کا گوردوارے میں پاٹھ کیرتن کتھا کرنا نا گوار گزرنے لگا۔ اُنہیں یہ بات توہین آمیز محسوس ہونے لگی کہ وہ ڈاکٹر بننے جارہے ہیں اور اُن کے والِد ایک گوردوارے میں نوکری کرتے ہیں۔ سُنا ہے کہ اُنہوں نے والدین پر دباوٴ ڈالنا شرُوع کر دِیا کہ وہ یہ کام چھوڑ دیں اور ریاست جموں وکشمیر میں واپس آکر جموں میں مستقل طور پر آباد ہو جائیں۔ ماں جی تو اِس بات کے لِئے راضی نہ تھیں لیکن باوٴجی نے شاید بھائی صاحب کے دباوٴ کے سامنے گھُٹنے ٹیک دِئے اور جموں آنے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے لِئے اپنی خاموش محبت کو فیروز پور میں چھوڑ کر چلے آنا مُشکِل تھا مگر سکوُل میں امرناتھ گوئل کے رویّے سے مَیں کافی تنگ تھا۔ اپریل مئی ۱۹۶۴ء میں پِتا جی نے پھر ایک اِکّا منگوایا اور ہمیں لیکر امرتسر سے ہوتے ہوئے جموں آپہُنچے۔ میرے دِل میں فیروز پور کی محبت کی کسک باقی رہ گئی تھی۔ مَیں اپنے دِل کی خلِش کو کِسی پر ظاہر بھی نہ کر سکا اور اُسے دِن دوُنی رات چوگنی ہونے سے روک بھی نہ سکا۔

کوئی میرے دِل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

(غالبؔ)

فیروز پور میں میرے خاص دوستوں میں مہندر سِنگھ ، سُکھ پال سِنگھ جالی اور ہر پرِیت سِنگھ تھے۔ ہر پرِیت سِنگھ بہُت ہونہار طالبِ علم تھے۔ وہ بعد میں انجینئیر بن گئے تھے اُن سے میرا رابطہ کافی عرصے تک قائم رہا مگر پھر منقطع ہو گیا۔ سُکھ پال اور مہندر بہت ہی خوبصورت نو جوان تھے۔ میرے بہُت پیارے دوست تھے مگر اُن سے دوبارہ کبھی رابطہ نہ قائم ہو سکا۔ یہ لوگ میرے ہم جماعتی تھے۔ میرے ایک اور کھِلنڈرے البیلے جٹ پُتّر دوست تھے بلوِندر جو اکثر School Uniform کی بجائے لاچا اور کُرتا پہن کر آ جاتے تھے۔ اُستادوں سے مار کھا لیتے تھے لیکن Uniform نہیں پہنتے تھے۔ ایک دِن بلوِندر کے والِد سکول میں آ گئے اور پرِنسپل سے دریافت کرنے لگے کہ یہ Blotting paper کیا ہوتا ہے؟ پرِنسپل نے بتایا کہ ایک سیاہی چوسنے والا موٹا کاغذ ہوتا ہے؟ بلوِندر کے باپو نے پوچھا ''یہ کِتنے کا آتا ہے''؟ پرِنسپل نے بتایا کہ پانچ دس پیسے کا آ جاتا ہے۔ بلوِندر کے باپو نے پھر کہا کہ یہ بلوِندر تو ہر دوسرے تیسرے دِن مُجھ سے دس دس رُوپے لے جاتا ہے کہتا ہے Blotting paper لانا ہے۔ اُس دِن سکوُل کے کھُلے گراؤنڈ میں بلوِندر کی جو پٹائی ہوُئی بس! رہے نام سائیں کا۔ یہ بات ۱۹۶۳ء عیسوی کی ہے جب ہم لوگ آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اُس دِن کے بعد بلوِندر سکوُل میں دِکھائی نہیں دِیا لیکن میرا وہ دِلدار پیارا دوست میرے اندر آج بھی میرے ساتھ ساتھ رواں دواں ہے۔

فیروز پور (چھاونی) میری یادوں کا شہر میرے خوابوں کا شہر میری پہلی محبت کا شہر مُجھ سے یوں چھوٹ گیا جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین کِھسک جاتی ہے۔ فیروز پور چھاونی کی صاف وشفاف سڑکیں آج میرے پاؤں کے نیچے نہیں ہیں مگر میرے دِل میں ہردم موجود ہیں۔ فیروز پور کے وہ سات سال میرے ماضی کا وہ مستحکم حِصّہ ہے جو باقی تمام حِصّوں بخروں سے بہُت زیادہ نمایاں ہے ایک روشن چراغ کی طرح جو دُور دُور تک پھیلے ہوئے اندھیروں کو حتی الوسع اُجالے میں تبدیل کر رہا ہے۔

مَیں چھوڑ آیا ہوں کب کا بے شک دیارِ رفتہ
مُجھے نہیں چھوڑتا مگر یہ خُمارِ رفتہ

نئی زمینوں پہ پاؤں اپنے جما چُکے ہم
کہاں مگر اعتبارِ رفتہ وقارِ رفتہ

مَیں آئینہ جب بھی دیکھتا ہوں یہ سوچتا ہوں
ہے میری آنکھوں میں کِسقدر اِنتظارِ رفتہ

☆☆☆

باب-۳

اِکّے پر سوار ہوکر ہم لوگ بس سٹاپ تک پہنچے۔بس فیروز پور شہر سے آتی تھی اور جی ٹی روڈ پر رُکتی تھی، جہاں سے ہم لوگ اُس پر سوار ہوکر امرتسر تک گئے۔امرتسر میں بس سے اُتر کر ہم لوگ دربار صاحب ہرمندر یعنی گولڈن ٹیمپل گئے۔وہاں ضرور میرے ماں باپ نے اپنی زِندگی کے اگلے پڑاوٗ کے لئے دُعا کی ہوگی۔گولڈن ٹیمپل دُنیا بھر کے سِکھوں کے لِئے ایک متبرّک تیرتھ استھان ہے بلکہ ایک Archetype ہے۔مُجھے یاد ہے اِس سے پہلے بھی جب کبھی ہم لوگ فیروز پور سے جموں کے راستے پونچھ جاتے، راستے میں امرتسر ضرور رُکتے۔ہرمندر صاحب یعنی گولڈن ٹیمپل کے دیدار کرنے کے لئے۔

امرتسر سے ہم ہمیشہ کی طرح سوٗرج ٹرانسپورٹ کی بس پر جموں کے لئے روانہ ہوئے۔جموں میں ہم لوگ ہمیشہ میری ایک خالہ راج کور کے ہاں رُکتے جو ہمارے لِئے بالکل ماں کی طرح تھی۔اُن کا گھر ہمارے لِئے ہمیشہ جموں میں رہنے کا ٹھِکانہ ہوتا۔خالہ راج کور ایک سکوٗل ٹیچر تھی جو جموں کے ایک سرکاری سکوٗل میں پنجابی زبان وادب کا مضمون پڑھاتی تھی۔اُن کی بڑی بیٹی ترلوچن کور اور چھوٹے بیٹے سنت پال سنگھ ہمارے سگے بہن بھائیوں کی طرح تھے۔راج کور دراصل میری ماں کی سگی چچیری بہن تھی لیکن اُن کا رِشتہ آپس میں سگی بہنوں سے بڑھ کر تھا۔حالانکہ ہم لوگوں کو مستقِل طور پر جموں میں ہی اپنا خیمہ لگانا تھا لیکن گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمیشہ کی طرح پونچھ جانے کا پروگرام تھا۔

جموں سے پونچھ آنے جانے والی ایک موٹر بس تھی جِس کا نمبر تھا J&K 9033۔

دراصل اُس موٹر بس کے مالک میرے پتا جی تھے۔ اُسی بس میں ہم لوگ جموں سے پونچھ جا رہے تھے۔ بس کو میری بڑی بہن کے خاوند یعنی میرے بہنوئی رگھبیر سنگھ چلا رہے تھے۔ جموں سے پونچھ ۲۵۰ کِلومیٹر کی دُوری پر ہے۔ جموں سے قریب قریب ایک سو کِلومیٹر کی دُوری پر کالی دھار نام کے پہاڑ سے گزرتے ہوئے بس کی بریک فیل ہوگئی۔ جانے جیجا جی نے (جنہیں ہم لوگ بھاپا جی کہتے تھے) کِس حِکمتِ عملی کے تحت بس کو ایک بڑے ریت کے ٹیلے سے ٹکرا دِیا۔ بس اگر اُس ٹیلے پر نہ رُکتی تو نیچے میلوں دُور کھائی میں جا گرتی۔ ایک بڑے جھٹکے کے ساتھ مُجھے احساس ہُوا کہ حادثہ پیش آچُکا ہے۔ شاید موت سے یہ میرے ہوش میں میری پہلی ملاقات تھی۔ حالانکہ میری ماں اکثر بتایا کرتی تھی کہ بہُت چھوٹی عُمر میں (شاید ایک ڈیڑھ سال کی عُمر میں) مَیں کِسی بہُت شدید بیماری کا شِکار ہُوا تھا۔ چھ مہینے تک میری حالت مُردوں کی سی رہی۔ میری ماں کو دُوسری عورتیں اکثر صلاح دِیا کرتی تھیں کہ وہ مُجھے کہیں جا کے دفنا آئے کیونکہ مَیں تو قریب قریب مُردہ ہی تھا۔ میری ماں کہتی جب تک اِس کے سانس میں سانس ہے مَیں اِس کا عِلاج کرواتی رہوں گی۔ آخر پونچھ کے فقیر چند نام کے ایک حکیم نے میرا عِلاج کِیا اور مَیں دوبارہ جی اُٹھا۔ اِس کے عِلاوہ فیروز پور چھاونی میں ایک بار مَیں لگاتار تین مہینے تک ٹائی فائڈ نام کی موذی بیماری کا شِکار رہا تھا جِس کے دوران میرے زِندہ رہنے سے زیادہ مرجانے کے امکانات تھے۔

کالی دھار کے بس حادثے کے فوراً بعد مُجھے ایک عجیب قِسم کا احساس ہُوا کہ شاید مُجھے بچانے کی خاطِر خُدا نے بس کے باقی مسافروں کو بھی مرنے نہیں دِیا۔ خُدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ میرا وہم تھا یا میرے اندر کی آواز۔

پونچھ پہنچ کر معلوم ہوا کہ میرے دوُر کے ماموں اور میری فیروز پور کی چاہت کے سگے ماموں (جو اکثر مُجھے پڑھانے فیروز پور ہمارے گھر آیا کرتے تھے) کی شادی عنقریب ہی ہونے والی ہے۔ وہ لوگ رِشتے میں تو میرے ننہال والے ہی تھے۔ ہم سب لوگ شادی کے دوران دو تین دِن گُل پور نام کے گاؤں میں رہے۔ یہ گاؤں ہمارے اپنے گاؤں کھڑی دھرمسال سے سٹا ہُوا ہے۔ آج کل ''چکّاں دا باغ'' نام کے مقام سے ہندوستان پاکستان کے درمیان چلنے والی بسیں اِسی گاؤں سے ہو کر گزرتی ہیں۔ شادی کے دو تین دِنوں میں موقع تھا اپنی چاہت سے بات کرنے کا لیکن ۱۵ سال کا لڑکا ۱۳ سال کی لڑکی سے اظہارِ محبت کی جرأت نہ کر سکا حالانکہ وہ اِس کا بہُت خواہاں تھا، بہُت کوشش کر کے بس ایک بار اُس سے پانی کا ایک گلاس مانگ سکا۔ اُس نے پانی پلا دِیا اور بس، دِل میں البتہ چراغِ محبت روشن رہا۔ غلط یا صحیح مجھے یہ گُمان تھا کہ میرے والدین اور اُس کے والدین ایک نہ ایک دِن ہم دونوں کی ایک دوسرے سے شادی کروا ہی دیں گے۔ کئی بار سوچ چُکا ہوں کہ شاید اُن دو تین دِنوں میں جو چوک ہو گئی اُس کا خمیازہ مُجھے عُمر بھر بھُگتنا پڑا۔

اُنہی دِنوں مَیں نے اپنا گاؤں کھڑی دھرمسال پہلی بار اچھی طرح سے دیکھا۔ نیچے کی طرف میرے ننہال کی بستی جِس کا نام محلّہ دھنّی تھا اور اُوپر پہاڑ کی طرف میرے باپ دادا کا محلّہ کالا بن تھا۔ بیچ میں غضب کی خوشبوُ دار زرخیز زمین جو دوُر دوُر تک پھیلی ہوُئی تھی۔ ہماری زمینیں پاکستانی کشمیر کے بارڈر تک پھیلی ہوئی ہیں اور وہاں دس بیس قدم اِدھر اُدھر بھٹک جانے سے آدمی پاکستان کے قبضے والے کشمیر میں پہنچ جاتا ہے۔

اُس زمانے میں اپنے گاؤں کھڑی دھرمسال تک ہم لوگ بے تار نام کے دریا کو

پار کر کے ۵/۴ میل لمبے کٹھن پہاڑی راستوں سے ہو کر پیدل جاتے تھے۔ اُن دِنوں مَیں اکثر سوچا کرتا تھا (بلکہ خوابوں میں دیکھا کرتا تھا) کہ میرے گاؤں تک پکّی سڑک پہنچ جائے۔ بہُت بعد میں دریائے بے تار پر پکّا پُل بھی بن گیا۔ ہمارے گاؤں میں سڑکوں کا جال بھی بچھ گیا لیکن اُس وقت تک پانچ سو ہندو سِکھ گھرانوں کا گاؤں پوری طرح سے مُسلم گاؤں بن چُکا تھا۔ گِنتی کے پندرہ بیس گھرانے سِکھوں کے یا ہندوؤں کے اُس گاؤں میں باقی رہ گئے ہیں۔ بیشتر ہندوُ سِکھ زمیندار وں نے اپنی زمینیں اپنے مزارعوں (جِنھیں وہاں ہالی کہا جاتا ہے) کے ہاتھوں اونے پونے داموں بیچ ڈالی ہیں اور خود مہاجروں کی سی حالت میں یہاں وہاں بھٹکنا قبوُل کر لیا۔

مِٹی کے ساتھ رِشتے ہمارے قدیم تھے
یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب ہم مقیم تھے

کھڑی دھرمسال سے مُجھے آج بھی محبت ہے۔ عین سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے ہمارا گاؤں ہم سے چِھن چُکا ہے۔ ہماری زمین ہمارے پاؤں کے نیچے سے کھِسک چُکی ہے۔ میرے باپ نے آخری عُمر میں ہمارے حِصّے کی زمین مٹّی کے بھاؤ بیچ ڈالی۔ لیکن میرا اب بھی جی کرتا ہے کہ کھڑی دھرمسال میں دس بیس کنال زمین خرید کر ایک چھوٹا سا فارم ہاؤس بناؤں اور وہاں جا کے آباد ہو جاؤں اپنی زِندگی کے آخری لمحوں تک، سرحد کے دونوں طرف سے ہر لمحہ چلتے ہوئے گولی باروُد سے بے پرواہ ہو کر۔ یاد رہے کہ پونچھ کی سرحد پر دونوں طرف سے ٹک ڈم جاری رہتی ہے۔ حالات جنگ کے ہوں چاہے امن کے۔

آج کی دُنیا میں کئی مُلکوں کے مہاجر ہن کے کئی دُوسرے ممالک میں بھٹکنے کے

واقعات عام ہیں، لیکن ہم لوگ اپنے وطن کے وہ مہاجر ہیں جو اپنے وطن میں ہی بھٹکتے پھر تے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارا گاؤں ہمارا اصل ہمارا خمیر آج بھی ہندوستان میں ہی واقع ہے لیکن ہم وہ مہاجر ہیں جو مہاجر نہ ہو کر بھی مہاجر ہیں۔ پاکستان میں بسے ہوئے وہ لوگ بھی جو ۱۹۴۷ء کی ہندوستان کی بندر بانٹ کے دوران ہندوستان کے مختلف عِلاقوں سے ہجرت کر کے بہتر مُستقبِل کی اُمّید میں پاکستان چلے گئے تھے۔ نسل در نسل مہاجر ہی کہلاتے ہیں۔

ہم چاروں بھائی اور ہماری دونوں بہنیں آج الگ الگ جگہوں پر اچھّے خاصے گھروں کے مکین ہیں لیکن کچّے کوٹھوں والے اپنے اُس گاؤں اپنے اُس وطن کھڑی دھرمسال کے ہم سے چھِن جانے کا غم ہمیں اندر ہی اندر ہمیشہ کاٹتا رہتا ہے۔ ہم لوگ جموں میں ہوں یا ممبئ میں یا امریکہ میں اندر سے ہم اپنے وطن پونچھ کے ساتھ گویا ایک کچّے دھاگے سے بندھے رہتے ہیں یا شاید بغیر کِسی دھاگے کے۔

پھِر اور جا کے کہیں وہ اُگا اُگا نہ اُگا
کہ ایک بار جو پودا جڑوں سے ٹوٹ گیا
کہاں سے اپنی جڑیں ہم اُکھاڑ لائے ہیں
کہاں اُڑائے لِئے جا رہی ہے اب یہ ہَوا
تھیں سرحدیں تو کڑی ہم بھی تو پرندے تھے
زمین تنگ تھی لیکن تھا آسمان کھُلا
وہی کہ جِس سے تھیں قائم روایتیں اپنی
یہ کیا ہُوا کہ ہمیں نے وہ رِشتہ توڑ دِیا

وہی جو اپنے تھے ہونے لگے پرائے جب

کہ کُچھ الگ سا کریں ہم نے بھی یہ سوچ لیا

وہی کہ جِن کی محبت پہ ناز تھا ہم کو

پڑا جو وقت ذرا سا اُنہیں بھی دیکھ لیا

کُچھ اِس خیال سے محرومیاں رہیں اپنی

کہاں وہ پانے میں ہے چھوڑنے میں ہے جو مزا

ہمارا اصل ہمارا خمیر تھا بیتابؔ

جو ہم نے چھوڑ دِیا یا جو ہم سے چھوٗٹ گیا

فیروز پور چھاونی، پونچھ کا مودی خانہ اور کھڑی دھرمسال میرے دِل نگر کے وہ مقامات ہیں شاید جِن کے پس منظر میں مَیں نے یہ شعر کہا ہوگا :

دِل میں آباد کُچھ مقام تو ہیں
اِتنی فُرصت مگر کہاں کہ رُکیں

گردشِ ایام کا عالم تو یہ رہا ہے کہ

منظر وہ اُس کے بعد پھر آیا کبھی نہ تھا
پیچھے بھی ہم نے رخش کو موڑا کبھی نہ تھا

گرمیوں کی چھٹّیوں میں ہم نے پہلی بار پونچھ کے راحت افزا صحت افزا مقامات کی خوب سیر کی۔ منڈی (لورن)، بفلیاظ اور درابہ کُچھ ایسے مقامات ہیں جِن کا توڑ پونچھ تو کیا

پورے کشمیر میں کہیں نہیں ہے۔ پورے کا پورا کُنبہ خوب مزے میں رہا۔ میرے دِل میں البتہ میری فیروز پور کی چاہت کے کھو جانے کا خدشہ بھی ساتھ ساتھ رہا۔ مَیں جانتا تھا کہ اب زندگی میں دوبارہ فیروز پور جانے کا موقع بمشکل ہی مِلے گا، وہی ہوُا۔ آج میری عُمر ۶۲ برس کی ہو چُکی ہے۔ مَیں صِرف ایک بار نیشنل بُک ٹرسٹ آف اِنڈیا کے ایک ادبی پروگرام کے لئے بھٹنڈہ جاتے ہوئے فیروز پور چھاونی کے ریلوے اسٹیشن پر پانچ دس مِنٹ کے لِئے رُک سکا۔ لیکن ریلوے اسٹیشن میں وہ بات کہاں! پھر بھی عالم یہ تھا کہ:-

تیری سَجری پَیڑ دا رِتیا

چُم چُم لانواں اکھّ نوں

(یہ پنجابی لوگ گیت کی ایک صِنف ہے جِس کے معنی ہیں ''تیرے تازہ نقشِ پا کی ریت کو مَیں چُوم چُوم کر آنکھوں سے لگا رہا ہوں)

جموں میں آکر ہم لوگوں نے گاندھی نگر میں ایک خوبصورت مکان کرائے پر لے لیا۔ اِس مکان کا نمبر A / ۴۹۹ ہے اور اِس کے ایک حصّے میں ہم لوگ رہتے تھے، دوسرے حصّے میں میری بڑی بہن اپنے شوہر رگھبیر سِنگھ اور اپنی (بڑی) بیٹی کے ساتھ، رگھبیر سنگھ اُس وقت بھی ہماری اپنی موٹر بس (۹۰۳۳) چلاتے تھے اور باؤ جی نے اُن کو اب اُس میں حصّے دار بھی بنا دِیا تھا۔ اِسی دوران میں باؤ جی نے اپنے دو تین اور رِشتے داروں کو ٹرانسپورٹ کے کام میں لگوا دِیا۔ دو ایک اور بسیں خرید لیں۔ اپنے رِشتہ داروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نِکالا، اُنہیں اپنی بسوں پر کنڈکٹر لگوایا، پھر ڈرائیور بنوایا، پھر بسوں میں حصّے دار بنوایا۔ وہ رِشتہ دار حِصّہ دار ڈرائیور بعد میں پوری بسوں کے مالِک بن گئے اور باؤ جی کو اُن کا لگایا ہوُا سرمایہ بھی پورا پورا

واپس نہ مِلا۔ باؤجی کو آخری عُمر تک یہ غم اندر ہی اندر کاٹتا رہا مگر دُنیاداری کے لِئے اُنہوں نے اپنے رِشتہ داروں سے کبھی جھگڑا مول نہیں لِیا۔

تھے رِشتہ دار حِصّہ دار اَپنے
وہی سَب کھا گئے حِصّہ ہمارا

جموں میں باؤجی نے میرا داخلہ رنبیر ہائیر سیکنڈری سکول کی دسویں جماعت میں کروادِیا۔ میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کو گاندھی نگر کے ہی ایک سکول میں داخِل کروادِیا گیا۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن نریندر کور کو بھی گاندھی نگر میں ہی لڑکیوں کے کِسی سکول میں داخلہ مِل گیا۔ رنبیر سکول کی دسویں جماعت میں میری دوستی میرے کُچھ ہم جماعتیوں سے اِتنی اچھی طرح سے ہوگئی کہ ہم لوگوں کا ایک اچھّا خاصہ گروپ بن گیا۔ ہماری حاضری ایک بار پہلے پیریئڈ میں لگتی تھی۔ ایک بار دسویں پیریئڈ میں، دونوں بار حاضری ہمارے Form master لگاتے جن کا نام ایس۔ پی۔ رینہ تھا اور جو ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ بچوں سے پیار بھی کرتے تھے مگر پٹائی بھی اچھی کرتے تھے۔ ہمارا پورا کا پورا گروہ اکثر دوسرے پیریئڈ میں سکول کی دیوار پھاند کر دوڑتے ہوئے کِسی نہ کِسی سنیما تھیئٹر میں گُھس جاتا اور دسویں پیریئڈ تک فِلم ختم ہونے پر اُسی طرح سے دوڑتے ہوئے واپس آتا۔ وہی سکول کی دیوار پھاند کر Form master ایس۔ پی۔ رینہ کے حاضری لگانے پر Yes Sir, Yes Sir کہہ رہا ہوتا۔ مُجھے یاد ہے ایک بار رینہ صاحب نے ہمیں انگریزی ترجمہ کرنے کے لِئے یہ جُملہ دِیا تھا۔

"میں نے آج پرتپال اور روی کُمار کو دوسرے پیریئڈ کے بعد سکول کی دیوار

پھاندتے ہوئے دیکھا۔"

روی کُمار گُپتا میرے ایسے جانی دوست تھے جو دسویں جماعت سے لے کر آج تک میرے ساتھ بھائیوں سے بڑھ کر رِشتہ نبھا رہے ہیں۔ اُن کے گھر میں کوئی اہتمام ہو میرا (بلکہ میرے پورے کُنبہ کا) پہنچنا ضرُوری ہوتا ہے۔ روی آج جموں میں اپنے مرحوم والد کا تھوک کا کاروبار سنبھال رہے ہیں۔ روی بہت پیارے آدمی ہیں۔ دوستوں کے لِئے خلوص تو اُن کے اندر کوٹ کوٹ کر بھراہوُا ہے۔ اُن کی بیوی ہماری گپتا بھابھی بھی ہم لوگوں سے بہُت محبت کرتی ہیں۔ اُن کی دو جُڑواں بیٹیاں رائل، پائل اور اُن کا بیٹا رِشو کُمار ہمارے اپنے بچوں کی طرح ہیں۔ روی نے ہم لوگوں کی دسویں جماعت کی پوری کلاس کی ایک تصویر آج بھی اپنے ڈرائنگ رُوم میں سنبھال کے رکھی ہوئی ہے۔

دسویں جماعت کے امتحان کے بعد نتیجہ آنے میں دو ڈھائی مہینے باقی تھے۔ باقی بہن بھائیوں کے امتحانات میں ابھی کُچھ دیر تھی۔ والدین نے میری پہلے سے پونچھ چلے جانے کی خواہش پر مہر ثبت کر دی۔ وادیٔ پونچھ کے خوش نما نظّاروں کی سَیر کے خیال سے ہی دِل میں ایک عجیب سا رومانس پیدا ہو جاتا ہے۔ ماں نے جاتی بار میری جیب میں تیس رُوپے ڈالے اور کہا، "یہ پیسے مَیں خرچ کرنے کے لئے نہیں دے رہی ہوں۔ اِس لِئے دے رہی ہوں کہ سفر میں اور پردیس میں کبھی کوئی بھی مشکل پیش آجائے تو پیسہ کام آتا ہے۔" ماں کے یہ الفاظ آج تک زِندگی کے اُوبڑ کھابڑ راستوں میں میری رہنمائی کر رہے ہیں۔

دسویں کے امتحان اور نتیجے کے درمیانی عرصے میں میرے روابط اپنے پُونچھ کے ابتدائی عُمر کے دوستوں شام سُندر (آنند لہر) اور جسبیر سِنگھ پچھندہ وغیرہ سے اور بھی مضبوط

ہوئے۔ یہ دونوں دوست اور کچھ دُوسرے ہم عُمر (جن میں مہندر پیاسا کا نام مُجھے اب تک یاد ہے) اُس زمانے میں کچی عُمر میں اُردُو شاعری کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ شاید اُن لوگوں کی دیکھا دیکھی میرے من میں بھی شِعر و ادب کے انکوُر پھوٹنے لگے۔ انکوُر کیا پھوٹنے لگے گویا پانی کا ایک چشمہ زمین کا سینہ چیر کر پھوٹ پڑا۔ چشمہ کیا پھوٹ پڑا گویا ایک سیلاب تھا رُکا ہوا، جس کا باندھ ٹوٹ گیا اور سیلاب نے شش جہات میں تیز رفتار سے پھیلنا شروع کر دِیا۔ مَیں نے اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں غزل، آزاد نظم (اور کُچھ کہانیاں بھی) لِکھنا شروع کر دِیا۔ کئی کاپیاں، کئی رجسٹر میری شِعری تخلیقات سے پُر ہو گئے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کو اپنی شِعری تخلیقات سُناتے البتہ مَیں تھوڑا جھجک محسوس کرتا کیونکہ وہ لوگ بہُت پہلے سے اِس میدان میں تھے۔ دسویں جماعت کا نتیجہ مَیں نے پونچھ میں ہی ریڈیو پر سُنا۔ اُس وقت تک میرے والدین اور دوسرے بہن بھائی بھی پونچھ پہنچ چکے تھے۔ اُنہی دِنوں کی بات ہے میں اَور آنند لہر (شام سُندر) پُونچھ میں ایک چائے کی دُکان پر بیٹھے ہُوئے ایک دُوسرے کو اَپنی تخلیقات سُنا رہے تھے، مَیں نے ایک شِعر سُنایا، جس میں لفظ ''بیتاب'' بھی شامِل تھا۔ آنند لہر نے مُجھ سے پُوچھا ''بیتاب آپ کا تخلّص ہے؟'' مَیں نے جھٹ کہہ دِیا ''ہاں''۔ حالانکہ اُس وقت تک مَیں نے باقاعدگی سے کوئی تخلّص رکھّا ہی نہیں تھا۔ بس اُس کے بعد ''بے تاب'' میرا تخلّص ہو ہی گیا۔ ایک طرح سے سوچا جائے تو میرا تخلّص بیتاب رکھنے میں مُجھ سے زیادہ آنند لہر کا حِصّہ ہے۔

گیارہویں جماعت میں مَیں جموں واپس آ گیا۔ پھر سے وہی رنبیر سکوُل وہی دوستوں کا گروہ، میری تعلیمی مشکلات کا آغاز یہیں سے شروع ہوُا۔ گیارہویں جماعت میں پہُنچ کر مُجھے معلوم ہوُا کہ بڑے بھائی صاحب کی خواہش کے مطابق مَیں نے میڈیکل سبجیکٹس

لے تو لِئے تھے لیکن یہ میرا علاقہ دراصل تھا ہی نہیں ۔ کیمسٹری فزیکس اور بایولوجی میری طبعیت سے میل ہی نہیں کھاتے تھے ۔ 1965ء کی بات ہے گیارہویں جماعت میں ہم نے داخلہ لیا تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے ایک قسم کی پراپگینڈہ جنگ چل رہی تھی ۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اگست میں سکول کھلے تھے اور ستمبر میں پراپگینڈہ جنگ گولی بارود ٹینکوں اور ہوائی جنگ باز جہازوں کی جنگ میں بدل گئی ۔ جموں، پونچھ سے امرتسر، فیروز پور تک اور فیروز پور سے رن آف کچھ (Run of Kutchch) راجستھان تک پورے کا پورا مغربی سرحدی علاقہ آگ اُگل رہا تھا ۔ شام ہوتے ہی جموں شہر کے آسمان پر ہندوستانی اور پاکستانی ہوائی جہازوں کی جنگ دیوالی کی آتش بازی کا نظارہ پیش کرنے لگتی ۔ جموں شہر پر پاکستانی قبضے کا خطرہ منڈرا رہا تھا ۔ بہت سے لوگ شہر چھوڑ کر دور دراز کے محفوظ علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے تھے ۔ ایک دِن ہمارے گھر والوں نے بھی اپنی ہی ایک بس میں سوار ہو کر کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ۔ ہم لوگوں نے رات بھر سفر کرتے ہوئے دوسرے دِن شام کے وقت ہردوار پہنچ کر دم لیا ۔ گاڑی میرے بہنوئی رگھبیر سنگھ خود چلا رہے تھے ۔ ہماری بڑی بہن ست نام کور اور اُن کی چھوٹی سی بیٹی بھی ہمارے ساتھ تھی ۔ ہردوار میں پہلی بار پوِتر ندی گنگا سے آمنا سامنا ہوا ۔ پورے ہردوار میں ایک روحانی رومانی ماحول چوبیس گھنٹے غالب رہتا ہے ۔ گنگا میں ہم لوگوں نے خوب اشنان کئے ۔ ایک مہینے تک ہم لوگ ہردوار میں رہے ۔ عین ہر کی پوڑی (ہندوؤں کا تیرتھ استھان) میں گورونانک کی یاد میں ایک چھوٹا سا گورودوارہ بھی موجود ہے ۔ کہتے ہیں کہ گورونانک خود یہاں آئے تھے ۔

مَیں نے ہردوار میں خوب فلمیں دیکھیں۔ مُجھے یاد ہے ایک سنیما تھئیٹر بالکل ہرکی پوڑی کے ساتھ ہے (شاید گنگا تھئیٹر) ایک اور تھئیٹر تھوڑا آگے بازار میں ہے۔ مُجھے یاد ہے "بے نظیر" نام کی اشوک کمار مینا کماری اور (شاید) ششی کپوُر اور تنوجہ کی ایک مسلم سوشل فِلم مَیں نے اِسی تھیٹر میں دیکھی تھی۔ تنوجہ نے اُس فِلم میں بہُت خوبصورت چُلبُلی لڑکی کا رول کِیا ہے۔ مَیں تنوجہ کا اُس زمانے سے ہی دیوانہ (fan) ہوں۔ اُس کے بعد تنوجہ مُجھے سب سے زیادہ دیو آنند کی فِلم جیول تھیف میں پسند آئی۔

ہردوار سے تین کِلو میٹر کے فاصلے پر کنکھل نام کا گنگا کنارہ ہے جہاں سِکھ نِر ملے سادھوؤں کا گورودوارا (اکھاڑہ) ہے۔ ہردوار میں سادھوؤں کے اپنی اپنی سمپر داؤں کے اپنے اپنے اکھاڑے ہیں۔ نِرملے سِکھ سادھو بھگوے کپڑے پہنتے ہیں اور بھگوے ہی رنگ کی پگڑی باندھتے ہیں۔ کنکھل کے نِرملے آشرم کے بڑے سادھو (جِن کا نام شاید بشن سنگھ کریٹ تھا) میرے والد کو اچھّی طرح جانتے تھے۔ ہم لوگ کئی بار کنکھل کے اُس آشرم میں گئے اور وہاں لنگر بھی چھکا (کھایا)۔ ہمیں بتایا گیا کہ گنگا کِنارے کنکھل کے عین اُس نِرملے آشرم کی جگہ پر کِسی زمانے میں سِکھوں کے تیسرے گورُو امرناتھ جی تپسّیا کرتے رہے ہیں۔ سِکھوں کے دوُسرے گورو انگد دیو جی سے ملاقات کے بعد وہ سِکھ سمپر دائے میں شامل ہو گئے تھے۔

جنگ ختم ہونے کے بعد ہم لوگ واپس جموں آ گئے۔ جموں کے رنبیر سکوُل میں (کامریڈ دلجیت سِنگھ اور پروہِن کیسؔر وغیرہ) کُچھ ہم جماعتیوں نے مُجھے مارکسؔ اینجلز، لینؔن اور ماؤ زئے تُنگؔ وغیرہ کمیونسٹ نظرّیہ سازوں اور رہنماؤں سے متعلق کِتابوں وغیرہ

(literature) سے متعارف کروایا۔ کمیونسٹ مینفیسٹو اور لعل کتاب جیسی کتابوں کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ مَیں زمیں دوز کام کرنے والی ایک تنظیم سٹوڈینٹس فیڈریشن آف انڈیا کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ چارو مجومدار اور کاہنو سانیال جیسے نکسلی رہنما اُن دِنوں زمیں دوز کام کر رہے تھے۔ جموں کے کرشن دیو سیٹھی اور رام پیارا صراف بھی اُن دِنوں بڑے نکسلی لیڈروں میں شامل تھے اور زمیں دوز تھے۔ ہمارے دوست اور پیش رو ڈوگری زبان کے مشہور شاعر وید پال دیپ بھی زمیں دوز کارکن تھے۔ وید پال دیپ شراب بہت پیتے تھے۔ ایک بار دیپ نے شراب کے نشے میں روتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈوگری کی مشہور شاعرہ پدما سچدیو سے بہت محبت کرتے تھے۔'' شاعر غضب کے تھے۔ الگ ہونے کے بعد بھی پدما سچدیو سے بہت محبت کرتے تھے۔

کرشن دیو سیٹھی کے بارے میں اُن دِنوں کہا جاتا تھا کہ وہ اُس زمانے کے کابینہ درجے کے وزیر مُفتی محمد سعید (جو بعد میں پی ڈی پی کے صدر اور ریاست کے وزیرِ اعلیٰ رہ چکے ہیں) کے قریبی دوست ہیں اور زمیں دوز ہوتے ہوئے بھی اکثر مُفتی صاحب کی سرکاری رہائش گاہ میں رہتے ہیں۔ مَیں نہیں کہہ سکتا یہ بات کہاں تک سچ ہے مگر ہماری زمیں دوز تنظیم کی نشِست میں ہمیشہ اِس بات کا ذِکر ہوتا۔ کرِشن دیو سیٹھی بعد میں نکسلی تحریک سے الگ ہو گئے اور منظرِ عام پر آ گئے۔ رام پیارا صراف بھی کُچھ عرصہ بعد اِس مُسلّح تحریک سے الگ ہو گئے اور بین الاقوامی جمہوری پارٹی (Internationalist Democratic Party) نام کی ایک تنظیم سے منسلک ہو گئے۔

وید پال دیپ بعد میں کافی دیر تک جموں سے نِکلنے والے وید بھسین کے انگریزی

اخبار ''کشمیر ٹائمز'' میں کام کرتے رہے۔ حسین صاحب کے منع کرنے پر بھی خوب شراب پیتے رہے۔ روتے روتے اپنی سابقہ بیوی کو یاد کرتے رہے اور بالآخر اپنی متزلزل منتشر اور برباد زِندگی سے تنگ آ کر دُنیائے فانی کو خیر باد کہہ گئے۔ اُن کا ایک ڈوگری شِعر یاد آتا ہے

ساڑھے پاسا ہا یا اُندا ہا قصور

زِندگی بھر اس رہے پر لُور لُور

(قصوُر ہمارا تھا یا اُن کا مگر ہم زِندگی بھر در بدر رہے)

کالج میں رچھپال سِنگھ نام کے ایک کٹّر ہندو راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (R.S.S) کے نِکّر دھاری کارکن میرے دوست بن گئے۔ اُنہیں اُردو شاعری سے بلا کا لگاؤ تھا۔ خود بھی شِعر کہنے کی کوشِش کرتے تھے۔ مے کشؔ کاشمیری اور لالہ منوہر لعل دِلؔ نے اُنہیں ''بیدار'' تخلّص بھی عطا کیا۔ رچھپال میرے بہُت پیارے خوب رو دوست تھے۔ میری اُن کی دوستی محبت کے دائرے میں داخل ہو چکی تھی۔

مُجھے یاد ہے کالج کے زمانے میں کبھی کبھار مجھے دائیں بازُو کے ہندوتو نواز دوستوں سے مِلوایا جاتا تو وہ مُجھے دیکھتے ہی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتے۔ مَیں کوئی ایسا نکسلی لیڈر تو نہیں تھا لیکن رچھپال کے ہندوتو وادی دوست مُجھ سے اِتنا خوف کھاتے تھے گویا مَیں کوئی چارُو مجومدار یا کا ہنو سانیال کے درجہ کا نکسلی تھا۔

آج رچھپال میرا ہمدم میرا دوست مُجھ سے بچھڑ چُکا ہے۔ ہمارے الگ ہونے کی وجہ ہے رچھپال کی نہایت خوبصورت بیوی رینو (Renu) کا جل کر مر جانا۔ رچھپال اور اُس کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ اُس کے اسٹو و جلاتے ہوئے اُس کی ساڑھی نے آگ پکڑ لی تھی

جب کہ رینو نے ہسپتال میں مجسٹریٹ کے سامنے بیان دِیا کہ رچھپال نے اُسے جلایا ہے۔ بعد میں کُچھ سالوں کے بعد رچھپال رِہا ہو گیا۔ رینو کی خوبصورت لاش آج بھی میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔

گیارہویں جماعت میں مَیں پہلی بار فیل ہو گیا۔ دوسری بار پاس ہُوا، ایک سال ضائع ہو گیا۔ بارہویں جماعت میں مَیں نے جی جی ایم سائنس کالج میں داخلہ لیا۔ وہی کیمسٹری وہی فیزیکس وہی بایولوجی اور میرا وہی شِعر و ادب کا سِلسِلہ۔ البتہ کہانی لِکھنا چھوڑ کر مَیں نے شاعری پر ہی دھیان دینا شرُوع کر دِیا۔ جنون کی اِنتہا یہ تھی کہ ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میری غزلوں نظموں کی بیاض پونچھ میں ہی رہ گئی اور مَیں جموں واپس چلا آیا۔ جموں سے دوسرے دِن ہی پونچھ واپس آیا لیکن بیاض نہ مِلی۔ پھِر جموں واپس آ کے معلوم ہُوا کہ بیاض دراصل جموں پہنچ چکی تھی۔ مُجھے ہی کُچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔

اُسی سال کالج کے لٹریری میگزین کے سٹوڈینٹ ایڈیٹر کے لِئے پنجابی کے انچارج پروفیسر انجان سِنگھ نے آٹھ لڑکوں سے کِسی عنوان کے مضامین لکھوائے، پھِر پڑھنے سے پہلے مضامین پر اپنی مرضی سے نمبر لگائے ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ اور ۸۔ بعد میں اُنہوں نے مضامین پڑھے اور پڑھنے کے بعد اپنے پہلے سے لگائے ہوئے نمبروں کے مطابق نتیجے کا اعلان کر دیا۔ میرے مضمون کا نمبر آٹھواں تھا، جو لڑکا پہلے نمبر پر آیا وہ میڈیکل کی پڑھائی میں سب سے زیادہ لائق تھا اور مَیں سب سے زیادہ نالائق۔ ہربھجن سِنگھ رِسم نام کا وہ لڑکا بعد میں ماہرِ قلبیات بن گیا۔ وہ کالج میگزین کے پنجابی سیکشن کا انچارج تو بن گیا لیکن ادیب نہ بن سکا۔ مَیں ڈاکٹر نہ بن سکا لیکن شاعر ادیب ضرُور بن گیا۔ تمام تر مُشکلات اور رُکاوٹوں کے

باوجود۔

بعد میں جب کالج میگزین ''توی'' کے پنجابی سیکشن کے لِئے مَیں اساتذہ اور طلبہ کے رِشتوں سے متعلق اپنا ایک مضمون لے کر اُسی پروفیسر انجان سِنگھ کے پاس گیا تو اُس نے عنوان دیکھ کر ہی میرے مضمون کو دُور پھینک دِیا اور بس اِتنا کہا:-

"Don't write such articles"

اُسی برس میرے ایک ہم جماعتی کلبیر سِنگھ کے نام سے میرا لِکھا ہوُا خوابوں سے متعلق ایک مضمون کالج کے اُسی میگزین کے اُسی پنجابی سیکشن میں اُسی پروفیسر نے بڑی خوشی سے شائع کِیا تھا۔ زِندگی کے اُس موڑ پر مَیں نے دوبارہ کبھی پنجابی نثر نہ لکھنے کا مصمّم اِرادہ کر لِیا۔ آج اِتنے برسوں بعد سوچتا ہوں کہ اُس پروفیسر نے شاید پنجابی زبان کے ایک بہُت بڑے نثر نِگار کو پیدا ہونے سے پہلے ہی قتل کر دِیا تھا۔

بارہویں جماعت میں کیمسٹری میں میری Compartment آ گئی۔ مَیں اگلی جماعت میں داخل ہو سکتا تھا لیکن میرے بھائی صاحب نے کہا کہ اگلی کلاس میں داخلہ لینے کی کوئی ضرُورت نہیں ہے۔ Compartment Cancel کرواؤ اور اگلے سال پھِر امتحان دے کر ڈاکٹری کی سیٹ کے لِئے کوشش کرو۔ اگلے سال مَیں بالکل فیل ہو گیا۔ تیسرے سال پھِر کمپارٹمنٹ آئی، اُسی کیمسٹری میں۔ میرے دو سال اور ضائع ہو گئے۔ مَیں دُنیا بھر سے دو سال اور پیچھے رہ گیا۔ میرے ایک خالوُ اُن دِنوں ہمارے گھر آئے اور میرے ماں باپ سے کہا کہ وہ مُجھے کچھ گدھے خرید کر دے دیں تا کہ مَیں اُن پر اینٹ پتھّر ڈھو کر اپنی روٹی کمانے کے قابل ہو جاؤں۔

ایک دِن مَیں کالج کے نوٹس بورڈ پر ادبی میگزین سے متعلق کوئی نوٹس پڑھ رہا تھا جب میرے دُور کے رِشتہ دار اور کالج میں مُجھ سے ایک سال پیچھے پڑھنے والے ستیند ر سنگھ میرے پاس آ کر گویا ہوئے ''آپ بھی ادب کا ذوق رکھتے ہیں؟''مَیں نے کہا''ہاں شوق تو رکھتا ہوں لیکن مُجھے جموں کے ادبی ماحول کے بارے میں کُچھ واقفیت نہیں ہے۔'' وہ بولے ''مَیں جموں کی بزمِ فروغِ اُردو کا Publicity Secretary ہوں۔ ہماری بزم کی ہر اتوار شام کے چار بجے میٹنگ ہوتی ہے۔آپ بھی اُس میں آیئے ،ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔''

مَیں نے ستیند ر سنگھ فانؔی کے کہنے پر بزم فروغِ اُردو میں جانا شروع کِیا۔ بزمِ فروغِ اُرُدو کی ایک خصوصی نشست میں مَیں نے بھی ایک غزل سُنائی ۔ پروگرام ختم ہونے پر (مرحوم) مے کشؔ کاشمیری جو ریڈیو سٹیشن میں کام کرتے تھے میرے پاس آئے۔ مُجھ سے ہاتھ مِلایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اگلے دِن مُجھے ریڈیو سٹیشن آنے کے لِئے کہا۔مَیں دوسرے دِن ریڈیو پہنچا تو وہ میرے لِئے یوتھ پروگرام میں کلام سُنانے کے لِئے Radio Contract لِئے میرا اِنتظار کر رہے تھے۔ وہ میرا ریڈیو کا پہلا پروگرام تھا،جس کے لِئے مُجھے ۱۵ روپے مِلے تھے۔بعد میں مے کشؔ صاحب نے میرا تعارف (لالہ) منوہر لعل دِلؔ ، رہبر جدیؔد اور کُچھ دوسرے شعراء و ادبا سے کروایا۔اُنہیں دِنوں جموں کے ایک مشاعرے میں (مرحوم) لبھُو رام جوشؔ ملسیانی تشریف لائے تھے۔ مے کشؔ صاحب اور دِلؔ صاحب نے مُجھے اُن کی شاگردی میں پیش کر دِیا۔ جوشؔ صاحب نے مُجھے اپنے ساتھ آئے ہوئے اپنے شاگرد رشید (مرحوم) جناب ساحؔر سیالکوٹی کے حوالے کر دِیا۔ ساحؔر صاحب پانچ سات سال تک میری غزلوں پر اصلاح فرماتے رہے بعد میں مُجھے فارغ اُلبال قرار دے دیا۔

ے کشؔ صاحب اور دِلؔ صاحب کا احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ اُنہوں نے میری جدید شاعری کو کلاسیقیت کی چاشنی عطا فرمائی۔

کالج میں میرے ایک ہم جماعتی تھے، سرجیت سِنگھ۔ اُنہوں نے سب سے پہلے مُجھے دیوانِ غالبؔ لاکر دِیا۔ دیوانِ غالبؔ پڑھ کر میرے گویا چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بعد میں میرؔ و ذوقؔ و مومنؔ و داغؔ کا مطالعہ بھی کِیا اور اِن اساتذہ کے کلام سے بہُت کُچھ سیکھا۔ حالانکہ میری شاعری کی بنیاد میں سنت کبیرؔ، روی داس، نامدیو، تُلسیؔ داس، میرابائی، سِکھ گوروؤں کے کلام اور بُلّے شاہ، شاہ حُسین، وارث شاہ وغیرہ کی شاعری کا بہُت بڑا حِصّہ ہے۔

اُسی زمانے میں کالج کی لائبریری سے نفسیات، مارکسزم، سارترؔ اور کامُوؔ (وجودیت) وغیرہ سے متعلق کِتابیں مستعار لیکر پڑھنا میرا عام مشغلہ بن چُکا تھا۔ خاص طور سے کامُوؔ کی Outsider اور Sigmond Freud کی Interpretation of dreams نے مُجھے بہُت متاثر کِیا۔ علامت، استعارہ، انفرادی و اجتماعی شعور وغیرہ میں دِلچسپی نے میری سائنس کی تعلیم کو بُری طرح سے متاثر کِیا۔

بہرحال خُدا خُدا کر کے تیسرے درجے میں بی۔ایس۔سی پاس کرنے میں مُجھے کامیابی مِل ہی گئی۔ مَیں اُردو اور پنجابی شاعری میں روز بروز ترقّی کر رہا تھا لیکن میری تعلیم اور میرے مُستقبل کی فِکر مُجھے اندر اندر کاٹے جا رہی تھی۔

بھائی صاحب کی شادی رنجیت کور نام کی ایک ڈاکٹر لڑکی سے ہوگئی۔ بھائی صاحب کو آئر لینڈ میں ڈاکٹری کی نوکری مِل گئی۔ وہ چلے گئے، میرے اندھیروں میں ایک ایک کر کے روشنی کی کرنیں داخِل ہونا شروع ہوئیں۔ مَیں نے بھی اللہ پر ماتما واہگورُو کے فیض

سے کروٹ لی اور سوچا

کوئی اُمید پھر جگاؤں کہیں
اِک دِیا غار میں جلاؤں کہیں

اے انا اِتنا ساتھ دے میرا
موت سے پہلے مر نہ جاؤں کہیں

گمرہی تُو ہی کوئی راہ نِکال
دشت میں شہر اِک بساؤں کہیں

ہے جو دریا رُکا ہُوا بیتابؔ
سوچتا ہُوں اُسے بہاؤں کہیں

میری زِندگی کے تین قیمتی سال پہلے ہی ضائع ہو چُکے تھے۔ مُجھے اُس لمبی دوڑ (Marathon Race) میں پِھر سے شامِل ہونا تھا جِس میں میرے ہمنوا ہمنفس ہمجماعتی تین سال آگے نِکل چکے تھے۔ نئے سِرے سے بِکھری ہوئی اپنی ذات کو سمیٹنے کا ایک لمبا سفر میرے سامنے تھا۔

ابھی آگے ہے ایک دَور نیا
پھر سِمٹنا ہے پھر بِکھرنا ہے

بس اپنے آپ کو ایک جھٹکا دِیا ایک مکمّل انگڑائی لی اور دوڑنا شروع کر دِیا۔ اندر اندر کوئی اُمّید کی کِرن باقی تھی جِس کے بارے میں گویا مُجھے یقین تھا کہ وہ کِسی نہ کِسی دِن

آفتاب صورت ہو جائے گی۔

نِکل تو پڑے ہم تھے آشفتہ سر
نہ آثار اچھے نہ اچھّی خبر۔

☆☆☆

باب-۴

سائنس کے ناپسندیدہ یا شاید میری طبیعت سے میل نہ کھانے والے مضامین کی وجہ سے بی۔ایس سی میں میرے نمبر بہُت کم تھے۔تیسرے درجے میں بھی میرا مقام بہُت نیچے تھا۔کوشش کرکے مَیں ایل ایل بی میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوگیا۔حالانکہ یہ کام بھی آسان نہیں تھا۔قانون کے مضامین میری طبیعت کو بھا گئے۔پڑھنے میں مزہ آنے لگا۔خاص طور سے مندرجہ ذیل مضامین میرے پسندیدہ تھے۔

International relations
International Law
Political thought
Legal Ethics
Law of Torts
Juris Prudence
World Constitutions

اُس زمانے میں جموں یونیورسٹی میں Law Deptt. اور اُردو ڈیپارٹمنٹ ساتھ ساتھ ہُوا کرتے تھے۔دونوں شعبوں میں پڑھائی کا وقت بعد دوپہر دو سے پانچ بجے تک تھا۔ڈاکٹر گیان چند جینؔ اُس زمانے میں شعبۂ اُردو کے صدر تھے۔بزمِ فروغِ اُردو کی ایک خصوصی نشست میں (جس کی وہ صدارت کررہے تھے) اُنہوں نے میرا کلام سُنا تھا۔اُنہوں نے مُجھے یونیورسٹی میں دیکھا تو اپنے ساتھ شعبۂ اُردو میں لے گئے۔اُس کے بعد مَیں شعبۂ قانون سے

زیادہ شعبۂ اُردُو میں دیکھا جاتا۔ شعبۂ قانون میں تو میری حیثیت محض ایک طالبِ علم کی تھی لیکن شعبۂ اُردُو میں ڈاکٹر گیان چند جینؔ، ڈاکٹر شام لعل کالڑہ (عابدؔ پیشاوری)، منظرؔ اعظمی وغیرہ جیسے اساتذہ کے ساتھ بیٹھنے، چائے ناشتہ وغیرہ کرنے کا اعزاز حاصل تھا۔ آنند لہرؔ بھی میرے قانون کے ہم جماعتی تھے۔ وہ بھی اُس وقت تک اچھے خاصے افسانہ نِگار کے طور پہ مشہور ہو چکے تھے۔ کئی بار وہ بھی شعبۂ اُردُو میں میرے ہمراہ ہوتے۔ بعد میں پرفیسر جگن ناتھ آزادؔ بھی جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہو گئے تھے۔

شعبۂ اُردُو کی عمارت میں ہی شعبۂ پنجابی بھی ہُوا کرتا تھا۔ اُن دِنوں پروفیسر دلجیت سِنگھ اور پروفیسر دھرم پال سِنگھل جیسی نام ور ادبی شخصیتیں وہاں اساتذہ کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ پنجابی ڈیپارٹمنٹ میں بھی میرا اکثر آنا جانا رہتا تھا جو ڈاکٹر گیان چند جینؔ کو زیادہ پسند نہیں تھا۔ ابھی تک مَیں اُردُو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی شِعر کہہ رہا تھا۔ ہندی ڈیپارٹمنٹ بھی اُسی عمارت میں موجود تھا۔ وہاں ڈاکٹر سنسارؔ چند اور ڈاکٹر او پی گُپتؔ جیسے پروفیسر موجود تھے جن کے ساتھ میرا اکثر اُٹھنا بیٹھنا رہتا تھا۔ نرمل وِنودؔ جو پرانے دوست تھے (رنبیر سکوُل کے زمانے سے) ہندی کے بہُت اچھے کوی بن چکے تھے اور اُس زمانے میں ایم۔اے ہندی کر رہے تھے۔ وہ ہندی میں بہُت اچھے جدید گیت لِکھتے ہیں اور بہُت اچھے ترنّم میں پڑھتے ہیں۔

پروفیسر شام لعل کالڑہ (عابدؔ پیشاوری) کے ساتھ میری نِسبت اُن کے آخری سانس تک برقرار رہی۔ وہ سِکھ مذہب کے پیروکار تھے۔ شاید اِس وجہ سے بھی وہ مُجھ سے اُنس رکھتے تھے۔ زبان و بیان پر وہ بلا کی قدرت رکھتے تھے۔ مَیں ہمیشہ اُن سے مشورہ کِیا کرتا

تھا۔ وہ محقق تو تھے ہی شاعری بھی بہت اچھی کرتے تھے۔

اُسی زمانے میں بیتابؔ علی پوری نام کے ایک شاعر نے اخباروں میں اشتہار دِیا کہ وہ کُچھ شُعرا کی غزلیں دیوناگری رسم الخط میں کِتاب کی صورت میں چھپوانا چاہتے ہیں جس کے لِئے شعرا کا کلام درکار ہے۔ وفورِ شوق میں مَیں نے بھی اپنی غزلیں بھیج دیں۔ اُنہوں نے میری دس غزلیں اُس مجموعہ میں شامل کر کے مُجھے خوش ہونے کا موقع تو فراہم کِیا لیکن میری تصویر کے ساتھ بیتابؔ انبالوی لِکھ دِیا (کیونکہ مَیں انبالہ میں پیدا ہُوا تھا) اُس وقت تک ہریانہ پردیش قائم ہو چُکا تھا اور انبالہ ہریانہ میں شامل ہو گیا تھا۔ مُجھے بیتابؔ انبالوی بالکل پسند نہیں آیا کیونکہ مَیں اپنا نام ہمیشہ سے پرتپال سِنگھ بیتابؔ ہی لِکھتا رہا ہوں۔ خیر یہ قصہ یہاں درج کرنے کا اصل مُدعا یہ ہے کہ کُچھ دِنوں بعد ڈاکٹر آسانند بیتابؔ علی پوری نے مُجھے ایک خط لِکھ کر یہ کہا کہ مَیں اپنا تخلص بدل لوں۔ ڈاکٹر بیتابؔ علی پوری کافی دیر تک اِس سِلسِلے میں تاکید کرتے رہے لیکن مَیں نے اُن کی باتوں پر دھیان دینے کی بجائے آگے بڑھ جانا ہی مناسب سمجھا۔

جالندھر سے پنجابی روزانہ اخبار ''اجیت'' اُن دِنوں (مرحُوم) ڈاکٹر سادھو سِنگھ ہمدردؔ کی ادارت میں نِکلتا تھا۔ ہمدردؔ صاحب جوشؔ ملسیانی کے شاگرد تھے۔ اُردو میں بھی شِعر کہتے تھے لیکن پنجابی کے نامور غزل گو تھے۔ اُنہوں نے غزل کے موضوع پر پنجابی میں پی ایچ ڈی بھی کر رکھّی تھی۔ ہمدردؔ صاحب ہر اتوار کے دِن اجیت میں ''پنجابی پھُلواڑی'' کے عنوان سے طرحی غزلیں شائع کرتے تھے۔ وہ طرحی مِصرعے کے اوزان وغیرہ سمجھا کر شاعروں کو غزل کہنے کی تحریک دیتے۔ مَیں بھی اپنی غزل اِس طرحی اشاعت میں بھیجتا جو ہر اتوار اُس

وقت کے پنجابی کے بزرگ شعرا مثلاً دیپک جیتولی، مجرم دسُوہی اور خود ہمدرد صاحب کے ساتھ شائع ہوتی۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ مَیں بھی اُن کی طرح ہی کوئی عُمر رسیدہ شخص ہوں۔ ایک بار جب مَیں کِسی کام سے جالندھر گیا تو ہمدرد صاحب سے مِلنے ''اجیت'' کے دفتر میں جا پہنچا۔ مَیں نے اپنے نام کی چٹ اندر بھیجی تو اُنہوں نے فوراً مُجھے اندر بُلا لِیا لیکن مُجھے دیکھتے ہی بولے ''تہاڈے پتاجی نہیں آئے؟'' مَیں نے کہا، ''میرے پتا جی تو آنے والے نہیں تھے۔'' اُنہوں نے پھِر کہا، ''پرچٹ تاں بیتاب صاحب دے نام دی آئی سی''۔ مَیں نے کہا، ''جی مَیں ہی بیتاب ہوں۔'' اُنہوں نے کُچھ دیر کے لِئے تامل کِیا لیکن پھِر مُجھ سے ایسے گھُل مِل گئے کہ جب مَیں واپس جانے کے لِئے اُٹھا تو اپنی گاڑی پر مُجھے بس سٹینڈ تک چھوڑنے آئے۔

۱۹۷۵ء میں میری وکالت کی پڑھائی مکمّل ہوئی۔ اُس وقت تک اُردو شاعری میں میرا نام اچھا خاصہ چل نِکلا تھا۔ ۱۹۷۴ء کی ۲۸ جنوری کے دِن جموں کے اسمبلی ہال میں مَیں نے اپنی زندگی کا پہلا آل اِنڈیا مشاعرہ پڑھا تھا۔ یہ مشاعرہ جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی نے منعقد کروایا تھا اور اُس وقت کے ریاست کے چیف مِنسٹر سیّد میر قاسم نے اُس مشاعرے کی صدارت کی تھی۔ بشیر بدر نے اُس مشاعرے کی نظامت کی تھی۔ اُسی زمانے میں ریڈیو کشمیر جموں نے بھی مُجھے اپنے آل اِنڈیا مشاعروں میں بُک کرنا شروع کر دِیا تھا۔

فاروق مُضطر میرے راجوری کے دوست تھے۔ بہُت اچھّے جدید شاعر تھے۔ اُنہوں نے ایک دِن مُجھے رسالہ ''شب خون'' دِکھایا اور کہا آپ اپنا کلام اِس جریدے کے لِئے بھیجیں۔ مَیں نے پہلی بار ڈرتے ڈرتے اپنی سات نظمیں ''شب خون'' کے لِئے ارسال کر دیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے وہ نظمیں ''شب خون'' میں مِن وعَن شائع کر دیں اور

مجھے ایک خط لکھا جس میں خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اُس کے بعد ''شب خون'' کے آخری شمارے تک میں میری سینکڑوں نظمیں اور غزلیں شائع ہوئیں جس کی وجہ سے میری شاعری کو زبردست اعتبار حاصل ہوا۔

البتہ شاعر ممبئی میں میری ایک غزل ''شب خون'' سے بھی پہلے چھپ چکی تھی جب خود مرحوم اعجاز صدیقی ''شاعر'' کی ادارت کرتے تھے۔ اعجاز صدیقی کی ادارت میں میری ''شاعر'' میں شائع ہونے والی وہ پہلی اور آخری غزل تھی۔ بعد میں افتخار امام صدیقی میری تخلیقات ''شاعر'' میں شائع کرتے رہے۔ ممبئی میں اُس زمانے میں ایک اور رسالہ ''صبحِ اُمّید'' کے نام سے نِکلتا تھا۔ عبدالحمید بوبیرے اُس کے مُدیر اور شاید مالک بھی تھے۔ اُس جریدے میں بھی اُس زمانے میں میرا کافی کلام شائع ہوا۔

ایک طرح سے یہ میری ادبی اُٹھان بلکہ اُڑان کا عہد تھا۔ اِسی عہد میں مَیں نے سنجیدگی سے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ مُجھے اُردو اور پنجابی میں سے ایک ہی زبان میں شاعری جاری رکھنی چاہئے۔ دونوں زبانوں میں شاعری کرتے رہنا شاید دو کشتیوں کا سوار ہونے کے مترادف ہے۔ پنجابی میری مادری زبان ہے اور اُردو میرے وطن پونچھ کا Lingua franqa۔ دونوں زبانیں میرے لِئے برابر کی عزیز ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا بہت کٹھن تھا کہ کِس زبان میں شِعر کہنا جاری رکھوں، کِس میں چھوڑ دوں۔ ایک ڈیڑھ سال تک یہ تذبذب اندر ہی اندر جاری رہا۔ پھر ایک دِن مَیں نے اپنی فِکر کو ایک جھٹکا دِیا جسم نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور یہ فیصلہ لے لِیا کہ ایک سِکھ یا پنجابی ہوتے ہوئے پنجابی میں شاعری کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات تو یہ ہوگی کہ مَیں اُردو شاعری میں اپنا نام پیدا کر سکوں۔ بس اُس کے بعد

مَیں نے صِرف اور صِرف اُردُو زبان میں ہی شِعر کہنا جاری رکھا۔ پنجابی میں نثری تخلیقات مثلاً تنقیدی مضامین ، کتابوں کے دیباچے اور کُچھ دُوسرے مضامین کا سِلسِلہ البتہ جاری رہا۔ حالانکہ کُچھ لوگوں کو میرا یہ فیصلہ پسند نہیں تھا لیکن مَیں نے جو تہیّہ کر لیا سو کر لیا۔

میری وکالت کی پڑھائی کے زمانے میں جموں کی نمائش گاہ میں محکمۂ صنعت و حرفت کی طرف سے ایک بہُت بڑا ادبی پروگرام منعقد کروایا گیا۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عبّاس، ظ انصاری، سردار جعفری عصمت چُغتائی وغیرہ اِس پروگرام کے لِئے آئے تھے۔ تین دِن کے اُس پروگرام کے دوران میری اور آنند لہر کی کوششوں سے جموں یونیورسٹی میں اِن لوگوں کو بُلوایا گیا اور ایک خصوصی پروگرام منعقد کروایا گیا۔ حالانکہ کرشن چندر، خواجہ احمد عبّاس، سردار جعفری اور ظ انصاری کے ترقی پسند خیالات نے میری جدید ادبی شخصیت پہ کبھی کوئی نشانات نہیں چھوڑے البتہ اُس پروگرام نے ہمیں ادب کے میدان میں اور زیادہ جوش و خروش سے اُترنے کا حوصلہ دِیا۔ ٹھاکر پونچھی اُن دِنوں ہمارے رہنما تھے۔

ایل۔ ایل بی کے آخری سال میں میری مُلاقات (میری اہلیہ) انُو سے بڑے ڈرامائی بلکہ عجیب وغریب انداز میں ہوئی۔ میرے سکول کے زمانے کے ایک دوست تھے یوگیش صحرائی۔ اُن کو اُردُو میں شاعری کرنے کا بے طرح شوق چرایا تھا۔ حالانکہ سکول کے دِنوں کے بعد میری اُن سے کالج یا یونیورسٹی میں کبھی مُلاقات نہ ہوئی لیکن ادبی نِشستوں میں اکثر اُن سے مُلاقات ہُوا کرتی تھی۔ ایک بار مَیں نے سہواً اُن سے ذِکر کِیا کہ مَیں حسبِ معمُول گرمیوں کی چھٹّیوں کے لِئے پونچھ جا رہا ہوں۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے والد پونچھ میں ڈپٹی کمیشنر کے دفتر میں نوکری کرتے ہیں اور وہ لوگ اُن کے لِئے کچھ گھریلو اشیا بھیجنا

چاہتے ہیں۔ مَیں اُن کا کُچھ سامان ساتھ لے گیا۔ پونچھ میں میری چھوٹی بہن نریندر کور نے بتایا کہ "جن صاحب کا سامان لیکر اُن کے گھر جانا ہے اُن کی ایک بیٹی جو آجکل پونچھ آئی ہوُئی ہے میری سہیلی ہے"۔ مَیں نریندر کو ساتھ لے گیا۔ سامان یوگیش کے والِد پردیسی صاحب کے حوالے کِیا۔ وہاں نریندر کی سہیلی کلش اور اُس کی چھوٹی بہن بِٹو (ببیتا) سے مُلاقات ہوُئی۔ اُس برس کے میرے پونچھ کے قیام کے دوران پردیسی صاحب اور اُن کی دونوں بیٹیوں سے کئی بار مُلاقات ہوئی۔ ہم لوگ اکثر پونچھ کے ہوائی اڈّے کی طرف شام کی سَیر کے لِئے نِکل جایا کرتے تھے۔ اُن دِنوں پونچھ کا ہوائی اڈّا جہازوں سے زیادہ عام لوگوں کی سیرگاہ کے طور پر اِستعمال ہُوا کرتا تھا۔ شاید آج کل بھی ہو۔

چھٹّیاں ختم ہونے پر مَیں جموں جاتے ہوئے پردیسی صاحب کا بھیجا ہُوا کچھ سامان اُن کے گھر تک پہنچانے کے لِئے ساتھ لے گیا۔ جب میں یوگیش صحرائی کے گھر پہنچا تو میری مُلاقات سب سے پہلے یوگیش کی چھوٹی اور کلش کی بڑی بہن انُو سے ہوُئی۔ دونوں کی نظریں مِلتے ہی عالم یہ تھا کہ

رانجھے ہس کے آکھیا واہ سجّن
ہیر ہس کے تے مہربان ہوئی

مندرجہ بالا دو مصرعے پنجابی کی مشہور زمانہ شعری تخلیق "ہیر" میں اُس وقت آتے ہیں جب ہیر کا سامنا پہلی بار رانجھے سے ہوتا ہے۔ انُو نے بتایا کہ وہ میری شاعری کی زبردست مدّاح ہیں اور میرا کلام اکثر ریڈیو پر سُنتی ہیں۔

میرا اور انو کا یارانہ میرے گھر والوں کو ہی پسند تھا نہ اُس کے ماں باپ کو۔ میرا اِسکھ

گھرانہ ہندو ڈوگروں کی بیٹی کو بہو بنانے پر آمادہ تھا نہ انو کے گھر والے ایک سردار کو اپنا داماد بنانا چاہتے تھے۔ ہم دونوں نے البتہ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی ہم ایک دُوسرے کے ساتھ ہی کریں گے۔ چھُپ چھُپ کر ہم ایک دُوسرے سے مِلتے رہے۔ اِس بیچ میں میرے ماں باپ کئی جگہوں پر میرے رِشتے کی بات چلاتے رہے لیکن میرے مضبوط اِرادوں کے آگے اُن کی ایک نہ چلی۔

۱۹۷۵ء میں میں نے وکالت کی پڑھائی بہُت اچھے نمبروں کے ساتھ مکمّل کر لی۔ اُسی زمانے میں مَیں نے آئی اے ایس کا امتحان بھی دِیا لیکن مَیں اُس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ ایک دِن میرے دوست جسبیر سِنگھ پچھندہ نے مجُھے بتایا کہ کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کے امتحانات عنقریب ہی منعقد ہونے والے ہیں۔ مَیں نے وہ اِمتحان اِس خیال سے دے دِیا کہ شاید میری آئی اے ایس کے لِئے کی ہوئی تیاری کام آجائے۔ وہی ہوُا۔ مَیں نے تھیوری کا مرحلہ طے کر لیا۔ اب معاملہ Personality Test کا تھا۔ پرسنیلٹی ٹیسٹ یعنی ۲۵۰ نمبر کا انٹرویو۔

اِس بیچ میں انو کی طرف سے میرا دھیان ہٹانے کے لِئے میرے ماں باپ نے بڑے بھائی صاحب سے کہہ کر میرے لِئے کینیڈا کے البرٹا (Alberta) صوبے کی راجدھانی Edmonton کی یونیورسٹی میں میرے LLM میں داخلے کا پروگرام بنایا۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر مَیں Canada چلا گیا تو انُو کی طرف سے میرا دھیان ہمیشہ کے لِئے ہٹ جائے گا۔ بھائی صاحب اُن دِنوں Edmonton ہی میں قیام پذیر تھے۔

بے شک دُنیائے شِعر و ادب میں زمانہ میرے عرُوج کا تھا لیکن زِندگی اور معاش

کے دوسرے معاملات میں ایک عجیب قسم کی بے یقینی کا عالم تھا۔

مرحلے کامیابیوں کے تھے

ہر قدم اِک عذاب میرا تھا

کینیڈا میں ایل ایل ایم کرنے کا خیال بھی دِل میں ایک رومانس بھر دیتا تھا۔ کِسی نے بتایا کہ Canada کی کِسی یونیورسٹی میں ایل ایل ایم ہو جائے تو ذریعۂ معاش کی کوئی پریشانی باقی نہیں رہ جاتی۔ ایک خوف بھی تھا کہ اگر میں Canada چلا گیا تو آنُو سے میری محبت کہیں بیچ منجدھار ہی نہ رہ جائے۔ اُدھر یہ وسوسہ بھی اندر ہی اندر کارفرما تھا کہ K.A.S کے اِنٹرویو میں کامیاب ہو پاؤں گا یا نہیں۔ نہ کوئی سفارش تھی نہ میرے والدین پیسہ خرچ کر سکتے تھے۔ اُمّید کی ایک کِرن ضرور تھی کہ اُن دنوں ریاست میں گورنر راج نافِذ ہو چُکا تھا اور سِول سروس کے اِنتخاب میں زیادہ سیاسی دخل اندازی کی گنجائش نہ تھی۔ حالانکہ پیسے کے گندے کھیل کا خدشہ برابر موجود تھا۔

اُمید اور نا اُمیدی کے درمیان مَیں انٹرویو دینے چلا گیا۔ پبلِک سروس کمیشن کے کچھ ارکان کے عِلاوہ پولیس کے ایک بڑے افسر انٹرویو کے Penal میں موجود تھے۔ ایک صاحب جو پی۔ ایس۔ سی کے ممبر تھے اور سابقہ جج تھے (اُن کا نام آفتاب احمد یا شاید آفتاب عالم تھا) اُنہوں نے مُجھ سے قانون سے متعلق کُچھ سوالات پوچھے۔ پھر حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔ پھر اُنہوں نے مُجھ سے پوچھا کہ مَیں نے بی۔ ایس۔ سی۔ پاس کیا ہے پھر ایل ایل بی کی اور سِول سروس کے امتحان میں پنجابی زبان و ادب کا پرچہ دِیا۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟ مَیں نے جواباً کہا کہ مَیں اصل میں اُردو میں شِعر کہتا

ہوں اور پنجابی زبان کے ادب کا بھی رسیا ہوں۔ وہ بڑے حیران ہوئے۔ مجھ سے پوچھنے لگے آپ کوئی تخلّص بھی کرتے ہیں؟ (میرے کاغذات میں میرا نام پرتپال سنگھ تھا) میں نے کہا بیتابؔ تخلّص کرتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا پرتپال سنگھ بیتابؔ؟ ارے آپ کو تو مَیں جانتا ہوں۔ آپ کی شاعری پڑھتا سُنتا رہتا ہوں۔ البتہ ملاقات پہلی بار ہوئی ہے۔ اُن لوگوں نے مجھ سے کُچھ سُنانے کی فرمائش کی۔ مَیں نے ایک غزل سُنا دی۔ آفتاب صاحب نے دوسرے ممبران سے میرے سامنے کہا ''لڑکے نے قانون کے سوالات کے جواب بھی بالکل صحیح دِئے ہیں۔ تھیوری میں بھی اچھے نمبر ہیں۔ شاعر بھی ہے۔ بھئی مجھے تو لڑکا اچھا لگا ہے''۔ پولیس کے expert (جن کا نام شاید ایم ایم وزیر تھا) نے مُجھ سے پوچھا کہ آپ نے پولیس کا option کیوں نہیں بھرا؟ میں نے کہا مَیں پولیس کی نوکری میں دِلچسپی نہیں رکھتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا اگر چاہو تو ہم آپ کو پولیس کے لِئے consider کر سکتے ہیں۔ مَیں نے پھر کہا کہ مَیں پولیس میں Interested نہیں ہوں۔ انٹرویو ختم ہونے تک مُجھے اُمید ہو چلی تھی کہ شاید مَیں منتخب کر لیا جاؤں گا۔ میرے گھر والوں کو بالکل یقین نہیں تھا کہ میرا نام کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کی لِسٹ میں آ جائے گا۔ وہ لوگ مُجھے Canada بھیجنے کی پوری تیاریاں کر رہے تھے۔ میرا پاسپورٹ بن گیا۔ میرے کاغذات Edmonton چلے گئے۔ اور (شاید) LLM میں میرا داخلہ قریب قریب طے پا چکا تھا۔ میرے باؤجی میرے پاسپورٹ پر Canada کا ویزا لگوانے کے لِئے مُجھے دہلی لے جانے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے جب ایک دِن مُجھے سِول سروس کے سِلسلے میں Medical Test کے لِئے Appear ہونے کا حکم مِلا۔ میڈیکل ٹیسٹ میں مَیں بالکل ٹھیک ٹھاک ثابت ہوا۔ اب تک میرے والدین اور دوسرے رِشتہ داروں کو یقین ہو چکا تھا کہ مَیں زِندگی میں گدھوں پہ اینٹ ،

بجری، ریت ڈھونے کا کام کرنے والا ہیں ہوں میرے وہ خالوُ جنہوں نے میرے بارے میں گدھوں کے کاروبار کا شوشہ چھوڑا تھا۔ اُن کا ایک زمین سے متعلق مقدمہ حکیم منظوؔر کی عدالت میں چل رہا تھا۔ حکیم منظوؔر اُردُو شاعر تھے اور جموں میں Custodian, Evacuees Property کے عہدے پر فائیز تھے۔ میرے وہ خالوُ اپنے مقدّمے کے بارے میں میرے والد سے بات کررہے تھے جب مَیں نے اُن سے کہا کہ حکیم منظوؔر صاحب کو مَیں اچھّی طرح سے جانتا ہوں۔ پہلے تو اُن کو یقین ہی نہ آیا پھر کہنے لگے چلو اِس کھوٹے سِکّے کو بھی آزما لیتے ہیں، ہوسکتا ہے اندھیرے میں چل ہی جائے۔ حکیم منظوؔر صاحب نے مقدّمے کا فیصلہ میرے اُس خالوُ کے حق میں کر دِیا۔ مَیں نہیں جانتا کہ میرے اُس خالو کو میری قابلیت اور اہلیت سے متعلق اپنے خیالات کے سِلسِلے میں کچھ شرمندگی محسوس ہوئی یا نہیں۔

اب تک میرے والدین کا مُجھے Canada بھیجنے کا خیال ٹھنڈے بستے میں پڑ چُکا تھا۔ لیکن وہ میری شادی اپنی برادری کی کِسی لڑکی سے ہی کروانا چاہتے تھے۔ پریشان مَیں بھی تھا پریشان وہ لوگ بھی تھے۔ یہی نہیں انو کے گھر میں بھی پریشانی کا عالم تھا۔ اُن کی ماں نے ایک دِن کہا کہ بیتابؔ اگر ہمارے گھر میں شادی کرنا چاہتا ہے تو بال کٹوا کر آ جائے۔ انُو نے آگے بڑھ کر جواب دِیا کہ انہوں نے جِس لڑکے سے محبت کی ہے وہ ایک سردار ہے اور اگر بیتابؔ بال کٹوا کر آئے گا تو مَیں اُس کے ساتھ شادی کرنے سے اِنکار کردوں گی۔
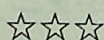
باب-۵

چار یا پانچ نومبر ۱۹۷۷ء کو مُجھے انڈر سیکریٹری ٹو گورنمنٹ کی نوکری کا گورنمنٹ (Appointment) آرڈر مِلا۔ ۷ نومبر کو مَیں نے سِری نگر میں نوکری join کر لی۔ جموں کشمیر میں گرمیوں کی راجدھانی سری نگر ہے جہاں سے سردیوں کے لِئے اُسی مہینے موسمِ سرما کی راجدھانی جموں کے لِئے ''دربار موو'' ہونے والا تھا۔ مَیں نے سِول سیکریٹریٹ کے جنرل ڈیپارٹمنٹ میں نوکری join کی تھی۔ میرے ساتھ دوسرے جو اُمیدوار انڈر سیکریٹری کے طور پر منتخب ہوئے تھے اُن میں سِوائے مسعوُد ساموُن کے (جو اُس وقت تک کشمیر یونیورسٹی میں فارسی کے اُستاد تھے) مَیں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ سیکریٹری جنرل ڈیپارٹمنٹ کے کمرے کے باہر مَیں نے دو خوبصورت کشمیری مسلم لڑکیاں دیکھیں جو مسلسل تیز رفتار میں کشمیری زبان میں آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔ اِن میں سے ایک محترمہ نسیم لنکر تھیں (جو بعد میں میری زندگی کے بہترین دوستوں میں شامِل ہوگئیں) یہ دونوں انڈر سیکریٹری کے طور پر میری colleagues تھیں۔ نسیم آگے بڑھ کر ایک عجیب قِسم کے اپنے پن کے ساتھ مُجھ سے متعارف ہوئیں اور دوُسری colleague تنویر جہان سے بھی میرا تعارف کروایا۔

مسعوُد ساموُن، نسیم اور تنویر کے عِلاوہ سی۔ پی۔ سنگھ، دِلیپ سِنگھ (جو پونچھ سے تعلق رکھتے تھے) اوتار کرشن رینہ اور سیّد فضل اللہ انڈر سیکریٹری کے طور پر میرے دوُسرے ساتھی تھے۔ ہم لوگوں میں غضب کا آپسی بھائی چارہ قائم ہوگیا۔ ہم لوگوں نے کُچھ دن اِکٹھے

خُوب آوارہ گردی کی کیونکہ ابھی تک ہمارا Training Schedule تیار نہیں ہُوا تھا۔ خالد حُسین جو پنجابی کے افسانہ نِگار ہونے کے ناطے میرے پہلے سے اچھّے دوست تھے اور سِول سیکریٹریٹ میں ہی محکمہ دیہات سُدھار میں ایڈیٹر کے عہدے پر تھے، ہم لوگوں میں اکثر شامِل ہو جاتے، بعد میں شیخ محمد عبداللہ کی سرکار بن گئی تو خالِد حُسین نائب وزیر اعلی کے پی اے بن گئے۔

افضل بیگ ایک ماہر سیاست دان اور قانُون دان تھے جو شیخ محمّد عبداللہ کے ہمیشہ سے قریبی ساتھی رہے اور اُن کے دائیں ہاتھ سمجھے جاتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس نے جس ''محاذ رائے شُماری'' کے ذریعے کشمیر کے حتمی سیاسی فیصلے کے لِئے رائے شُماری کا نعرہ لگایا تھا وہ محاذ اصل میں افضل بیگ کی اختراع سمجھی جاتی تھی۔

اِتفاق کی بات ہے کہ جو افضل بیگ سیاست کے ہر کٹھِن سے کٹھِن موڑ پر شیخ عبداللہ کے سِپہ سالار بن کر رہے جب ۱۹۷۸ء میں شیخ محمد عبداللہ دوبارہ وزیرِ اعلیٰ بنے اُسی افضل بیگ کے ساتھ اُن کے کُچھ ذاتی یا شاید سیاسی اِختلاف پیدا ہو گئے۔ یہ سب بہت شتابی میں ہُوا۔ ہوسکتا ہے سرکار کی باگ ڈور سنبھالنے پر طاقت کا نشہ اِسی باہمی اِختلاف و تکرار کا باعِث رہا ہو۔ یہ سب اِتنی تیزی سے ہُوا کہ ظاہر میں کِسی کو معلوُم ہی نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ البتہ خالِد حُسین کے افضل بیگ کے پی اے بننے کے بعد بہُت کم عرصے میں ہی بے چارے افضل بیگ کو نائِب وزیر اعلیٰ کی کُرسی سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔ جانی دوست جانی دُشمن بن گئے۔ بے چارے افضل بیگ اُس حادثے کے بعد کُچھ دیر تک محاذ رائے شُماری کی لاش کو گھسیٹتے رہے اور پھر جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

ہاتھ پھیلائے ہوئے جاتا ہے

ہے سِکندر بھی قلندر کِتنا

۱۶ نومبر کو سری نگر میں دفاتر بند ہو گئے ۔ دربار موُو کے لِئے ، لیکن اِن آٹھ دس دِنوں میں ہم لوگوں نے کالج ، یونیورسٹی کے طلبہ کی طرح خوب عیش کی ۔ نسیم کے عِلاوہ ہمارے گروپ میں سیّد فضل اللہ میرے سب سے زیادہ عزیز دوست تھے ۔ وہ عربی کے اسکالر ہونے کے عِلاوہ کشمیر کے آغا خاندان کے نہائت معتبر رُکن تھے ۔ اُن کا پورا نام آغا سیّد فضل اللہ الرضوی الموسوی ہے ۔

جموں واپس آکر مُجھے سب سے زیادہ انُو سے متعلق فِکر تھی ۔ انُو بھی اب چاہتی تھیں کہ ہم لوگ شادی کرلیں ۔ ماں باپ تو میرے ہی ماننے والے تھے نہ انُو کے ۔ مَیں اِسی اُدھیڑ بُن میں تھا جب ایک دِن نسیم نے مُجھ سے پوچھ لیا کہ مَیں کُچھ پریشان سا کیوں رہتا ہوں ۔ مَیں نے اُن کو ساری بات بتا دی ۔ نسیم خود شادی شُدہ تھیں اور حمید انور نام کے یونیورسٹی کے انگریزی کے لیکچرار سے اُن کی نئی نئی شادی ہوُئی تھی ۔ نسیم کے والد اے ۔ ایم ۔ لنکر صاحب اُس وقت جموں و کشمیر میں Finance Secy. تھے ۔ نسیم کی وجہ سے وہ ہمیشہ مُجھ سے بڑی محبت کرتے رہے ہیں ۔

۱۹۷۵ء میں ایل ۔ ایل ۔ بی کی پڑھائی مکمّل کرنے اور نومبر ۱۹۷۷ء میں میرے انڈر سیکریٹری بننے کے درمیانی عرصے میں مَیں نے پرائیویٹ اُمیدوار کے طور پر ایم ۔ اے ۔ پولیٹکل سائنس کرنے کا اِرادہ کرلیا تھا ۔ پہلے سال کا اِمتحان نوکری لگنے سے پہلے اور دوُسرے سال کا اِمتحان نوکری لگنے کے بعد یعنی ۱۹۷۸ء میں پاس کِیا ۔ حالانکہ مَیں اگر چاہتا تو

ایم۔اے (پول سائنس) کو بیچ میں ہی چھوڑ دیتا کیونکہ نوکری تو مل ہی چکی تھی لیکن پھر سوچا ایم۔اے مکمّل کرلی جائے تو کیا بُرا ہے۔

میرے والِدین جانتے تھے کہ اب جو میری نوکری لگ چُکی ہے تو مَیں انُو سے شادی ضرور کرلوں گا۔ اُنہوں نے ڈیرہ ننگالی صاحب پُونچھ کے مہنت بچتر سِنگھ جی کو مُجھے سمجھانے کے لِئے کہا۔ اُنہوں نے مُجھے ایک دِن بُلایا اور یہ شادی نہ کرنے کے لِئے کہا۔ مَیں نے اُن سے پُوچھا کہ کیا ہِندو لڑکی سے شادی کرنا سِکھ مذہب کے اصولوں کے خِلاف ہے؟ وہ میری بات کا جواب نہ دے سکے۔ مَیں نے اُن کی بات ماننے سے اِنکار کر دِیا۔ حالانکہ جموں و کشمیر کے زیادہ تر سِکھ لوگ ڈیرہ ننگالی صاحب کے مہنت صاحب کی بات کو نہیں موڑتے تھے۔

۱۶ نومبر ۱۹۷۷ء کو جموں آجانے کے بعد مئی ۱۹۷۸ء تک ہم لوگ پندرہ پندرہ دِن کے لِئے الگ الگ محکموں میں ٹریننگ لیتے رہے۔ اِس بیچ میں، ہم ساتوں لوگ ایک دُوسرے کے اور بھی قریب آئے۔ خاص طور پر نسیم کی اور میری دوستی روز بروز گہری ہوتی جارہی تھی۔ وہ میرے لِئے زبردست پریشانی کے دِن تھے۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کِیا جائے۔ بغاوت کے بغیر انُو سے شادی ممکن نہیں تھی۔ اُس پریشانی کے عالم میں نسیم نے ہر طرح سے میری مدد کی اور کافی حد تک میری رہنمائی کی۔ نسیم نے اپنے تمام تر رشتہ داروں میں مجھے بہ طریقِ احسن متعارف کروایا۔ اُن کے رشتہ داروں میں ڈاکٹر، انجینیر، دوسرے بڑے افسر اور دانشور ہیں۔ وہ لوگ ایک اُردو شاعر کی حیثیت سے اور نسیم کے ایک دوست کی حیثیت سے بھی میری عزّت کرتے ہیں، بڑے پُرخلوص لوگ ہیں۔

مئی ۱۹۷۸ء سے چار مہینے کے لِئے ٹریننگ کی غرض سے مُجھے جموں کشمیر کے ضلع راجوری کے ڈِپٹی کمِشنر کے پاس بھیجا گیا۔ اِس دوران مجھے ایم۔اے۔ پولیٹکل سائنس کے دوُسرے سال کے پرچے دینے کے لِئے جموں واپس آنا پڑا۔ مَیں آخری پیپر دے کر باہر آیا تو انُو میرے سامنے تھی اور اُس نے مُجھ سے کہا کہ مُجھے بھی ساتھ راجوری لے چلو۔ مَیں اُسے ساتھ لے گیا اور وہاں کورٹ میرج کر لی۔

مَیں اور انُو پندرہ دِن تک تو راجوری کے ڈاک بنگلہ میں رہے۔ بعد میں ہم نے راجوری میں ہی کرائے پر ایک مکان کا ایک حِصّہ لے لِیا۔ مَیں تھا تو انڈر سیکریٹری مگر ابھی تک Probationer تھا اور training پر تھا۔ تنخواہ سری نگر سے آتی تھی جو اکثر تاخیر سے پہنچتی تھی۔ گھر گرہستی شروُع ہوئی تو عملی زِندگی کے مسائل کا سامنا تھا۔ انُو ایک سوُٹ اور چپل میں گھر سے آ گئی تھی۔ میرے بھی کپڑے تک جموں گھر میں رہ گئے تھے۔ ایک ایک کر کے توا، کڑاہی، تھالی، گلاس، مٹّی کے تیل کا بتّیوں والا اسٹوو، انُو کے لِئے دو سستے سوُٹ، تھوڑا بہت راشن خریدا اور سفرِ خانہ داری کا آغاز کِیا۔ نئی نوکری تھی۔ تنخواہ محض ۶۱۰ روپے تھی۔ مُجھے یاد نہیں کہ گذارہ کِس طرح ہوتا رہا۔ ہاں اِتنا یاد ہے کہ فاروق مُضطرؔ، رفیق طاہرؔ، خورشید بسملؔ، اِقبال شناس صابرؔ مرزا، ونود گپتا جیسے قریبی دوستوں نے مُجھے کِسی قِسم کی پریشانی کا احساس نہیں ہونے دِیا۔ ایک فیصلہ ہم نے شروُع میں ہی کر لیا تھا کہ بھوکے رہ لیں گے لیکن زِندگی میں کِسی سے اُدھار نہیں مانگیں گے کیونکہ اُدھار محبت کی قینچی ہوتی ہے۔

راجوری میں میری training کے چار مہینے جہاں سرکاری دفتروں میں کام سیکھتے ہوئے گزرے وہیں راجوری اور تھنّہ منڈی میں اُردُو ادب سے متعلق کئی اہتمام ہوتے

رہے۔ فاروق مُضطر خورشید بسمل اور احمد شناس ادبی پروگرام منعقد کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ آج بھی پُونچھ راجوری کے علاقے سے خالِد کرّار اور عُمر فرحت جیسے نئی نسل کے لوگ اُردُو ادب کے چراغ کو بخُوبی جلائے ہوُئے ہَیں۔

ہم نے راجوری میں چار مہینے کمزور مالی حیثیت میں Honey Moon منایا۔ اِس ہنی مون کے دوران ایک دِن ایسا بھی آیا جب جیب میں صِرف آٹھ آنے تھے اور گھر میں صِرف مکّی کا آٹا۔ بازار سے آٹھ آنے کے پکوڑے لا کر مکّی کی روٹیوں کے ساتھ کھا کر گزارہ کِیا۔ خُدا کے کرم سے اگلے دِن تنخواہ کا چیک بھی آ گیا۔

آج اللہ کے فضل سے ہمارے پاس سب کُچھ ہے لیکن ہم راجوری کے وہ دِن کبھی نہیں بھول پائے۔ راجوری نے ہمیں ہماری عملی زندگی کی اساس عطا کی تھی۔

ایک رشتہ دار کی کوششوں سے پولیس والوں نے جموں سے راجوری ڈی۔سی۔ آفِس میں فون کِیا۔ جب اُنہیں معلوُم ہوُا کہ مَیں انڈر سیکریٹری ہوں اور ہم لوگوں نے قانونی طور پر شادی کر لی ہے تو وہ خاموش ہو گئے۔ وہ قریبی رشتہ دار ایک تاجر تھے اور کُچھ پولیس والوں سے دوستی رکھتے تھے۔ وہ شرُوع میں مالدار آدمی تھے مگر دھیرے دھیرے اُنہوں نے اپنا سرمایہ گنوانا شرُوع کر دِیا۔ لوگ نیچے سے اوُپر کی طرف جا رہے تھے وہ اُوپر سے نیچے کی طرف آ رہے تھے۔ وہ کافی دیر تک ہماری مالی خستگی کا خوب مذاق اُڑاتے رہے۔ کافی عرصہ بعد ہم جب مالی طور پر کُچھ سنبھل گئے تو اُن کا سامنا کرنے کے قابل ہوئے۔ وہ خود بھی اُس وقت تک مالی طور پر کمزور ہو چُکے تھے لیکن عالم یہ تھا کہ رسّی جل گئی پر بل نہ گیا۔

راجوری سے ستمبر ۱۹۷۱ء میں میری ٹریننگ ختم ہونے پر ہم لوگ سری نگر چلے

آئے۔ دربار موو نومبر مہینے میں ہونے والا تھا۔ ایک ڈیڑھ مہینے کے لِئے سِری نگر قیام کا مسئلہ تھا۔ پندرہ بیس دِن راجوری کے مرزا مرد حسین (ایس۔پی۔) کے گھر باغ مہتاب سری نگر میں گزارے اور باقی کے دِنوں کے لِئے میرے دوست خالِد حُسین کام آئے۔ اُن کے سرکاری فلیٹ میں ہمیں اِس عرصے میں رہنے کی اِجازت مِل گئی۔ اُن کی بیگم محترمہ نسیم بہُت ہی فیاض اور نیک عورت ہیں۔ اُنہوں نے ہمیں کِسی قِسم کی پریشانی کا احساس ہی نہیں ہونے دِیا۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء کے دوران ہی کشمیر یونیورسٹی میں ایک بہُت بڑا ادبی سیمینار مُنعقد ہوُا جِس کے ایک حِصّے کے طور پر ایک آل اِنڈیا مُشاعرہ بھی منعقد ہوُا جِسے سِری نگر دور درشن نے ٹیلی کاسٹ بھی کِیا۔ اِس مُشاعرے میں مُجھے بھی شِرکت کرنے کا موقع مِلا۔ اِس سیمینار اور مُشاعرے میں شمس الرحمٰن فاروقیؔ ، گوپی چند نارنگؔ، عالم خوند میریؔ، شمیم حنفیؔ ، شہریار وغیرہ نے شِرکت کی۔ زُبیر رِضویؔ اور مظہر امام پہلے سے سِری نگر ریڈیو اور ٹی وی میں نوکری کر رہے تھے۔ ایک نِشست مظہر امامؔ کے گھر پر بھی منعقد کی گئی۔ جِس میں جناب شمس الرحمٰن فاروقیؔ نے پہلی بار مُجھے گوپی چند نارنگؔ صاحب سے مِلوایا۔ مُجھے یاد ہے نارنگؔ صاحب اور فاروقیؔ صاحب اُس زمانے میں آپس میں گھی کھچڑی تھے۔ فاروقیؔ صاحب نے مُجھے نارنگؔ صاحب کو اپنا کلام سُنانے کے لِئے کہا۔ مَیں نے کُچھ شعر سُنائے جِس پر نارنگؔ صاحب نے کہا۔ ’’اِمکانات ہیں‘‘، مَیں نے فاروقیؔ صاحب سے میرے غریب خانے پر تشریف لانے کے لِئے عرض کی۔ فاروقیؔ صاحب کُچھ دوُسرے لوگوں کے ساتھ خالِد حُسینؔ کے فلیٹ میں میرے پاس کھانے پر تشریف لائے۔ میری مالی حیثیت بہُت خستہ تھی مگر دُنیائے شعر و ادب میں وہ میرے عروُج کا زمانہ تھا۔

اُنہی دِنوں سِری نگر میں Lambert lane نام کے ایک بازار میں گرم مردانہ سوُٹ (کوٹ پتلوُن) Discount Sale میں دو- دوسو روپے میں بِک رہے تھے۔ اِس بارے میں ریڈیو (آکاش وانی) کی کمرشیل براڈ کاسٹ کے ذریعے پتہ چلا۔ پہلی فرصت میں اُنو اور مَیں گئے اور اپنی کمائی (تنخواہ) میں سے پہلا سوُٹ میرے لِئے خرید ا گیا۔ سردیوں کا موسم سر پر تھا۔ دو سلوار قمیض سوُٹ اُنو کے لِئے راجوری میں خرید لِئے تھے۔ سری نگر کے لعل چوک میں گلابی رنگ کی ایک ساڑھی ایک دوکان کے باہر ٹنگی ہوُئی دیکھی تو اُنو کا دِل للچا گیا۔ میرے دِل میں ایک خوف تھا کہ وہ ساڑھی کہیں زیادہ قیمتی نِکلی تو ہماری توفیق سے باہر ہوگی۔ اُن دِنوں انڈر سیکریٹری، تحصیلدار اور ڈی۔ ایس۔ پی وغیرہ کی تنخواہ کا سکیل (Scale) ۹۰۰-۵۲۰ تھا، ۷۰ روپے مہنگائی الاوٗنس (.D.A) اور بیس رُوپے دربار موُو الاوٗنس (سیکریٹیریٹ کے ملازمین کے لئے)۔ ہماری نوکری کا پہلا ہی سال تھا۔ بنیادی تنخواہ کیونکہ ۵۲۰ رُوپے تھی اِس لِئے کل مِلا کر ۶۱۰ رُوپے ماہانہ ہاتھ میں ملتے تھے۔ اُنو نے آگے بڑھ کر ساڑھی کا مول پوچھ ہی لِیا۔ ساڑھی ۵۵ رُوپے کی تھی۔ ہم نے خرید لی۔ اُس ایک ساڑھی نے اُنو کا اور ہماری ازدواجی زِندگی کا بہُت دُور تک ساتھ دِیا۔ مُجھے وہ خوبصورت ساڑھی آج بھی یاد آتی ہے تو دِل میں ایک عجیب قِسم کا رومانس پیدا ہو جاتا ہے۔ شادی سے پہلے اپنے گھر میں اُنو بھی بیسیوں سوُٹ چھوڑ آئی تھی۔ میرے بہُت قیمتی قیمتی کپڑے بھی پیچھے چھوٹ چکے تھے۔ زِندگی کرنے کا جذبہ مگر شباب پر تھا، عالم یہ تھا کہ:

لُطف پرواز میں نہیں ہوتا
جب مخالِف ہوا نہیں ہوتی
یہ آبلہ پائی تو ہمراعزمِ سفر ہے

جانا ہے مُجھے وادیٔ پُر خار سے آگے

دریا تو ہے اِک مرحلۂ شوق وگرنہ

مقصودِ سفر ہے کہیں اُس پار سے آگے

مُجھے یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ وہ دَور جو میری کم مائگی کا دَور تھا میرے لِئے احساسِ کم مائگی کا دَور بھی تھا۔ عالم یہ تھا کہ

مُجھ کو ایسے لگتا ہے گھر سے جب نِکلتا ہوں

ہر کوئی مکمّل ہے ایک مَیں ادھورا ہوں

اُنہی دِنوں میری انڈر سیکریٹری Colleagues نسیم اور تنویر دونوں نے مِل کر پونچو نام کی ایک شال (Shawl) جیسی چیز انُو کو تُحفے میں دی۔ دو ایک سردیاں انُو نے اُسی پونچو کے ساتھ نِکال دیں کیونکہ شال خریدنے کی ہماری ابھی توفیق نہیں تھی۔

جب مَیں یہ سوانحِ عُمری لِکھ رہا تھا تو انُو نے مُجھے بتایا کہ ہماری کڑکی کے اُس زمانے میں میری انڈر سیکریٹری Colleague تنویر جہان نے کئی بار اُسے اپنے بڑھیا کپڑے شادی بیاہ وغیرہ میں پہن کر جانے کے لِئے دِئے تھے۔ مُجھے یاد ہے تنویر نے ایک بار مُجھے Chivas Regal نام کی بڑھیا سکاچ وہسکی کی آدھی بھری آدھی خالی بوتل بھی تُحفے میں دی تھی۔ اِس کے عِلاوہ تنویر سے ایک آدھ بار شاید اُدھار بھی لینا پڑا۔ آج ہمارے پاس کِسی چیز کی کمی نہیں ہے مگر اُس زمانے میں جِن دوستوں نے ہماری مدد کی تھی اُن کا احسان ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔ جِن لوگوں (خاص کر رشتہ داروں) نے اُس زمانے میں ہماری خوب کھلّی اڑائی اُن کو بھی ہم کبھی بھُلا نہیں سکتے۔

راجوری کے میرے دوست وِنود گُپتا نے بھی اُس زمانے میں ہماری بہُت حوصلہ افزائی کی تھی۔ وِنود گُپتا ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھے۔ میرے کالج کے دوست تھے۔ وِنود کے والِد لعلہ بہاری لعل کی راجوری میں کپڑے کی دوکان تھی اور وہ سابقہ ایم۔ایل۔سی بھی تھے۔لعلہ جی اُس عُمر میں بھی ایک بہُت خوبصورت شخصیت کے مالِک تھے۔

یہ وہ دَور تھا جب ۱۹۷۸ء میں شیخ محمد عبداللہ انتخابات جیت کر دوبارہ ایوانِ حکومت سنبھال چُکے تھے۔ ہم لوگوں کی تقرّریاں کیونکہ انتخابات سے پہلے ہی گورنر رُول (حکومت) کے دوران ہو چُکی تھیں اور اِن میں سیاسی دخل اندازی نہ کے برابر تھی لہٰذا نئی حکومت کے اکثر وزراء ہمیں زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اصل میں پبلِک سروِس کمیشن نے ۳۱ اُمیدواروں کا selection کِیا تھا جِن میں سے ۱۹ اُمید وار صوُبہ جموں سے تعلّق رکھنے والے تھے جِن میں دو سِکھ اُمیدوار یعنی مَیں اور دِلیپ سِنگھ بھی شامِل تھے۔ بعد میں دو اُمید وار لداخ سے تعلّق رکھنے والے بھی اُس فہرست میں شامِل کر لِئے گئے۔ صوُبہ کشمیر سے تعلّق رکھنے والے صِرف ۱۲ اُمیدوار ہی کامیاب قرار دِئے گئے تھے۔ نئی حکومت کے آنے پر مُجھے احساس ہونا شروع ہُوا کہ دوسرے کئی افسروں کی طرح مَیں بھی اکثر وزرا اور بڑے آفیسروں (Big Beureaucrats) کو بہُت بُری طرح سے ناپسند ہوں۔ ہم لوگوں کی تقرّریاں نومبر ۱۹۷۷ء میں ہو گئی تھیں۔ جب کہ شیخ محمد عبداللہ کی سرکار نے اپریل ۱۹۷۸ء میں باقی بچے ہوئے اُمیدواروں میں سے چُن چُن کر اکثر و بیشتر پسندیدہ اُمید واروں کو اچھّے اچھّے عہدوں پر مُنتخب (appoint) کر دِیا۔ میرے دوُسرے افسر ساتھی بھی اِس بات کو اچھّی طرح سے جانتے تھے لیکن کٹھِن مرحلوں بلکہ Hostile Terrains میں اِس کا اظہار کرنا بہُت مشکل تھا۔ مَیں تو شاعر ہوں اُس زمانے میں بھی ایسے کئی شعر سرزد ہو گئے:-

اِس آذروں کے شہر میں پتّھر تو مَیں بھی تھا

اُتری کِسی نظر میں نہ کوئی ادا مِری

میری اذیّتوں کا بھی تھوڑا خیال کر

اپنے عتاب کا بھی کبھی کچھ حِساب دے

ہم وہی ہیں وہی زمانہ ہے

بدلی بدلی سی ہے ہَوا اِتنی

یہ تو ہونا تھا ڈبونا تھا ہمیں ہر حال میں

اُس نے ہم پر ساحلوں کو بھی سمندر کر دِیا

داخل ہُوا جو مَیں تو مُجھے یہ خبر ہوئی

اِک اور دائرہ تھا جو اُس دائرے میں تھا

شیخ محمد عبداللہ کو تقریباً ۲۲ سال قَید، خود جلاوطنی اور سیاسی صحرانوردی جَیسی کیفیات میں مبتلا رہنے کے بعد دوبارہ حکومت کرنے کا موقع مِلا تو وہ ایک بدلے ہوئے اوتار میں سامنے آئے۔ شاید اندر ہی اندر اِس بار وہ کُچھ باتوں کا عہد کر کے ہی میدان میں آئے تھے۔ اُن کے اندر بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے ابتدائی مراحل میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے عہدِ حکومت میں اُنہیں گرفتار کِئے جانے اور بہُت دیر تک ایوانِ حکومت سے دُور رکھے جانے کے خلاف ایک کڑواہٹ تو تھی ہی لیکن اُنہیں اس بات کا بھی ملال تھا کہ اکثر و بیشتر کشمیری مسلمان آزادی کے اِتنے سال بعد بھی ترقی کی منازل طے نہیں کر پائے۔ شیخ عبداللہ نے پالیسی کے طور پر نظامِ حکومت میں کُچھ تبدیلیاں لانے کا عہد کِیا۔ ضلع تحصیل اور بلاک کی سطح

پر تقرّریاں اور انتخابات کے عِلاوہ آئی۔اے۔ایس کے مقابلے میں ریاستی نظامیہ سروِس (K.A.S) کو مضبوط کرنا بھی اُن کے نئے فیصلوں میں شامِل تھا۔ اِنڈین ایڈ منسٹریٹو سروِس کا ایک سِسٹم (System) ہے جس کے تحت یہ سروِس سارے ہندوستان میں کام کرتی ہے۔ اِس میں آدھے سے زیادہ افسر تو براہِ راست یونین پبلک سروِس کمیشن کے ذریعے مُنتخب ہوتے ہیں اور باقی ریاستی سِول سروِسز میں سے ترقی (Promotion) دے کر شامِل کِئے جاتے ہیں۔ دراصل شیخ محمد عبداللہ کو یہ بات زیادہ پسند نہیں تھی۔ باہر سے آئے ہوئے افسر ریاست جموں کشمیر کی حکومت چلائیں، لیکن یہ مُعاملہ اِتنا آسان نہیں تھا جتنا وہ سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی مرضی کے افسروں کو اعلیٰ عہدوں پر تعینات تو کرنا شروع کر دِیا مگر اُس کے مثبت نتائج کم برآمد ہوئے منفی زیادہ۔ ریاست میں باہر سے آنے والے بڑے افسر شاہ (آئی۔اے۔ایس افسر) تو اِس پالیسی سے بالکل متاثر نہ ہوئے لیکن گاج گِری تو بے چارے سیاسی طور پر کمزور کُچھ افسروں پر، جن کا کوئی سیاسی سماجی مذہبی طور پر مضبوط پسِ منظر نہیں تھا۔

ریاست جموں و کشمیر اصل میں تین بالکل علحدہ قِسم کے خِطّوں پر مشتمل ہے۔ پنجاب کی طرف سے اِس میں داخل ہوتے ہی آپ کا سامنا صوبہ جموں سے ہوتا ہے جموں ریاست کا Gate way بھی کہلاتا ہے۔ پٹھانکوٹ سے مادھو پور (پنجاب) سے ہوتے ہوئے ہم لکھن پور کے ذریعے جموں یعنی ریاست میں داخل ہوتے ہیں۔ صوبہ جموں میں جموں، راجوری، پونچھ، اودھم پور، ریاسی، ڈوڈہ، بھدرواہ، کِشتواڑ، رام بن، بانہال، بسوہلی، کٹھوعہ، رنبیر سِنگھ پورہ وغیرہ عِلاقے ہیں۔ یہاں کی بڑی زبانیں ڈوگری، گوجری، پہاڑی، پنجابی وغیرہ ہیں۔ آبادی قریب قریب صوبہ کشمیر کے برابر ہے اور اکثریت ہِندو مذہب کے ماننے والوں کی ہے۔ دوسرے نمبر پر مُسلم آبادی ہے پھر (تیسری بڑی آبادی)

سکھ اور پھر جین اور عیسائی ہیں۔ صوبہ جموں کے ۳۷ میں سے ۲۵/۲۶ ایم۔ ایل۔ اے۔ ہمیشہ ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی پارٹی کے اُمیدوار رہے ہوں۔ صوبہ جموں کے اکثر و بیشتر لوگوں کا کھانا پینا اُٹھنا بیٹھنا، تہذیبی و ثقافتی رسم و رِواج، میلے ٹھیلے، دیوالی، بیساکھی، لوہڑی وغیرہ اور شکلیں صورتیں بھی پنجاب اور ہماچل پردیش کے لوگوں سے عین مشابہ ہیں۔ راوی اور چناب پنجاب کے پانچ دریاؤں میں وہ دو دریا ہیں جو ہماچل پردیش سے آتے ہیں اور جموں سے ہوتے ہوئے (مغربی) پنجاب میں چلے جاتے ہیں۔ پونچھ اور جموں کے سِکھوں کے عِلاوہ رنبیر سِنگھ پورہ، بِشناہ، ہیرانگر، رام گڑھ، چھمب، جوڑیاں وغیرہ کے لوگوں کی زبان عام طور پر پنجاب کی پنجابی زبان سے ہُو بہُو مشابہ ہے۔

صوبہ کشمیر کی حدود جموں کے عِلاقہ بانہال سے آگے شروع ہوتی ہیں۔ خاص طور سے جواہر ٹنل کے اُس پار سے آگے، صوبہ کشمیر کے عِلاقے قاضی گُنڈ سے اننت ناگ پھر سِری نگر پھر بارہ مولہ ہوتے ہوئے اُوڑی کرناہ، ٹنگ ڈار وغیرہ پہاڑی علاقوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں لوگ پہاڑی زبان بولتے ہیں جو (مغربی) پنجاب کے علاقہ پوٹھوہار کی زبان سے عین مشابہ ہے۔ باقی سب عِلاقوں میں لوگ کشمیری زبان بولتے ہیں۔ آبادی ۹۵% سے زیادہ مسلمانوں پر مُشتمل ہے۔ کشمیری پنڈت تو موتی لعل نہرو کے بزرگوں کے زمانے سے (کشمیر سے) ہجرت کر کے باہر چلے آتے رہے ہیں۔ وجوہات سیاسی رہی ہوں، سماجی یا پھر معاشی، کشمیر کی آبادی لگ بھگ صوبہ جموں کی آبادی کے برابر ہے لیکن کشمیر سے اسمبلی کی ۴۴ سیٹیں ہیں (جموں کی ۳۷ سیٹوں کے مقابلے میں) اِس کی وجہ سیاسی مصلحت اندیشیوں کے عِلاوہ کچھ بھی نہیں ہوسکتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آجکل جموں کو الگ ریاست کا درجہ دلوانے کے لِئے سیاسی تحاریک چلانے والوں کا ماننا ہے کہ جموں کی آبادی کشمیر کے لگ

بھگ برابر ہے اور عِلاقہ کشمیر کے کُل عِلاقے سے زیادہ۔ اِس کے باوجود کشمیر کے لِئے اسمبلی میں ۴۴ سیٹیں رکھی گئی ہیں۔ جبکہ جموں کے لِئے صِرف ۳۷ سیٹیں مُختص کی گئی ہیں۔ اِس طرح یہ معاملہ عِلاقائی عدم توازن کا بنتا ہے۔

مَیں نے اِس مُعاملے پر کئی بار سوچا ہے اور ہر بار یہی بات سمجھ آتی ہے کہ بھارت سرکار کشمیر کے اکثریتی طبقہ کو بھارت میں شامل رہنے پر آمادہ رکھنے کے لِئے جموں کی آبادی کے ساتھ تفرقہ آمیز سلوُک روا رکھتی رہی ہے۔ ہندوستان مخالِف تحاریک ہمیشہ صوبہ کشمیر میں سر اُٹھاتی رہی ہیں جبکہ صوبہ جموں میں ماحول ہمیشہ بھارت کے حق میں رہا ہے۔

ہندوستان سرکار کی Appeasement پالیسی کا خمیازہ جموں کے لوگوں کو اکثر بھُگتنا پڑتا ہے۔ خاص طور سے جموں کے ساتھ اگر کہیں نا اِنصافی ہو رہی ہو۔ ہندوستان کی National level کی سیاسی جماعتیں اِسے مُلک کے مجموعی سیاسی مفاد کے حق میں ہمیشہ جائز تسلیم کرتی رہی ہیں۔

صوبہ لداخ عِلاقے کے اعتبار سے ریاست کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ آبادی بہُت کم ہونے کی وجہ سے لداخ کے لِئے صرف چار اسمبلی سیٹیں مختص کی گئی ہیں۔ دو سیٹیں بُدھ مذہب سے تعلق رکھنے والے ضِلع لیہہ کے لوگوں کے لِئے اور ایک سیٹ شیعیہ مسلم اکثریتی ضِلع کرگل کے لِئے تیسری سیٹ لیہہ اور کرگل کے درمیانی علاقے کے لِئے ہَے۔ لیہہ اور کرگل کے لوگ جموں اور کشمیر کے لوگوں سے بالکل الگ ہیں۔ اُن کی اپنی زبان ہے، اپنا کھان پان ہے، اپنا پہراوہ ہے۔ ضلع لیہہ کے لوگ ہندوستان کے اندر اپنا الگ Union Territory کا درجہ چاہتے ہیں۔ لداخ کہتے ہیں کہ ایک سرد پہاڑی ریگستان ہے۔ دُنیا میں سائبیریا کے

بعد دُوسرے نمبر پر سرد عِلاقہ دراس لدّاخ (ضِلع کرگل) میں ہی ہے۔ لدّاخ کے لِئے ایک
راستہ کشمیر سے ہے جو سِری نگر سے ہو کر سونہ مرگ سے آگے جاتا ہے، دُوسرا راستہ ہماچل
پردیش کے ضِلع منالی سے براستہ روہتانگ پاس ہے۔ لیہہ کی بُدھ مذہب سے تعلق رکھنے والی
آبادی کے رابطے منالی کے بُدھسٹ لوگوں سے زیادہ ہیں بنسبت اُن کے کشمیر یا جموں کے
لوگوں کے ساتھ رِشتوں کے۔ وہ لوگ اکثر لیہہ سے ہوائی جہاز کے ذریعے چنڈی گڑھ یا دہلی
جانا پسند کرتے ہیں۔ لداخ میں کِسی قِسم کا ہند مخالف ماحول بالکل نہیں ہے۔ مسئلہِ کشمیر
1977ء سے جُوں کا تُوں چلا آرہا ہے۔ نہ یہ گولی سے حل ہو سکا نہ بولی (بات چیت) سے۔
کشمیر میں حالات روز بروز بگڑتے رہتے ہیں۔ ماحول اکثر ہند مخلف رہتا ہے۔ لیکن صُوبہ
جموں میں ماحول ہمیشہ ہند حمایتی رہتا ہے۔ جب کشمیر میں اِنتخابات کا بائی کاٹ کِیا جاتا ہے
اور پولنگ ۵-۵/۷-۷ فی صد ہوتی ہے اُن دِنوں بھی پُورے کے پُورے صُوبہ جموں میں
۷۰-۷۵/۷۵-۷۵ فی صد پولنگ ہوتی ہے۔ یعنی جموّں کے لوگ دِل سے اِنتخابات میں یعنی
بھارتی جمہوُریت میں پُورا پُورا یقین رکھتے ہیں۔

مَیں کئی بار سوچتا ہُوں کہ صُوبہ جموں کو اگر ایک الگ بھارتی ریاست کے طور پر تسلیم کر
لِیا جائے اور صُوبہ کشمیر کے مسئلے کا حل سیاسی کاروائی کے طور پر ہندوستان پاکِستان اور کشمیری
رہُماؤں کے درمیان کر لیا جائے تو جموں والے بھی خُوش رہیں گے اور کشمیری عوام بھی مسئلہِ
کشمیر کے کِسی مُستقِل حل کے بعد خُوش رہیں گے۔ مسئلہِ کشمیر کا حل کیا اور کِس طرح سے ہو یہ
فیصلہ ہندوستان پاکستان اور کشمیری رہنُماؤں کو مِل جُل کر کرنا ہوگا۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ہی میری پہلی باقاعدہ تقرّری انڈر سیکریٹری ٹو گورنمنٹ

انڈسٹریز اینڈ کامرس ڈیپارٹمنٹ کے طور پر ہوئی۔ اِس طرح دس گیارہ مہینے کی ٹریننگ کے بعد ہم لوگوں کی باقاعدہ تقرریاں الگ الگ محکموں میں ہوگئیں۔ سبھی Colleagues کی postings کے بارے میں تو یاد نہیں لیکن اِتنا یاد ہے کہ نسیم (لنکر) کی تقرری محکمۂ تعلیم میں مسعود سامون کی H & UD ڈیپارٹمنٹ میں اور تنویر جہان کی محکمۂ زراعت میں ہوئی تھی۔ ہماری postings ہوتے ہوتے دربار موو بھی ہوگیا۔

پھر سری نگر سے جموں کا سفر درپیش تھا۔ جموں میں رہائش کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ گھر جانے کی تو کوئی گنجائش ابھی تھی نہیں، خالد حُسین سے اِن مشکلات کا ذِکر کِیا تو اُنہوں نے کہا کہ جموں میں قلعہ باہوُ کے پاس اُن کا ایک دو کمرے کا مکان خالی پڑا ہے، مَیں اگر چاہوں تو اُس میں رہ سکتا ہوں۔ بھوکے کو کیا چاہیے دو روٹیاں۔ نہ نکّر کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ خالد حُسین کا یہ اِحسان مَیں نہیں بھُلا سکتا کیونکہ اُس وقت میری مالی حیثیت جموں شہر میں مکان کرائے پر لینے کی بھی نہیں تھی۔ بازار سے ایک بِستر بند خریدا۔ جو تھوڑے بہُت کپڑے وغیرہ تھے اُس میں باندھے، باقی سامان (برتن وغیرہ) ایک چادر میں باندھ کر جموں کشمیر روڈ ٹرانسپورٹ کی ایک بس پر سری نگر سے جموں چلے آئے۔ اُس زمانے میں (آج کے عالی شان) باغِ باہوُ کی ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک پہاڑ تھا، کھڑا پہاڑ، جس تک پہنچنے کے لِئے دریائے توی سے ہوکر جانا پڑتا تھا۔ دریا پر کُچھ لوگوں نے پھٹّے لگا کر پُل جیسی ایک عارضی سی شے بنا رکھی تھی۔ دس پیسے لے کر وہ لوگ لکڑی کے پھٹّوں کے اُوپر سے گذرنے کی اِجازت دے دیتے تھے۔ بہر حال کِسی طرح دریائے توی پار کر کے پھر قلعہ باہوُ کا کھڑا پہاڑ چڑھ کر چھوٹے سے خوبصوُرت مکان میں ہم لوگوں نے ڈیرہ ڈال دِیا۔

☆☆☆
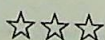
باب-۶

نومبر ۱۹۷۸ء سے ہم نے اپنی ازدواجی زِندگی کا صحیح معنوں میں آغاز کِیا۔ جموں کے قلعہ باہُو میں مہا کالی کا ایک مشہور مندر ہے جس پر جموں کے (ہندو) لوگوں کی بڑی آستھا ہے۔ اُس زمانے میں منگل اور ایت وار کے دِن جموں سے لوگ جوق در جوق مہا کالی کے اُس مندر میں پوجا کی غرض سے آیا کرتے تھے جس وجہ سے ہفتے کے اِن دو دِنوں میں جموں سے بسیں اور ٹیمپو وغیرہ خُوب آتے جاتے تھے۔ منگل کے دِن دفتر کے لِئے مُجھے بس مِل جاتی تھی، ہفتے کے باقی دِنوں میں دفتر جانے کے لِئے مَیں کھڑا پہاڑ اُترتا، دریا پار کر کے شہر میں داخل ہوتا۔ اِسی طرح واپسی پر سول سکریٹیریٹ سے دریائے توی تک آتا۔ دریا پار کر کے کھڑا پہاڑ چڑھتا اور گھر پہنچتا۔ کئی بار تو برسات کی وجہ سے دریائے توی پر بنا ہُوا لکڑی کے پھٹوں کا عارضی پُل بہہ چُکا ہوتا اور مُجھے بکرم چوک اور یُونیورسٹی (نئے کیمپس) کے راستے ۶-۵ کِلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے جانا پڑتا۔ اَیسا کئی بار لگاتار برستی ہُوئی بارِش میں بھی کرنا پڑتا۔ دُنیا کی نظر میں تو مَیں محکمہ صنعت وحرفت کا انڈر سکریٹری تھا۔ سُوٹ بُوٹ اور ٹائی پہن کر دفتر میں کرسی پر بیٹھے ہوئے میری اندر کی خستہ حالی کِسی پہ ظاہر نہ ہوتی۔

مَیں جو ظاہر میں ہوں بہت بھرپور
میرے اندر کوئی خلا ہے بہت

جموں وہی شہر تھا جس میں مَیں نے تعلیم حاصِل کی، نوکری حاصِل کی۔ یہ وہی شہر تھا جس میں میرے والدین کے عِلاوہ میرے بُہت سے رشتہ دار دوست اور دوسرے آشنا غیر آشنا

جاننے والے رہتے تھے۔ یہ وہی شہر تھا جس کی گلیوں اور بازاروں میں مَیں نے برسوں بے باک آوارہ گردی کی تھی۔ یہ وہی شہر تھا جس کی رومانس سے پُر فضاؤں نے مُجھے میری شاعری عطا کی تھی۔ یہ وہی خوبصورت شہر تھا جس میں کئی کئی خوبصورت لڑکیاں میری شاعری کی وجہ سے اندر اندر مجھے پسند کرتی رہی ہیں۔ یہ وہی شہر تھا جس پر کبھی مُجھے بے حساب اعتبار ہوا کرتا تھا۔ آج اُسی شہر میں مَیں خود اعتمادی کھو چُکا تھا۔ مُجھے لگتا شہر کے اکثر لوگ میری بے مائگی اور خستہ حالی پر برابر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ باہر سے مَیں انڈر سیکریٹری ٹو گورنمنٹ تھا اندر سے بے اِنتہا احساسِ کمتری کا شِکار تھا۔

انُو اکثر کہا کرتی تھی کہ ہمیں اب اپنے اپنے گھر والوں سے رابطے ہموار کرنے کی کوششیں شروع کر دینی چاہئیں۔ میری ہمّت اِس مُعاملے میں اکثر جواب دے جاتی۔ جذبۂ بغاوت اپنی جگہ مگر کسی نہ کسی سطح پر آدمی کو اپنے معاشرے کے جذباتی اور ماحولیاتی سروکاروں کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اپنے ماحول سے کٹے کٹے ہوئے رہنا کِتنا اذّیت ناک ہے اِس بات کا عملی تجربہ اُن دِنوں ہمیں ہو رہا تھا۔ ہم دونوں بظاہر قائم تھے مگر اندر سے ہل چکے تھے۔

اِس طرح بھٹکو گے در در کِتنا
اور رہ پاؤ گے کٹ کر کِتنا

دیوار و در کھڑے رہے باہر اُسی طرح
اور زلزلہ مکان کے اندر اُتر گیا

خود جلاوطنی کے اندھے شوق میں سوچا نہ تھا

اپنے گھر کو لوٹتے ہم اِس قدر گھبرائیں گے

مُجھے یاد ہے ایک دِن دفتر جاتے وقت انُو نے مُجھ سے کہا تھا کہ مَیں واپسی پر اُس کے لِئے شہر سے کچالُو چاٹ لیتا آؤں۔ شام کے وقت کچالُو چاٹ کا ڈونا ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے مَیں دریائے توی پر بنے ہوئے لکڑی کے پھٹّوں کا پُل پار کر رہا تھا جب ایک پھٹّا پاؤں کے نیچے سے تھوڑا کِھسک گیا۔ مَیں سیدھا دریا میں جا گرا۔ مَیں گلے گلے تک پانی میں ڈُوب گیا۔ صِرف میرا سر اور کچالُو کا ڈونا پانی سے باہر تھا۔ گھر آ کر مَیں نے انُو سے کہا دیکھو تمہارے کچالُو مَیں نے پانی میں نہیں ڈوبنے دِئے۔ خستہ حالی تھی بے مائگی تھی احساسِ کمتری تھا مگر ہماری باہمی محبت ایک ایسی طاقت تھی جس نے ہمیں بکھرنے نہیں دِیا بلکہ ہمیں ایک عجیب قِسم کی رومانی فضا بھی مُسلسل مہیّا کر رکھی تھی۔

حیران خود بھی ہوں کہ یہ میرا کمال ہے

کِن آندھیوں میں جلتا رہا ہے دِیا مِرا

ہمّت بٹور کر ہم نے پہلے انُو کے گھر والوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی پھر میرے گھر والوں سے۔ انُو کی سب سے بڑی بہن اپنے دو بچّوں کے ساتھ کُچھ دِنوں کے لِئے ہمارے پاس محلّہ قلعہ باہُو کے اُس چھوٹے سے مکان میں آ کر رہی۔ اُنہوں نے انُو کو پچّیس رُوپے شگن کے طور پر دِئے۔ پھِر ایک دِن میری بڑی بہن نے انُو کو مبلغ ۴۲ رُوپے شگن میں دِئے۔ اِسی طرح انُو کی ماں جی نے ایک دِن اُسے دس رُوپے شگن میں دِئے لیکن اندر اندر کڑواہٹیں موجود تھیں۔ میری ماں اور میری بڑی بہن بھی ایک بار ہمارے پاس کھانے پر آئے

لیکن اُن کا رویہ کڑواہٹ اور لعن طعن سے پُر تھا۔

انُو کی تیسرے نمبر کی چھوٹی بہن بِٹّو (بیتا) البتہ دِل میں میرے لِئے عزّت اور محبت رکھتی تھی۔ اُسے اِس بات کا احساس تھا کہ مَیں نے اُس کی بہن سے شادی کر کے گویا کوئی اچھا کام کِیا تھا۔ وہ آج بھی مُجھ سے اُسی طرح سے محبت کرتی ہے۔ اُس کی دونوں بیٹیاں بُلبل اور کیوُٹی اور اُس کا خاوند کمل بھی مُجھ سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں۔ میرے اور انُو کے تمام رشتہ داروں میں مُجھے بِٹّو (Bittu) کا کُنبہ سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اُن دِنوں بِٹّو کُچھ دِنوں کے لِئے قلعہ باہوُ میں ہمارے پاس آ کر رہی اور اُس نے کافی حد تک ہماری ڈھارس بندھائی۔

یہ میری پہلی باقاعدہ تقرّری تھی۔ میرے حِصّے میں سرکاری صنعتی کارپوریشنز کا کام آیا تھا۔ اُس محکمے کے سیکریٹری جب بولتے تھے تو آدھی بات اُن کے مُنہ میں ہی رہ جاتی تھی۔ اُردو تو وہ بہُت خراب بولتے تھے۔ انگریزی البتہ اچھّی لکھتے تھے۔ انگریزی میں اُن کا دستخط بھی اچھّا تھا۔ بظاہر وہ میرے ساتھ اچھّا برتاؤ کرتے تھے۔ اکتوبر میں میری تقرّری ہوُئی تھی اور دسمبر کے مہینے میں اُنھوں نے ایک دِن مُجھے اپنے کمرے میں بُلایا اور کہا کہ مُجھے سری نگر میں اُن کی جگہ پر محکمہ کی کُچھ تقرّریوں کے لِئے اُمّید واروں کے Interviews لینے کے لِئے جانا ہے۔ کشمیر کے Divisional Recruitment Board کو ہمارے محکمے کے لِئے کلرکوں اور Store keepers کی کُچھ آسامیوں کے لِئے Interview conduct کرنا تھے۔ میرے پاس حالانکہ کشمیر کی زبردست سردی کے مطابق گرم کپڑے بھی نہیں تھے پھِر بھی مَیں اُن کا حُکم مان کر جنوری اور فروری ۱۹۷۹ء کے دو مہینے بھاری برف باری کے دوران انٹرویوز کنڈکٹ کرتا رہا۔ اُن دِنوں کشمیر کے ڈوِژنل کِمشنر محمد اکبر خان تھے جو

اتفاق سے نسیم لنکر کے والد جناب علی محمد لنکر کے قریبی دوست تھے۔ مَیں جیسے ہی اُن کے دفتر میں داخل ہوُا تو خان صاحب مُجھ سے اِس طرح پیش آئے جیسے وہ مُجھے بہُت پہلے سے جانتے ہوں۔ مَیں حیران و ششدر تھا۔ اُنہوں مجھے بتایا کہ لنکر صاحب نے میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اُن سے میرا خیال، پورا پورا خیال رکھنے کو کہہ رکھا تھا۔ میں ایک مبتدی انڈر سیکریٹری تھا اور محض سیکریٹری انڈسٹریز کی نمائندگی کر رہا تھا لیکن خان صاحب نے اِنٹرویو اور اُمیدواروں کا انتخاب پوری طرح سے مُجھ پر اور ایک اور افسر (جن کا نام شاید مِسٹر ڈار تھا) پر چھوڑ دِیا۔ ایک مہینہ اور بیس دِن مَیں بھرپور برف باری میں زبردست سردی کے موسم میں اُمیدواروں کے انٹرویو لیتا رہا اور روز بروز ہم دونوں (مَیں اور ڈار صاحب) خان صاحب کو اِنٹرویو کے بارے میں رِپورٹ دیتے رہے۔ بعد میں Final Selection بھی خان صاحب نے مُجھ پر اور ڈار صاحب پر چھوڑ دی اور ہمارے کِئے ہوئے اُمیدواروں کے اِنتخاب پر مُہر ثبت کردی۔ مَیں نے اُس اِنٹرویو اور خان صاحب سے بہُت کُچھ سیکھا۔ خان صاحب جلد ہی ریٹائر ہو گئے لیکن اُن کی شکل اُن کی پِدرانہ محبت اور اُن کی Administrative Efficiency آج بھی میرے دِل میں زِندۂ جاوید ہے۔

مُسلسل برف باری کے درمیان اِنٹرویو چل رہا تھا۔ جب چائے کے وقفے کے دَوران ایک دِن اچانک میرے سامنے میرے سائنس کالج کے بارہویں جماعت کے ہم جماعتی مِسٹر وِجے پنڈت نوکری کے اُمیدواروں کی کُرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے اُن کو اَپنے ساتھ چائے پِلائی اور کشمیری کُلچہ بھی کھِلوایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کِسی اُمید وار کی سِفارش کرنے کی غرض سے آئے ہَیں۔

وِجے پنڈت کالج میں نہایت ہی ہونہار طالبِ علم تھے۔ اُن کا ڈاکٹر بننا لگ بھگ طَے سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ مَیں اور میرے جیسے کُچھ دُوسرے دوست میڈیکل سائنس کے مضامین کی پڑھائی میں چاہتے ہوُئے بھی دِلچسپی لینے سے قاصِر تھے۔ کالج کے زمانے میں ہم لوگ اَپنے مُستقبِل کے بارے میں عجیب قِسم کے تذبذب کے شِکار تھے۔ اَپنے اندر کے احساسِ کمتری کو اَپنے شرارتی اور کھِلنڈرانہ حرکتوں کے پردے میں چھُپانے کی ناکام کوششوں میں مصرُوف رہتے تھے۔ افسوس کہ ہماری اِس نفسیاتی اُلجھن کو ہمارے گھر والے ہی سمجھتے تھے نہ ہمارے ڈراونے چہروں والے اساتذہ۔

چائے کے وقفے کے بعد مَیں نے وِجے سے پُوچھا ''آپ کِس اُمید وار کے لِئے آئے ہَیں؟'' وہ بولے، ''مَیں تو خُود اِنٹرویو دینے کے لِئے آیا ہوُں۔ مَیں خُود اُمیدوار ہوُں۔''

ایک ڈیڑھ منٹ کے لِئے میرا بدن سُن ہو گیا۔ حالت سنبھلی تو مَیں نے وِجے سے پُوچھا، ''مگر یہ سب کیسے ہو گیا؟ آپ کا تو ڈاکٹر بننا قریب قریب طَے تھا۔''

اُنہوں نے بتایا کہ بارہویں جماعت کے اِمتحانات شرُوع ہونے سے ایک دِن پہلے اُن کے سرکاری مُلازم والِد وفات پا گئے۔ پھر وہ بارہویں کا اِمتحان کبھی نہ دے سکے اور یہاں وہاں چھوٹے موٹے کام کاج اور پرائیویٹ مُلازمتوں میں غلطاں وہ کِسی نہ کِسی طرح اَپنی سات کُنواری بہنوں کی شادیاں کروانے میں مصرُوف رہے اور اِن دِنوں وہ سری نگر ائیر پورٹ پر ایک پرائیویٹ کینٹین چلا رہے ہیں۔

مُجھے یاد نہیں کہ وِجے پنڈت اُس اِنٹرویو میں نوکری کے لِئے مُنتخب ہو سکے یا نہیں

کیونکہ اُن کی تعلیم صِرف گیارہویں پاس تک کی تھی اور دُوسرے اُمیدواروں میں بے شُمار بی۔اے اور ایم۔اے پاس لڑکیاں لڑکے بھی موجُود تھے۔ ہاں لیکن یہ واقعہ مَیں کبھی نہیں بھلا سکا۔

مَیں نہیں جانتا کہ اِس کی وجہ خان صاحب کا مُجھ سے رفیقانہ روّیہ تھا یا کچھ اور بات مگر اِتنا یاد ہے کہ واپس جموں آکر دفتر Join کرنے کے بعد مُجھے محسُوس ہونے لگا کہ سیکریٹری اِنڈسٹریز مُجھ سے کُچھ اُکھڑے اُکھڑے رہنے لگے ہیں۔ مَیں تو اُن دِنوں اپنی ہی پریشانیوں میں غلطان تھا۔ میرے پاس اُن کے مُجھ سے یوں اُکھڑے اُکھڑے رہنے کی وجہ پوچھنے کی فرصت نہیں تھی۔ مَیں بمشکل گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر پہنچتا تھا۔ میرے پاس کِسی افسر شاہ یا کِسی مِنسٹر کی حاضری دینے یا اُن کے تلوے چاٹنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ اور پھر مُجھے یہ بھی احساس تھا کہ مَیں اپنا کام پوری ایمانداری اور اپنی حتّی الوسع قابلیت کے ساتھ برابر کر رہا ہوں۔ اِس بات کا مُجھے بہُت بعد میں پتہ چلا کہ سرکاری نوکری کرنے کے لِئے ایمانداری اور قابلیت ہی کافی نہیں ہے بلکہ حکمرانوں کے طبقہ کو خوش رکھنا بھی بہُت ضروری ہے ۔مَیں اُس وقت تک یہی سمجھتا تھا کہ ایک سرکاری افسر کے لِئے اُس کی قابلیت اور اُس کی ایمانداری ہی ایک کامیاب افسر بننے کے لِئے کافی ہے۔ یہ بہُت بعد میں معلوم ہُوا کہ مَیں اُن دِنوں کِسی احمقوں کی خیالی دُنیا میں جی رہا تھا۔ لیکن اِس بیچ میں مَیں بہُت نُقصان اُٹھا چُکا تھا۔

مُجھے ابھی تک نِظامیہ کی اندرونی سیاست اور سرکاری مصلحت اندیشیوں کا اندازہ نہ تھا۔ مَیں ہر فائل پر ایک ہی پیمانے کے مطابق بے باک نوٹ لِکھ دیتا۔ مَیں ابھی اِس امر سے واقِف نہ تھا کہ اعلیٰ حکمرانوں کی خواہشات کے مطابق کام ہونا چاہئے بلکہ اعلیٰ حکمرانوں کی

آنکھ کے اِشاروں کو سمجھنا چاہئیے۔ اُنہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہئیے۔ مُجھے یہ غلط فہمی تھی کہ مُجھے غلط یا صحیح کی پہچان کر کے سب فائلوں پر ایک جیسے اِنصاف پر مبنی فیصلے لِکھنے کے لِئے رکھا گیا ہے۔

مُجھے انڈسٹریز ڈیپارٹمنٹ میں ۱۰/۹ مہینے سے زیادہ نہ رہنے دِیا گیا۔ جولائی ۱۹۷۹ء میں میرا تبادلہ محکمہ مال یعنی Revenue Deptt میں کر دِیا گیا۔ اِتفاق سے مِسٹر کدل بجّو جو میری راجوری ٹرینِنگ کے دوران وہاں ڈپٹی کِمشنر تھے تبدیل ہو کر ریوینیو سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ اُس وقت جنرل ڈیپارٹمنٹ کے سیکریٹری مِسٹر صفایا تھے۔ بہُت دیر بعد مُجھے احساس ہُوا کہ جب سیکریٹری اِنڈسٹریز کے اِشارے پر مُجھے محکمہ صنعت سے تبدیل کروا دِیا گیا تو صفایا صاحب نے کدل بجّو صاحب کے ساتھ صلاح مشورہ کر کے ہی مُجھے محکمۂ مال میں بھیجا تھا۔

کدل بجو صاحب کے شفیقانہ رویّے کی بدولت محکمۂ مال میں مَیں نے سوا تین سال تک پوری کامیابی کے ساتھ کام کِیا۔ محکمۂ مال میں جہاں مُجھے میری وکالت کی پڑھائی نے بہُت مدد کی وہیں اُس محکمہ میں میرے مضبوط Adminstrative Career کی بنیاد بھی پڑی۔ راجوری میں میری ٹرینِنگ کے دوران ہی کدل بجو صاحب کو (شاید) میری قابلیت پر بھروسہ ہو چُکا تھا۔ کدل بجوُ (سیکریٹری) صاحب کے عِلاوہ محکمۂ مال میں اُس وقت ایک ڈپٹی سیکریٹری ورما صاحب اور ایک ایڈیشنل سیکریٹری (جناب راجکمار گپتا) بھی تھے۔ لیکن مُجھے اپنے کام میں پوری آزادی تھی۔ مُجھے یاد ہے اُن دِنوں راجکمار گپتا صاحب کو اپنے بیٹے کو سری نگر کے انجینیرنگ کالج میں داخلہ دِلوانے کے لِئے کالج کے پرنسپل سے مِلنے جانا تھا

۔ وہ مجھے ساتھ لے گئے ، یہ اُن کی محبت تھی ورنہ میری اُس وقت کیا اوقات تھی جو مَیں اِس سِلسلے میں کِسی کام آ سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ دل بجوؔ صاحب اور راجکمار گپتا صاحب جیسے افسر جہاں بھی رہے ہونگے اُنہوں نے اپنے ماتحت افسروں اور دوسرے ملازمین کی حوصلہ افزائی ہی کی ہوگی۔ حوصلہ افزائی سے کم قابلیت والے ملازم بھی قابلیت کی راہ پر آ جاتے ہیں جب کہ دِلشکنی اور تفرقہ آمیزی سے قابل سے قابل افسروں کی اہلیت بھی جواب دے جاتی ہے۔

مُجھے یاد ہے کہ ایک بار اُس وقت کے وزیرِ مال (Revenue Minister) نے مُجھے ایک فائل کے سِلسلے میں اپنے کمرے میں بُلا کر ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی کوشش کی اور مُجھ سے کہا کہ آپ اِس case کی support اِس لِئے نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کو اِس میں پیسہ نہیں مِلا؟ مَیں اُس وقت تک کِسی قِسم کی رِشوت بالکل قبُول نہیں کرتا تھا۔ مَیں نے وزیرِ مال کو کرارا جواب دِیا۔ مَیں نے اُس سے کہا "مَیں پیسہ نہیں لیتا"۔ وہ لاجواب اور خاموش ہوگیا۔ بعد میں کدل بجو صاحب نے مُجھے اپنے کمرے میں بُلایا اچھی سی چائے پِلائی (شاید کشمیری قہوہ) اور پھِر بڑے پیار سے کہا "کیا ضرُوری ہے کہ ہم اپنی وکالت کی ساری پڑھائی اِنہی فائلوں میں انڈیل دیں؟ کدل بجوؔ صاحب کی بات میں ایک برادرانہ محبت بھی پوشیدہ تھی۔ مَیں نے کہا "سر مَیں آئیندہ خیال رکھوں گا"۔

محکمۂ مال میں میری نوکری کے دوران ہی مَیں نے اپنا پہلا شِعری مجموعہ "پیش خیمہ" شائع کروایا۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے پیش خیمہ کے لِئے ایک پُر مغز دیباچہ تحریر فرمایا تھا۔ بے شک اُس وقت تک مَیں شاعری کے میدان میں ترقی کی کافی منزلیں طے کر چُکا تھا۔ سری نگر دوُردرشن، ریڈیو کشمیر سری نگر اور جموں ریڈیو کے آل انڈیا مشاعروں میں میرا

شامِل ہونا ناگزیر ہو چکا تھا۔ ''شب خون''، ''شاعر''، ''الفاظ'' علی گڑھ اور (کمار پاشی کے جریدے) ''سطوُر'' دہلی وغیرہ میں میری تخلیقات خوب چھپ رہی تھیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ جموں و کشمیر کے کئی ادبی نیم ادبی ذوق رکھنے والے لوگ جو مُجھے اچھّی طرح جانتے تھے، ریڈیو، دوردرشن اور باہر کے ادبی رسائل اور جرائد میں میری شموُلیت کی وجہ سے ہی میری دوبارہ شناخت (Rediscovery) کررہے تھے ایسے کُچھ لوگ تو میری افسری کی وجہ سے بھی میری چمچہ گیری کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور کُچھ لوگ ریڈیو، دوردرشن اور باہر کے رسائل و جرائید میں میری مسلسل شمولیت کی وجہ سے مُجھے معتبر سمجھنے لگے تھے۔ اُس زمانے میں جموں میں تیسرے اور چوتھے درجے کے کُچھ شعراوادبا نے جو اپنے آپ کو بڑے سینئیر اور کُہنہ مشق سمجھتے تھے مُجھ سے حسد کرنا بھی شروع کر دِیا تھا۔ یہ حسد آج تک جاری ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ اِس حسد سے مُجھے نُقصان کم فائدہ زیادہ ہوُا۔

اپریل ۱۹۸۰ء میں ''پیش خیمہ'' کا اجرا جموں کے گاندی بھون میں ہوُا (جو سِول سیکریٹیریٹ سے سٹا ہوُا ہے)۔ جناب جگن ناتھ آزاد کی کِسی کِتاب اور پیش خیمہ کو اگلے برس ریاستی کلچرل اکیڈمی کا Best Book Award مشترکہ طور پہ مِلا تھا۔ میرے لِئے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔ آزاد صاحب اُن دِنوں آسمانِ ادب کے ایک درخشاں ستارے تھے اور مَیں میدانِ شِعر کا ایک مبتدی تھا۔ حالانکہ تیسرے اور چوتھے درجے کے شعراء واُدبا، جن کے نام درج کر کے مَیں اُنہیں شہرت نہیں دِلوانا چاہتا، نے یہ بات بھی خوب پھیلائی کہ بیتاب کو آدھا ایوارڈ مِلا ہے۔ پیش خیمہ کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ مُجھے یاد ہے پاکستان میں وزیرِ آغا کے جریدے ''اوراق'' میں انور سدید (پاکستان کے مشہور نقاد و شاعر) نے بھی پیش خیمہ پر تبصرہ کِیا تھا۔ بعد میں انور سدید نے میری شاعری سے مُتعلق ایک مُفصّل

مضموُن بھی لِکھا۔

وہ میری زِندگی کی کامیابیوں اور پریشانیوں کا مِلا جُلا ایک عجیب وغریب قِسم کا دَور تھا۔

اب میرے اور انُو کے گھر والوں سے کبھی کبھار مُلاقاتیں ہورہی تھیں۔ انُو کے گھر میں بھی ہمارا آنا جانا شروع ہو چُکا تھا۔ حالانکہ ابھی تک مُجھے وہاں پوری طرح سے عِزّت نہیں مِل سکی تھی۔ انُو کے بڑے بھائی یوگیش صحرائی کیونکہ میرے (رنبیر سکوُل کے) ہم جماعتی بھی رہ چُکے تھے اور شاعری کا شوق بھی رکھتے تھے اس لِئے وہ ہمارے ساتھ مصلحت اندیشانہ سلوُک روا رکھتے۔ اِسی بیچ انُو کی والدہ کا کِسی بیماری کے بعد اِنتقال ہو گیا۔ ہمیں اُن کے گھر آنے جانے کا ایک اور راستہ مِل گیا۔ گھر میں جو فرد ہماری بھرپور حمایت میں تھا وہ انُو کی تیسرے نمبر کی چھوٹی بہن بٹّو (ببیتا) تھی جو اُن دِنوں گیارویں- بارہویں جماعت میں پڑھتی تھی اور ایجوکیشن ہندی وغیرہ مضامین میں مُجھ سے Tuition لِیا کرتی تھی۔ بٹّو کو شاید یہ احساس ہو چُکا تھا کہ اُس کے گھر والے ہمارے ساتھ نا اِنصافی کر رہے ہیں۔ اُس کے اِس روّیے کی وجہ سے اُسے اپنے گھر میں براہ راست اور پوشیدہ انداز میں کئی قِسم کی پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ بٹّو کی اُس زمانے میں کی ہوئی ہماری حمایت نے اُسے میری زِندگی میں ہمیشہ کے لِئے ایک محترم مقام پر فائز کر دِیا۔ وہ اپنی ایم۔اے کی پڑھائی تک مُجھ سے Tuition لیتی رہی۔ اُس کے بعد اُس کی شادی ہو گئی۔ میری انڈر سیکریٹری Colleague نسیم (لنگر) کے بعد بٹّو وہ دوُسری لڑکی تھی جِس نے اُس تذبذب پریشانی اور نا اعتباری کے زمانے میں ہمارا زبردست ساتھ دیا تھا۔

مُجھ سے چھوٹے تینوں بہن بھائیوں کی شادیاں اُسی زمانے میں ہوئیں۔ ہر شادی میں مُجھ پر شرط عاید کی جاتی تھی کہ اگر مَیں انو کے بغیر آنا چاہوں تو شادی میں شامل ہو سکتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط مُجھے ہرگز منظوُر نہ تھی۔ ہمارے سب سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ایس پی سنگھ کی بارات میرے گھر کے سامنے سے ہو کر گزری۔ میرے کئی پڑوسیوں نے مُجھ سے پوچھا کہ مَیں شادی میں کیوں نہیں شامل ہوُا؟ مَیں کیا جواب دیتا۔ ہر طرف سے پریشانی دباؤ اور تناؤ کا شِکار مَیں اندر ہی اندر گھُٹنے کے عِلاوہ کُچھ نہ کر سکا۔

میرے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیوں کے بعد جو بھی رِشتہ دار میرے پاس آتا وہ کہتا، ''او جی! مَیں نے بہُت سمجھایا آپ کے گھر والوں کو کہ بیتاب کو بھی شادی میں بُلوالیکن وہ مانے ہی نہیں'' ایک بات جو ہر آدمی کہتا وہ یہ ہوتی کہ اِن شادیوں میں میری شمولیت کی سب سے زیادہ مخالفت ڈاکٹر گورچرن سنگھ (امریکہ سے آئے ہوُے بڑے بھائی صاحب) نے کی ہے۔

اُس وقت تک ریڈیو ٹی وی کے پروگراموں اور سرکاری، نیم سرکاری رسائل و جرائد میں میری تخلیقات کی اشاعت کی وجہ سے بھی ہماری آمدن میں تھوڑا بہُت اضافہ ہونے لگا تھا۔ زیادہ تو نہیں مگر تھوڑی تھوڑی مالی حالت سُدھرنے لگ پڑی تھی۔ میدانِ شعروادب میں میری شہرت بھی دِن دوگنی، رات چوگُنی ہو رہی تھی۔ یاسیتِ ابھی مکمّل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی لیکن میری دُعائیں اُمّید افزا تھیں۔

اگر ہوں راستے پر مطمئن کر
اگر بے سمت ہوں راہِ سفر دے

مَیں مستقبل میں جینا چاہتا ہوں

گرفتِ حال اگر آزاد کر دے

نہ دے اُونچائی میرے قد کو بے شک

مِری ہر شاخ کو لیکن ثمر دے

محکمۂ مال کی میری سوا تین سال کی نوکری نے مُجھے ایسا تجربہ عطا کیا کہ اُس کے بعد مَیں نے کبھی کِسی محکمے میں مار نہیں کھائی۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں میرا تبادلہ محکمہ صحت میں کر دِیا گیا۔ تین مہینے تک اُس محکمے میں سیکریٹری صاحب کے پاس میرے عِلاوہ کوئی دُوسرا افسر نہیں تھا۔ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ، میڈیکل ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ اور فیملی ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ یعنی تینوں محکمے مَیں تنِ تنہا چلاتا رہا۔ اُس وقت ہمارے سیکریٹری مِسٹر احمد تھے جو پہلے شیخ محمد عبداللہ کے پرائیویٹ سیکریٹری رہ چکے تھے اور سیکریٹری اِنڈسٹریز کے قریبی دوست تھے۔ تین مہینے بعد دو اور افسر (ایک ڈپٹی سیکریٹری اور ایک انڈر سیکریٹری) ہمارے محکمے میں تبدیل ہو کر آئے۔ ہیلتھ اور میڈیکل ایجوکیشن محکمے اُن دونوں کو دے دئے گئے اور میرے حِصّے میں فیملی ویلفیئر اور آیورویدک/یونانی کے محکمے رہ گئے۔

پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے عہدِ حکومت میں جموں کی جاگیر راجہ گلاب سِنگھ ڈوگرہ کو دے رکھی تھی۔ اور پونچھ کی علیٰحدہ جاگیر گُلاب سِنگھ کے بھائی دھیان سِنگھ ڈوگرہ کو دے رکھی تھی۔ دھیان سِنگھ ڈوگرہ جو بنیادی طور پر جموں سے تعلق رکھتا تھا مہاراجہ رنجیت سِنگھ کا ایک دربان تھا جو اپنی قابلیت، سیاسی اہلیت اور مصلحت اندیشیوں کی بدولت لاہور دربار میں وزیرِ اعظم کے عہدے تک پہُنچ گیا تھا۔ اِسی طرح گلاب سِنگھ ڈوگرہ اپنی بہادری،

قابلیت اور اپنے بھائی کی مدد سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ایک جرنیل تک کے عہدے پر پہُنچ گیا۔ لاہور دربار جموں پر راجہ گلاب سنگھ کی وساطت سے راج کرتا تھا جبکہ پونچھ پر راجہ دھیان سنگھ کی وساطت سے، کشمیر کے علاقے پر لاہور دربار براہِ راست حکومت کرتا تھا۔ لدّاخ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجوں نے راجہ گلاب سنگھ اور جنرل زور آور سنگھ کی کمان میں جیت کر لاہور دربار کی حکوٗمت میں شامل کر لیا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اِنتقال کے بعد ۱۸۴۵ء سے ۱۸۴۹ء تک انگریز حکومت پنجاب پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتی رہی اور بالآخر ۱۸۴۹ء میں سِکھ فوج اپنوں کی غداریوں اور انگریزوں کی بہُت بڑی فوج اور چالبازیوں کی بدولت پوری طرح سے پست ہوگئی۔ انگریز کے پنجاب پر پوری طرح قابض ہوتے ہی گُلاب سنگھ نے پوری کی پوری جموں و کشمیر کی ریاست ۷۵ لاکھ نانک شاہی روٗپے کا ہرجانہ دے کر واپس حاصل کر لی۔ یہ ۷۵ لاکھ روپے ایک خیال کے مطابق لاہور دربار سے لوٗٹے ہوئے خزانے کے اُس حِصّے کا ایک حِصہ تھے جسے راجہ گُلاب سنگھ کے وفادار سپاہی مہارانی چند کوراں کو جموں لاتے ہوئے ساتھ لے آئے تھے۔ دھیان سنگھ جو اُس وقت تک وزیرِ اعظم تھا مخالف گروٗپ کے ذریعے مارا جا چکا تھا۔ مخالف گروٗپ کا اِلزام تھا کہ دھیان سنگھ گُلاب سنگھ بھائیوں نے لاہور دربار کے ساتھ غدّاری کرتے ہوئے انگریز کا ساتھ دِیا ہے۔ پنجاب کے کئی دانشور (خاص طور سے تواریخ دان) آج بھی دھیان سنگھ گلاب سنگھ بھائیوں کو لاہور دربار کے غدّاروں کے طور پر جانتے ہیں۔

اِس طرح راجہ گُلاب سنگھ ۱۸۴۹ء میں جموں و کشمیر کا مہاراجہ بن گیا حالانکہ پونچھ کی ریاست پر ابھی تک دھیان سنگھ کی اولاد قابض تھی۔ دھیان سنگھ کی اولادیں ۱۹۴۷ء تک

مہاراجہ گُلاب سِنگھ کی اولادوں کے ساتھ ریاست پونچھ کی جموں و کشمیر سے علیٰحدہ اور آزاد (Sovereign) حیثیت کے لِئے برسرِ پیکار رہیں۔

مہاراجہ گُلاب سِنگھ اور اُس کی اولادوں کے ۹۸ سال کے عہدِ حکوُمت کے دوران صوبہ کشمیر پر جموں کے ڈوگروں نے حکومت کی۔ اِس دَور میں ڈوگروں (خاص طور سے راجپُوت ڈوگروں) کو راجے کہا جاتا تھا اور باقی عوام کو پرجا۔ کشمیر میں (اور ریاست پونچھ میں بھی) تو صِرف راجپُوت ڈوگرے ہی نہیں بلکہ تمام تر غیر مسلم (خاص طور سے ہندو اور سِکھ) اپنے آپ کو راجے یعنی حکومتی طبقہ سے منسوب تصوّر کرتے تھے۔ یہ لوگ صِرف خود کو راجے تصوّر ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی پرجا (یعنی مسلمانوں) پر حتی الوسع ہر قِسم کے ظلم وسِتم بھی روا رکھتے تھے۔

میرے والد نے بچپن میں مُجھے بتایا تھا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے پونچھ کے راجے نے جب سب سے پہلے موٹر کار خرید کر پونچھ میں لائی تو شہر سے باہر کے عِلاقوں میں پکّی سڑکیں نہیں تھیں۔ کچّے راستوں تک تو کار چلی جاتی لیکن جہاں جنگل میں یا پہاڑوں میں کچّے راستے بھی جواب دے جاتے راجہ صاحب کے اہل کار راہ چلتے ہوئے چار پانچ علاقائی باشِندوں کو جو اکثر و بیشتر مسلمان ہی ہوتے پکڑ لیتے اور اُنہیں چاروں پہیّوں کی جگہ اپنے کندھے دے کر کار کو آگے لے جانے پر مجبور کرتے۔ اُس زمانے میں اِس بے معاوضہ کارِ سرکار کو بے گار کہا جاتا تھا اور ہاں بے گار اکثر مُسلمانوں سے ہی لی جاتی تھی۔

اِسی قِسم کے ظلم وسِتم کی ردّ میں بلکہ اِس کے خلاف ۱۹۳۱ء میں کشمیر میں ڈوگرہ مہاراجہ ہری سِنگھ کے خِلاف روٹی ایجیٹیشن شیخ محمد عبداللہ کی سرکردگی میں چلائی گئی جِس کے

دَوران ۱۳۱ کشمیری شہید ہو گئے۔ یہ اَیجیٹیشن تو کشمیر میں چلی لیکن کشمیر سے دُور پونچھ کے دُور دراز مُسلم اکثریتی عِلاقوں میں اِس کا اِتنا بُرا اثر ہُوا کہ ہند وسِکھ لوگ اُن عِلاقوں سے ہجرت کر کے پونچھ شہر اور کُچھ دُوسری جگہوں میں آ بسے تھے۔ ایسے ہزاروں کنبوں کی ہجرت کِسی کھاتے میں درج نہیں ہو سکی۔

شیخ محمد عبداللہ کے ۱۹۴۷ء کے بعد ایوانِ حکوُمت سنبھالنے کے عمل کو جموں کے کُچھ لوگ برداشت نہ کر سکے اور جموں میں ۵۳-۱۹۵۲ء تک پرجا پرِشد کی سرکردگی میں حکوُمت مخالف ایجیٹیشن چلتی رہی۔ (جب تک شیخ محمد عبداللہ کِسی سیاسی سازِش کے تحت گرفتار نہ ہو گئے)۔

۱۹۴۷ء میں کشمیر کے کچھ لوگ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں تھے۔ یہ شیخ محمد عبداللہ کی حکمتِ عملی تھی کہ کشمیریوں نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی مخالفت نہ کی سِوائے اُن عِلاقوں کے جہاں پاکستان کی فوج کا قبضہ ہو چُکا تھا اور جِن عِلاقوں کو (وہاں) نام نہاد آزاد کشمیر کہا جاتا ہے۔ اِس کے باوجود شیخ محمد عبداللہ کو پنڈت جواہر لعل نہرو کے عہدِ حکوُمت ہی میں گرفتار کر لیا گیا تو اُن کے حمایتیوں میں ہندوستان کے لِئے ایک خاص قِسم کی کڑواہٹ پیدا ہو گئی اور محاذ رائے شُماری کے نام پر اُن لوگوں نے مسلۂ کشمیر کا الاؤ بُجھنے نہیں دِیا۔ پاکستان کے حمایتی عناصِر بھی ابھی تک کشمیر میں موجود تھے۔

تواریخ و سیاست کے اِن بڑے بڑے معاملات کا اثر مُجھ جیسے کئی کئی چھوٹے سرکاری ملازمین پر بے طرح پڑ رہا تھا۔ جموں کے ہِندو طبقہ کے لوگ تو صوبہ جموں میں اپنی اکثریت کے سہارے اپنے لِئے حکومتی معاملات میں کچھ نہ کُچھ حقوق حاصِل کر ہی لیتے ہیں

(حالانکہ یہ حقوق بھی بتدریج کم سے کمتر ہوتے جارہے ہیں) لیکن سِکھ، عیسائی، بودھ یا جین ملازمین کا تو خُدا ہی حافظ ہے۔

تواریخ کا اِرتقا بالآخر اِنسانی اِرتقا اور کائناتی اِرتقا کی صورت میں نمو پذیر ہوتا ہے۔

مُجھے یاد ہے ایک بڑے سینئیر سِکھ آئی اے ایس افسر کو ریاست میں کبھی کِسی اچھّی پوسٹ پر قائم رہنے کا کامیاب موقع نہیں مِلا اور اُن کی زیادہ تر نوکری دہلی میں ریاستی ریزیڈینٹ کمِشنر کے طور پر ہی تمام ہوگئی۔ اِسی طرح ایک بڑے سینئیر آئی پی ایس افسر ہمیشہ ڈائریکٹر یوتھ ویلفئیر اور اے ڈی جی پرِسنز (Jails) وغیرہ جیسی غیر اہم پوسٹوں پر فائز کِئے جاتے رہے۔ جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو وہ ہاتھ پاؤں مار کر اپنی آبائی ریاست پنجاب چلے گئے اور وہاں ڈائریکٹر جنرل پولیس کے عہدے پر بڑی کامیابی اور پُر اعتماد لہجے میں کام کرتے ہیں۔ مُجھے خود اپنی بات یاد ہے جب ایک گورنمنٹ آرڈر کے تحت مُجھے اودھم پور میں ایڈیشنل ڈِپٹی کمِشنر لگایا گیا تو اُسی آرڈر میں مُجھ سے بہُت جونئیر افسروں کو ڈِپٹی کمِشنر کے عہدوں پر فائز کر دِیا گیا تھا۔ یعنی مَیں ایڈیشنل ڈِپٹی کمِشنر کے لِئے تو قابل تھا مگر ڈِپٹی کمِشنر کے لِئے نہیں۔ دونوں کا کام ایک ہی ہوتا ہے صِرف عہدے میں ڈِپٹی کمِشنر بڑا ہوتا ہے۔

ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے سیکریٹری احمد صاحب جلد ہی وہاں سے تبدیل ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے لِئے شاہ صاحب نام کے سیکریٹری وہاں رہے لیکن وہ بھی دو تین مہینے بعد وہاں سے تبدیل کر دِئے گئے۔ بعد میں کے بی پلّے نام کے باہر سے آئے ہوئے ایک سینئیر آئی اے ایس افسر ہیلتھ سیکریٹری بن کر آئے۔ اُنہوں نے خصوصیت سے دو کام میرے سُپرد کِئے۔

(۱) آیورویدا اور یونانی طریقۂ علاج پر مشتمل ایک علحدہ I.S.M Deptt

(انڈین سسٹم آف میڈیسن ڈیپارٹمنٹ) کا قیام اور (۲) دانتوں کے ڈاکٹروں کے لئے دُوسرے ڈاکٹروں کے برابر تنخواہ کے scales قائم کرنا۔

پلّے صاحب نے مُجھ پہ جو بھروسہ کیا اُس کی بدولت آج ریاست میں ایک علٰیحدہ I.S.M کا محکمہ قائم ہے اور Dental Surgeons کو بھی دوسرے ڈاکٹروں کے برابر Pay Scales مِل رہے ہیں۔ پلّے صاحب شکل صورت سے بڑے آڑے ٹیڑھے آدمی دِکھائی دیتے تھے لیکن کام اور برتاؤ میں بہُت بھلے، غیر جانبدار اور قابل قسم کے افسر تھے۔

ہیلتھ محکمے میں میری نوکری کا زمانہ بھی میری زندگی کا ایک خوش نما دور تھا کیونکہ اُس زمانے میں پہلی بار ہم نے Pay Revision کا مزہ چکھا۔ ہماری تنخواہوں میں اچھا خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔

خوشیاں دھیرے دھیرے میری زندگی میں داخل ہونا شروع ہو رہی تھیں کہ ایک دِن مجھے اپنی کُرسی پر بیٹھے ہوئے جنرل ڈیپارٹمنٹ کا ایک بند لفافہ مِلا۔ لفافہ کھولنے پر معلوم ہوُا کہ اِنڈسٹریز سیکریٹری کا لِکھا ہوُا میری زندگی کا پہلا A.P.R (خُفیہ رپورٹ) مجھے جواب دہی کے لِئے بھیجا گیا ہے۔ سیکریٹری اِنڈسٹریز نے میرے career کو تباہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھ چھوڑی تھی۔ اُس نے مُجھے پرلے درجے کا نالائق اور Below the job Requirement افسر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ مَیں نے بھی جواباً جو کُچھ مُجھے سُجھائی دِیا لِکھا لیکن دِل میں حیرانی ہو رہی تھی کہ کیا واقعی کوئی سینئیر افسر کِسی مبتدی افسر کا career اِس بے دردی سے تباہ کرنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔

☆☆☆

باب-۷

سیکریٹری اِنڈسٹریز کی نقصان دہ رِپورٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور ریوِنیو ڈیپارٹمنٹ (محکمہ مال) اور ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں میری قابلِ قدر کارکردگی کو دیکھتے ہوئے گورنمنٹ نے مُجھے میرے دُوسرے انڈر سیکریٹری ساتھیوں کے ساتھ ستمبر ۱۹۸۴ء میں ڈِپٹی سیکریٹری کے عہدے پر ترقی دے کر تعینات کر دِیا۔ میری تقررّی ڈِپٹی سیکریٹری پی۔ ایچ۔ ای (Public Health Engineering) یعنی Water Supplies اور فلڈ کنٹرول کے محکمے میں ہُوئی تھی۔ اِس ترقّی سے بھی میری تنخواہ میں کُچھ اِضافہ ہُوا یعنی مالی حالت میں تھوڑا اور سُدھار ہو گیا۔

اُس زمانے میں یعنی بیسویں صدی کی نویں دہائی میں پنجاب میں سِکھ انتہا پسندی زوروں پر تھی۔ جموں میں بھی اُس کے اثرات دیکھنے میں آ رہے تھے۔ جموں کے کئی سِکھ نوجوان بڑھ چڑھ کر خالِصتانی نوجوانوں کی حمایت کر رہے تھے جب کہ جموں کے اکثر ہندو لوگ عام سِکھوں کو اُگروادی (دہشت گرد) کے نام سے یاد کرتے تھے۔

ستمبر ۱۹۸۴ء میں میری ڈِپٹی سیکریٹری کے طور پر ترقّی ہُوئی تھی۔ اکتوبر کے آخری دِنوں میں ہم لوگ دربار مُوو کے ساتھ سری نگر سے جمّوں آ گئے۔ گاندھی نگر میں ہماری سرکاری رہائش گاہ کی صاف صفائی درکار تھی۔ اِس لِئے دو چار دِن ہم اَنُو کے مائکے میں ہی رُک گئے۔

۲۸/۲۹ اکتوبر کو ہم گاندھی نگر اپنی سرکاری رہائش گاہ میں چلے آئے۔ ۳۱ اکتوبر کو

اُس وقت کی ہندوستان کی وزیرِ اعظم شریمتی اِندرا گاندھی کا قتل اُن کے دو سِکھ محافظوں نے کر دِیا۔ دہلی کی طرح جموں میں بھی ہندو لوگ سِکھوں کے خِلاف بھڑک اُٹھے۔ انُو کے مائکے میں کُچھ لوگوں نے گھر کے باہر آ کر نعرے لگانے شروع کر دِیئے، ''سِکھوں کو باہر نِکالو''

''اُگرو ادیوں کو باہر نِکالو''

''اِندرا گاندھی کے قاتلوں کو باہر نِکالو''

انُو کے بہن بھائیوں نے فسادیوں کو بہُت سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ لوگ گاندھی نگر اپنے گھر جا چُکے ہیں لیکن وہ لوگ نہ مانے اور کافی دِنوں تک میرے سسُرال والوں کے گھر پر سنگ وخشت کی بارش ہوتی رہی۔

جموں و کشمیر کے اُس وقت کے وزیر اعلیٰ غُلام محمد شاہ نے ایک اچھا کام کِیا جو جموں میں کُچھ دِنوں کے لِئے کرفیو لگا دِیا۔جس کی وجہ سے جموں شہر میں دہلی کی طرز پر سِکھوں کا قتلِ عام نہ ہو سکا۔ آس پڑوس کی کُچھ فِرقہ پرست ہندُو عورتوں نے انُو کو میرے اور سِکھوں کے خِلاف ورغلانے کی بہت کوشش بھی کی لیکن انُو پر اِن باتوں کا کوئی اثر نہ ہوُا۔ میرے سسُرال والوں نے بھی اُس نازک زمانے میں میرا پورا ساتھ دِیا بلکہ یوگیش نے دو ایک بار کرفیو کے باوجود ہمارے گھر کِسی نہ کِسی طرح کھانے پینے کا سامان بھی پہنچایا۔ ہماری مالی پریشانیاں بے شک کم ہو رہی تھیں لیکن سماجی پریشانیاں تھمنے میں نہیں آ رہی تھیں۔

پی ایچ ای اور اِریگیشن ڈیپارٹمنٹ کے سیکریٹری نِظام اُلدین صاحب تھے جو چیف انجنیئر کے عہدے سے جموّں کشمیر سیکریٹیریٹ میں لائے گئے تھے۔ اُن کی طبیعت تھوڑی خراب رہتی تھی۔ کھانسی زکام وغیرہ کے شِکار رہتے تھے لیکن بڑے ایماندار افسر تھے۔ اگر

اوقاتِ دفتر میں نماز ادا کرنے جاتے تو دفتر کے اوقات کے بعد اُتنا وقت دفتر میں بیٹھ کر کام کرتے۔ ورنہ تو جمّوں کشمیر کے کئی کئی ملازمین نمازِ ظُہر اور نمازِ مغرب کے بہانے سرکاری کام کا اکثر کباڑا کرتے ہیں۔ جُمعے کے دِن تو کئی ملازمین اجتماعی نمازِ جُمعہ کے بعد گھر میں کام کے بہانے واپس ہی نہیں آتے۔ مُجھے یاد ہے جب مَیں انڈر سیکریٹری تھا اُس وقت کے ایڈیشنل چیف سیکریٹری مفتی محمد مقبول نے کِسی چپراسی کو مُجھے بُلوانے کے لِئے بھیجا۔ اُس چپراسی نے کمرے میں آ کر پوچھا بیتاؔب صاحب کہاں ہیں؟ کِسی نے شرارتاً کہہ دِیا وہ نماز پڑھنے گئے ہیں۔ اُس نے واپس جا کر مفتی صاحب سے کہہ دِیا "صاحب! بیتاؔب صاحب نماز پڑھنے گئے ہیں۔" بعد میں مَیں اُن کے پاس گیا تو اُنہیں مُجھے دیکھ کر حیرانی ہُوئی اور وہ بولے، "بیتاؔب صاحب آپ ہیں؟ مُجھے تو کِسی نے بتایا تھا کہ بیتاؔب صاحب نماز پڑھنے گئے ہیں۔ مَیں نے سوچا کوئی مسلمان ہونگے۔" کہنے کا مطلب یہ کہ جب کوئی ملازم اپنی کُرسی پہ نہ پایا جائے تو اکثر کہا جاتا تھا کہ وہ نماز پڑھنے گیا ہے۔

۱۹۸۴ء بے شک میرے لِئے نوکری میں پروموشن کا سال تھا مگر آپریشن بلیو سٹار کے تحت ہندوستانی فوج کے گولڈن ٹیمپل پر حملے اور اندرا گاندھی کے قتل وغیرہ جیسے واقعات کی وجہ سے سِکھوں پر پورے مُلک میں بُرا وقت تھا۔ کشمیر میں اِنتہا پسند مسلم نوجوان البتہ سِکھوں کے لِئے ہمدردانہ رویّہ رکھنے لگے تھے۔ اُن دِنوں یہ چہ میگوئیاں عام تھیں کہ پاکستان میں کشمیری اور خالصتانی انتہا پسند اِکٹھے ٹریننگ لیتے ہیں۔ کشمیری مُسلم نوجوانوں کے ہتھیار بند ہونے کے ابھی کوئی ثبوت بظاہر نہیں مِل رہے تھے لیکن سِکھ اِنتہا پسندوں کے لِئے فضا کشمیر میں خاصی سازگار دِکھائی دیتی تھی۔ کشمیر کے اکثر نام نہاد مُسلم دانش ور بالواسطہ و بلاواسطہ پنجاب کی خالصتانی تحریک کی حمایت کرتے نہیں تھکتے تھے بلکہ آگ

میں گھی ڈالنے کا کام کرتے تھے۔

کشمیر کا پنڈت طبقہ اب پریشانی کے عالم میں تھا۔ مُجھے یاد ہے اُن دِنوں ایک کشمیری پنڈت کلرک نے مُجھے بتایا تھا کہ مُسلمانوں نے کشمیر میں پنڈتوں کے گھروں پر نشان لگا رکھّے ہیں اور پنڈت لوگ اب اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے ہیں۔ مَیں نے اِس سب کو کوری بکواس مان کر سُنی ان سُنی کر دِیا تھا۔

اُس زمانے میں کشمیر کے اکثر مُسلمانوں کو کشمیری پنڈتوں سے یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ بھارت سرکار کے محکموں میں، قومی بینکوں اور دُوسرے بھارتی سرکاری نیم سرکاری اداروں میں مُسلمانوں کے لِئے طرح طرح کی رُکاوٹیں کھڑی کر کے اُن کی بھرتی کا راستہ مسدُود کر دیتے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُن دِنوں تک کشمیر میں بھارت سرکار کے محکموں، قومی بینکوں اور دُوسرے اداروں میں یا تو کشمیری پنڈت نظر آتے تھے یا پھِر باہر سے آئے ہوئے ملازمین۔ کشمیری مُسلمان تو اِن اداروں میں کم کم ہی مِلتا تھا۔ ایک عجیب قِسم کا باہمی بے اعتمادی کا ماحول پیدا ہو چُکا تھا کشمیری پنڈتوں اور مُسلمانوں کے بیچ۔

سِتمبر ۱۹۸۴ء سے جولائی ۱۹۸۶ء تک میری نوکری PHE & Irrigation محکمے میں بہ طریقِ احسن چل رہی تھی۔ لیکن کشمیر کے سیاسی و سماجی حالات بہُت متذبذب تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کی وفات کے بعد ہند مخالف، پاکستان حمایتی اور نام نہاد آزادی کے حمایتی عناصر گویا مضبوط ہو رہے تھے۔ فاروق عبداللہ جو شیخ محمد عبداللہ کے بڑے بیٹے ہونے کے ناتے چیف مِنسٹر بن گئے تھے۔ اپنے بہنوئی غُلام محمد شاہ کی مخالفت کا سامنا کر رہے تھے۔ اِسی اثنا میں ایک دِن شاہ صاحب نے فاروق عبداللہ کے کُچھ اسمبلی ارکان (members) کو

گورنر کے سامنے پیش کر دِیا اور خود چیف مِنسٹر بن گئے۔

یہی وہ زمانہ تھا (شاید جون جولائی ۱۹۸۶ء) جب ایک دِن مَیں اور انوسری نگر کے کافی ہاؤس کی بالکونی میں بیٹھے کافی کی چُسکیاں لے رہے تھے جب کہ کافی ہاؤس کے باتھ رُوم میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سُنائی دی۔ کئی لوگ دوڑ کر اندر گئے تو معلوم ہؤا کہ یہ ایک مدھم قِسم کا بم دھماکہ تھا جِس سے باتھ روم کے واش بیسن (Wash Basin) اور انگریزی Toilet میں درار آ گئی تھی۔ وہ کشمیر کی اِنتہا پسندی کی تاریخ کا پہلا بم دھماکہ تھا۔ کافی ہاؤس میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ اب آگے اور بھی اَیسے دھماکے ہونے والے ہیں۔

کشمیر میں سیکریٹریٹ اور دُوسرے محکموں میں کام کرنے والے جموں کے اکثر مُلازمین کافی پریشان تھے اور حتی الوسع کوشش کر کے جموں صوبہ میں مُستقِل تعیناتیاں چاہتے تھے۔ ہم لوگ ابھی تک خانہ بدوشوں کی سی زِندگی گزار رہے تھے لیکن اب دِل میں یہ خیال گھر کرنے لگا تھا کہ جموں میں کہیں سر چھُپانے کے لِئے اپنا کوئی آشیانہ تعمیر کِیا جائے۔ مُجھے بہُت زیادہ کوشش نہ کرنی پڑی اور میرا تبادلہ ڈِپٹی کمشنر سیلز ٹیکس (رِکوری) جموں کے طور پر ہو گیا۔ سیکریٹری نظام صاحب نے مُجھے اپنے کمرے میں بُلایا اور کہا کہ مَیں اپنی ٹرانسفر رُکوا لوں کیونکہ وہ میرے جیسا اچھا افسر گنوانا نہیں چاہتے۔ اُنہوں نے مُجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر مَیں اِجازت دے دوں تو وہ چیف سیکریٹری سے اِس سِلسِلے میں بات کریں۔ اُنہوں نے پھر پوچھا، ''پیسہ چاہیئے؟ اگر وہ بات ہے تو اُس کا اِنتظام بھی ہو جائے گا''۔ مَیں نے کہا ''صاحب میں نے نو سال سِول سیکریٹریٹ میں نوکری کر لی ہے۔ اب جموں میں کُچھ دیر رہ کر اپنا ایک چھوٹا موٹا آشیانہ بنانا چاہتا ہوں''۔ اُنہی دِنوں سیکریٹریٹ اِمپلائیز یُونین نے ایک خصوصی

میٹنگ کر کے سرکار سے میری ٹرانسفر کو معطل کرنے کی گذارش بھی کی۔ لیکن میرا اپنا اصرار تھا۔ اِسلئے میں تبدیل ہو کر جموں چلا گیا۔

اُسی زمانے میں یعنی ۱۹۸۴ء میں شاید آپریشن بلیو سٹار اور اِندرا گاندھی کے قتل کے درمیانی عرصہ میں میرا دُوسرا شعری مجموعہ ''سراب در سراب'' بھی منظرِ عام پر آ گیا تھا۔ وفور شوق میں ''سراب در سراب'' چھپ تو گیا لیکن اُس عہد کے نامعتبر و متذبذب حالات کی وجہ سے ''سراب در سراب'' سِکھ اِنتہا پسندی اور ہندوستان کے (خاص طور سے جموں کے) اکثر و بیشتر ہندو عوام کے سِکھوں کے لِئے بے اعتمادی بلکہ نفرت تک کے جذبات کا شِکار ہو کر رہ گیا تھا۔ مَیں کبھی سِکھ اِنتہا پسندی یا خالصتانی خیالات کا حامی نہیں رہا اور ایک ہندو لڑکی سے میری شادی ہونے کی وجہ سے مُجھے دونوں طرف سے معتُوب ہونا پڑتا۔ ''سراب در سراب'' کی شاعری کے کُچھ نمونے ذیل میں درج ہیں:-

پر کہیں مِرا بیتاب ہے کہیں مِری پرواز
سرحدوں سے ناواقف بے وطن پرندہ ہوں

اب جو ڈوبا ہے بال بال مِرا
بحر رکھے گا خود خیال مِرا

میری انا کا مول وہ دے بھی تو کِس طرح
یہ قتل وہ ہے جِس کا کوئی خونبہا نہیں

بے بس تماشہ دیکھ رہا ہوں زوال کا
یہ بھی نہیں کہ خون مِرا کھولتا نہیں

کشتی شکستہ اور جزیرہ ہنوز دور

بیتابؔ ہو رہی ہے مخالف ہوا مری

کل تک جو ہجرتوں میں بھی زنجیرِ پا رہی

آج اُس زمیں سے پاؤں ہمارے اُکھڑ گئے

اُونچا پہاڑ دفن ہوا گہری کھائی میں

خاموش دیکھتے رہے اپنا زوال ہم

چہرے تھے آشنا مگر آنکھیں تھیں اجنبی

راتوں کی پوچھتے ہو وہ دِن بھی مہیب تھے

کانچ کے دریچوں کو بند ہی رکھو بیتاب

سرپھری ہواؤں پر کس کا زور چلتا ہے

اُن دِنوں میرے جموں کے ایک دوست دیوندر شرما سری نگر میں سٹیٹ بینک آف اِنڈیا میں کام کرتے تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُن کا موجودہ مُسلم مالک مکان اُنہیں بے وجہ پریشان کر رہا ہے۔ مَیں اور انو دیویندر شرما اُس کی بیوی اور اُس کی دونوں بیٹیوں کو لے کر سُدلیش وارِکوُ کے پاس چلے گئے۔ سُدلیش وارِکوُ جو خود پنڈت لڑکی تھی میری ایل ایل بی کی ہم جماعتی اور انوُ کی سہیلی تھی سُدلیش جواہر نگر میں رہتی تھی جو کشمیری پنڈتوں کی کالونی تھی۔ سُدلیش وارِکوُ جو عدالت میں جج کے عُہدے پر فائز تھیں ہمارے قافلے کو ساتھ لیکر ایک ایک گھر میں کرائے کے کمرے ڈھونڈ نے نِکل پڑیں۔ ہر مکان کے باہر کھڑے ہو کر سُدلیش وارِکوُ آواز لگاتی، ''آنٹی! مکان ماں چھوُ خالی؟'' (آنٹی! مکان خالی ہے؟) اندر سے آواز آتی، ''سردار

ماں چھوٗ؟'' (سردار تو نہیں ہے؟) مجھے دیکھ کر آنٹیاں سوچتیں کہ شاید مکان سردار کو چاہیئے۔لہٰذا اُسد لیش شرمِندہ ہو کر فوراً باہر آجاتی ،کافی مکان دیکھنے کے بعد ایک مکان کے اندر گھُسنے کا موقع مِل گیا۔اُس مکان میں دوسَیٹ خالی تھے۔اُوپر کا سَیٹ انُو اور دیوندر دیکھ رہے تھے جب کہ نیچے کا سیٹ دیوندر کی بیوی اور مَیں دیکھنے میں مصرُوف تھے۔مالک مکان آیا اور دیوندر اور انُو سے کہا کہ اگر مکان آپ لوگوں کو چاہیئے تو دے دوں گا اگر سردار کو چاہیئے تو نہیں دوں گا۔

دیوندر کشمیری پنڈتوں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے واپس آ گئے اور مُجھ سے کہا کہ مَیں اپنے موجودہ مُسلم مالک مکان کے ساتھ ہی رہوں گا۔نہیں چاہیئے مُجھے پنڈت کا مکان۔

یہ وہی کشمیری پنڈت تھے جنہیں بعد میں ۹۰-۱۹۸۹ء کی کشمیری اِنتہا پسندی کے زمانے میں جب کشمیر سے اِجتماعی ہجرت کرنا پڑی تو اِن کے بھاری بھرکم بوجھ اکثر سرداروں کے ٹرکوں نے ہی ڈھوئے تھے۔

کئی سِکھ ڈرائیوروں کو کشمیری دہشت گردوں کے عتاب کا شِکار بننا پڑا جب اُن کے ٹرکوں میں سیب کی پیٹیوں اور دُوسری بوریوں کے درمیان کشمیری پنڈت کُنبوں کے کُنبے لدے ہوئے پائے گئے۔کئی سِکھ ڈرائیوروں کو اِس وجہ سے کشمیری دہشت گردوں کے عتاب کا شِکار بھی ہونا پڑا۔یہ وہی کشمیری پنڈت تھے جو اپنی ۹۰-۱۹۸۹ء کی ہجرت کے بعد بڑے بڑے جلوٗسوں کی شکل میں آنند پور صاحب ''کرتگیتا یاترا'' کرنے جاتے تھے۔یاد رہے سِکھوں کے نویں گورُو، گورُو تیغ بہادر نے کشمیری پنڈتوں کی فریاد پر اُن کے تِلک جنیٔو کی خاطر اپنی جان قربان کر دی تھی جب کُچھ کشمیری پنڈت آنند پور صاحب اُن کے پاس اپنی فریاد

لے کر گئے تھے۔

بے سروسامانی خانہ بدوشی احساسِ کم مائگی وکمتری کی منفی اور میدان شِعر میں مُسلسل ترقّی اور نوکری میں آئیندہ اُمید آوری کی مثبت کیفیات کے درمیان ہم نے اپنا بوریا بستر باندھا اور جموں کے لِئے روانہ ہوگئے۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نِکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نِکلا

(غالِب)

☆☆☆

باب - ۸

یوں تو پچھلے نو سال سے ہم لوگ ہر چھ مہینے بعد جموں سے سرینگر اور سرینگر سے جموں دربار موو کے ساتھ آتے جاتے ہی تھے مگر اِس بار ہم سرینگر سے جموں جا رہے تھے دِل میں ایک مُستقِل ٹِھکانہ آشیانہ بنانے کا عزم لِئے ہوئے۔ جموں میں ایک سرکاری کوارٹر تو تھا ہی لیکن دِل میں تمنّا تھی کہ کوئی چھوٹا موٹا قطعۂ ارض مِل جائے تو ایک چھوٹا موٹا نشیمن بنا لیں۔ ورنہ ابھی تک خانہ بدوشی کا عالم یہ تھا کہ

جِس شہر میں پہنچوں اُسے منزل جانوں
کُچھ دیر میں کُچھ سوچ کے چل دوں پھِر سے
خوابوں میں طنابوں کو کسوں ہوں بیتابؔ
جاگوں ہوں تو خیمے کو اُکھاڑوں پھِر سے

ہم جو مارے ہوئے سفر کے ہیں
اِس ڈگر کے نہ اُس ڈگر کے ہیں

زمیں کا لمس مِل جائے تو اُتروں
ابھی تو پاؤں کے نیچے خلا ہے

جو ہجرت ہی مقدّر رہے تو بیتابؔ
رفاقت بے سبب دیوار و در سے

بے گھری اُس کی دیکھیئے صاحب

گھر میں رہ کر جو دربدر ہی رہا

حکمِ سفر تھا اور وضاحت نہ تھی کوئی

بس بحر و بر ہمارے لِئے راستہ ہوئے

جموں میں سیلز ٹیکس ڈِپارٹمنٹ اُس زمانے میں اولڈ سیکریٹیریٹ نام کی عمارت میں تھا جسے جموں کے لوگ ''راجے دی منڈی'' بھی کہتے ہیں۔ یہ بڑی قلعہ نُما عمارت (بلکہ مجموعۂ عمارات) کسی زمانے میں جموں کے راجاؤں مہاراجاؤں کے کئی کئی محل اپنے اندر سمائے ہوئے تھی، اُس زمانے تک جموں کی عدالتیں (ہائی کورٹ کے سمیت)، ڈوِژنل کمشنر کا دفتر، محکمہ خوراک اور سپلائیز، محکمہ سیلز ٹیکس اور کئی دُوسرے سرکاری محکمے اسی طویل وعریض عمارت بلکہ عمارتوں کے اِجتماع میں ہُوا کرتے تھے۔ صدیوں پُرانی اِن عمارتوں کا آدھے سے زیادہ حِصّہ کھنڈروں میں بدل چُکا تھا (ہے) باقی ماندہ عمارتوں کی حالت اتنی خستہ تھی کہ اُن کی مُرمّت بھی ممکن نہیں تھی۔

مُجھے یاد ہے ''راجے دی منڈی'' کے جس حِصّے میں میرا دفتر تھا اُس کی چھت سے اکثر اینٹیں اُکھڑ اُکھڑ کر نیچے گرتی رہتی تھیں۔ اکثر سُنتے تھے کہ پوری کی پوری ''راجے دی منڈی'' unsafe قرار دی جاچُکی عمارت ہے، لیکن سرکاری دفاتر وہاں دھڑلّے سے چل رہے تھے۔ مَیں اُن دِنوں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اُس عمارت کی ایک ایک اینٹ کا اُکھڑنا تواریخ کی، ایک تہذیب کی، ایک ثقافت کی، ایک دُنیا کی لمحہ لمحہ ایک ایک اینٹ اُکھڑتے رہنے کے مُترادف ہے۔ سُنا ہے آجکل اُس عمارت کی پُرانی شان وشوکت کو دوبارہ قائم کرنے کے لِئے

سرکاری اقدام جاری ہیں۔ عمارت کی تو شاید دوبارہ مرمّت و تعمیرِ نو ہو بھی جائے مگر تواریخ و تہذیب و ثقافت جو لمحہ لمحہ پیچھے چھوٹتی جارہی ہے وہ کہاں دوبارہ حاصِل ہوسکتی ہے۔ پچھلے دِنوں میرا اِکسی سِلسلے میں راجے دی منڈی کی طرف جانا ہوُا تو وہ پُرانا محل (پُرانی عمارت) بڑے پُرسوز لہجے میں مُجھ سے مخاطب ہوُا ۔

چُپ چاپ اینٹ اینٹ اُکھڑتا رہتا ہوں
اپنی آنکھوں سے اپنے زوال کو دیکھتا رہتا ہوں
شِکوہ نہ شکایت
مَیں کِسی سے کُچھ نہیں کہتا
پھِر کیوں یہ کُچھ لوگ آجاتے ہیں
مُجھے پریشان کرنے کو
تعمیرِ نو تشکیلِ نو تجدیدِ نو
یعنی میری ازسرِ نو تکمیل کے نام پر
میری خستہ حالی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کو
میرے زخموں کو کریدنے کے لِئے
میری اپنی قِسم کی ساخت کو
بے ساخت کرنے کے لِئے
مان لو اگر یہ
مرمّت کر کے مُجھے نیا جیسا بنا بھی دیں
تو بھی کیا بھروسہ ہے

کہ میرے اندر

وہ اعتبار وہ اعتماد بھی لوٹ آئے گا

جو اُس عہد سے منسلک ہے

جو میرا عہد تھا

ابھی تک نو سال کی نوکری مَیں نے سِول سیکریٹریٹ میں ہی کی تھی۔ فیلڈ پوسٹنگ کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ایڈمنسٹریشن میں سیکریٹریٹ سے باہر کے یعنی محکموں کے اصل زمینی کام کو فیلڈ ورک اور ایسی تقرّری کو فیلڈ پوسٹنگ کہا جاتا ہے۔ سُنتے آئے تھے کہ جس افسر نے سیکریٹریٹ میں نوکری کی ہو وہ فیلڈ میں کسی بھی کام میں مار نہیں کھاتا۔ پھر بھی ڈپٹی کمشنر سیلز ٹیکس (رِکوریز) بن کے مُجھے احساس ہُوا کہ بے شک فیلڈ پوسٹنگ اور فیلڈ ورک کے اپنے لوازمات ہیں جو سول سیکریٹریٹ کے طریقہ کار سے بالکل الگ ہیں۔

میرا کام چھوٹے بڑے ہر قسم کے تاجروں سے سیلز ٹیکس کے بقائے وصول کرنے کے کام کی نگرانی کرنا تھا۔ ایک مخصوص حد کے بعد بقائے ادا نہ کرنے والوں کو جیل بھیجنے اور اُن کی جائدادیں ضبط کرنے کے قانونی اختیارات تھے۔ اِتنے اختیارات ہونے کے باوجود جب میں کسی بڑی مچھلی پر ہاتھ ڈالتا تو کسی نہ کسی طرف سے اُونچی اُونچی سفارشیں آجاتیں۔ میرے سفارش نہ ماننے پر بڑے افسر شاہ اور بڑی بڑی سیاسی شخصیات میرے خلاف ہو جاتیں۔ مُجھے یاد ہے ایک بار کمشنر سیلز ٹیکس نے مُجھے اپنے دفتر میں بُلا کر بتایا کہ اُس وقت کے حاکمِ اعلیٰ نے کسی بڑے تاجر کی سفارش کی ہے۔ وہ تاجر ایک بڑا سیاسی لیڈر بھی تھا۔ اُس کے نام پر کروڑوں روپے کے بقائے واجب الادا تھے۔ سُود در سُود بقایا جات بڑھتے جا

رہے تھے لیکن وہ بقایا جات ادا کرنے کا نام تک نہیں لیتا تھا۔ ایسے کچھ ایک اور مگر مچھوں کی وجہ سے میرا کام کرنا مُشکل ہو چُکا تھا۔

ایک بار مَیں اپنی Magisterial Power کا استعمال کرتے ہوئے ایک کروڑوں رُوپے کے بقائے دبا کر رکھنے والے تاجر کو گرفتار کرنے اُس کے گھر پہنچا تو ایک بہُت بڑے افسر کو مَیں نے اُس تاجر کے گھر کھاتے اور پیتے ہوئے پایا۔ یہ وہ افسر تھے جو ریاست کے نہایت ایماندار افسروں میں شُمار ہوتے تھے۔ مَیں سوا سال سے زیادہ اُس محکمے میں نہیں رہ سکا لیکن میرے سوا سال کے قیام کے دوران تین کِمشنر مَیں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بدلتے ہوئے دیکھے۔

اِس پوسٹِنگ کے دوران مَیں نے پورے کے پورے صوبہ جموں کے دَورے کِئے اور صوبے کے کونے کونے سے بقایا جات دبا کر رکھنے والے تاجر ڈھونڈ نِکالے۔ کئی جگہوں پر تو میری سخت جانی کی وجہ سے مُردوں کو بھی واپس زِندہ ہو کر بقایا جات ادا کرنے پڑے۔ ظاہر ہَے کہ میرا طریقۂ کار اُوپر نیچے کِسی کو بھی پسند نہیں تھا۔ میرے ماتحت کام کرنے والے کُچھ ملازم خُود کئی بار فائلیں غائب کر دیتے یا اُس تاجر کو پہلے سے اطلاع دے دیتے کہ اُس کو پکڑنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ بہر حال مَیں نے اُس محکمہ میں رہ کر فیلڈ ورک کے طور طریقے ضرُور سیکھ لِئے

اب سیکھ لِئے ہم نے سبھی طور طریقے
اب سادگی اپنی ہے نہ دُنیا کی رِیا یاد

کئی بڑے بڑے تاجر، بڑے بڑے مگر مچھ میرے پاس آتے۔ مُجھے ڈراتے

دھمکاتے، مُجھے لالچ بھی دیتے۔ یہاں تک کہ میرے اپنے اعلیٰ سیاسی و نظامیاتی حُکام بھی مجھے زیادہ پنگے لینے سے باز رہنے کے لِئے کہتے اور سمجھاتے کہ کارِ سرکار تو چلتا رہتا ہے، آدمی کو دُنیا داری کا کُچھ پاس بھی رکھنا چاہئے۔ عالم یہ تھا کہ

دونوں جانب سے بچنا ہُشیاری ہے

دُنیا کی تلوار میاں دودھاری ہے

یہ وہ عہد تھا جب جموں کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ اور سابقہ وزیرِ اعلیٰ فاروق عبداللہ کے بہنوئی جی ایم شاہ کی قلیل عرصے کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور ریاست میں گورنر رُول نافِذ ہو چُکا تھا۔ اُسی زمانے میں راجیو گاندھی (وزیرِ اعظم) کی بھارت سرکار شیخ محمد عبداللہ کے بیٹے فارُوق عبداللہ کو دوبارہ ایوانِ حکومت سونپنے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ شاید جی ایم شاہ کی حکومت بھارت سرکار کے لِئے زیادہ پسندیدہ ثابت نہ ہو سکی۔ حالانکہ فاروق عبداللہ کو ہٹوا کر جی ایم شاہ کو وزیرِ اعظم بھی بھارت سرکار میں حکومت کرنے والی کانگریس پارٹی کی مدد سے ہی بنوایا گیا تھا۔

ریاست میں اِنتخابات کروائے گئے اور فاروق عبداللہ نے دوبارہ قلمدانِ وزارتِ عظمیٰ سنبھالا۔ اُن انتخابات میں کشمیر میں راجیو مخالِف فاروق مخالف اور کِسی حد تک ہِند مخالف سیاسی تنظیموں نے مِل جُل کر مُسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے جھنڈے تلے اِنتخابات لڑے تھے۔ کہتے ہیں اِنتخابات کے نتائج کے لِئے کی جا رہی ووٹوں کی گِنتی کے دوران ایک وقت پر مُسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے ۳۳ اُمیدوار اپنے حریفوں سے آگے چل رہے تھے لیکن حتمی نتائج کے وقت اُن کے صِرف ۴ اُمیدوار ہی جیت پائے۔ مُسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے اُمیدواروں اور اُن

کے حمایتیوں میں غصّے اور نفرت کی ایسی آگ پھیلی ایسی آگ پھیلی کہ جس نے بالآخر ایک آتشیں آندھی کا روپ لے لیا۔ جس کی تپش میں آج تک ریاست جموں و کشمیر سُلگ رہی ہے۔ مُسلم یونائٹڈ فرنٹ کے اُمیدواروں اور رہنماؤں کا دعویٰ تھا کہ اُن کو ووٹوں کی گنتی میں ہیرا پھیری کے ذریعے ایوانِ حکومت سنبھالنے سے روکا گیا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب کشمیر کے کچھ نوجوانوں کے پاکستان جا کر مُسلّح ٹریننگ لینے کے معاملات منظرِ عام پر آنا شروع ہو گئے تھے۔ کشمیر میں کچھ ہندوستانی اور بین الاقوامی سیّاحوں کے اغوا کی واردات بھی اسی عرصے میں نمودار ہوئیں۔ ۱۹۸۷ء میں فاروق عبداللہ نے بے شک ایوانِ حکوُمت سنبھال لیا تھا لیکن ریاست کے حالات درجہ بدرجہ مُتذبذب اور مُتزلزل ہوتے جا رہے تھے۔ ریاست میں خاص طور سے صوبہ کشمیر میں جا بجا بم دھماکے بھی ہونے شروُع ہو گئے تھے۔ کشمیری پنڈت اور (کسی حد تک) سِکھ باشندوں میں پریشانی کا عالم تھا۔ کشمیر مں یہاں وہاں چھوٹے بڑے جلسے جلوُس مُنعقد کیئے جا رہے تھے جن میں کھُلے عام فاروق عبداللہ، کانگریس اور بھارت (سرکار) کے خِلاف خیالات کا اِظہار کیا جاتا۔ کُل مِلا کر ہند مُخالف طاقتیں یکجا ہو رہی تھیں۔ جلسے جلوُسوں میں اور عام بات چیت میں (۱۹۸۷ء کے) اِنتخابات کو فراڈ قرار دِیا جا رہا تھا۔ گولی بارُود، بم، اے۔ کے۔ ۴۷ کی بات کُھلے بندوں ہو رہی تھی۔ پورے کا پورا کشمیر ایک (ابھی تک) نہ دِکھائی دینے والی آگ میں جھُلس رہا تھا۔ جائے حیرت یہ کہ جمہوریت کے نام پر حکومت کرنے والے لوگ اپنے ہر قِسم کے کام میں مصروُف اِن تمام حالات و واقعات سے بدستور آنکھیں مُوندے ہوئے تھے۔ روم (کشمیر) جل رہا تھا اور کئی کئی نیرو اپنی اپنی بانسری بجانے میں مصروف تھے۔ میرے تیسرے شِعری مجموعے ''خودرنگ'' ۱۹۹۵ء میں شامل مندرجہ ذیل دو نظمیں اُسی زمانے کی غمّاز ہیں۔

میرے اُوپر نیچے دائیں بائیں آگے پیچھے

شوُں شوُں شائیں شائیں دھائیں دھائیں

کرتے ہوئے راکِٹ گولے اور میزائل چل رہے ہیں

اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر

مَیں آرام کُرسی پر بیٹھا ہُوا

سامنے رکھّی میز پر بند پڑی

فائلوں میں محفوُظ

جمہوریت کو ڈِسپوز آف کر رہا ہوں، (ڈِسپوزل)

اُونچی اُونچی دیواروں والے

مکان کے دوُر اندر والے کمرے میں

تمہیں شاید

باہر چلنے والی گولیوں کی آواز

سُنائی نہ دیتی ہو

لیکن باہر گلیوں بازاروں میں

اور سڑکوں پر

جو بے بس گھوُم رہا ہے

وہ بھی تو تمہیں ہو

اُس کا کیا کروگے

وہ تو

اِس قلعے میں داخل بھی نہیں ہو سکتا۔ (اُس کا کیا کروگے؟)

اکتوبر ۱۹۸۷ء میں میری چھوٹی سالی بٹّو کی شادی ہو گئی۔ میرے ہم زُلف کمل کشّپ اپنے بھائی بھابھی اور کُچھ دوسرے رِشتہ داروں کے ساتھ کانگڑہ سے لڑکی دیکھنے آئے تھے۔ بٹّو اِتنی خوبصورت ہے کہ اُس کو دیکھتے ہی لڑکے نے کِسی طرح سے ایک سونے کی انگوٹھی کا اِنتظام کروا کے اُسی موقعے پر بٹّو کی اُنگلی میں پہنا دِیا۔ بٹّو کے ساتھ میرا جذباتی لگاؤ آج تک کمل کے ساتھ بھی محبت کی صوُرت اِختیار کر چُکا ہے۔ شاید دِسمبر ۱۹۸۷ء کی بات ہے بٹّو اور کمل نے زور دے کر ہمیں ہماچل پردیش کی سَیر و سیاحت کے لِئے بُلایا۔ ہم لوگ شِملہ، ناہن اور پاونٹہ صاحب (گورو گوبند سِنگھ سے متعلق ایک گوردوارہ) تو پہلے بھی جا چُکے تھے۔ لیکن کانگڑہ کُلّو اور منالی کی طرف یہ ہمارا پہلا سفر تھا۔ ناہن کے ذِکر پر یاد آیا کہ غالباً ۱۹۸۳ء میں جب میں ابھی انڈر سیکریٹری تھا اجمیر سِنگھ سِدھُو کے ساتھ ہم لوگ ناہن گئے تھے، سِدھوُ ۱۹۷۴ IAS Batch کے افسر تھے۔ میرے قریبی دوست تھے۔ بُنیادی طور پر ہوشیار پور سے تعلق رکھنے والے Clean shaved سِکھ افسر تھے۔ سِدھُو صاحب کی چھوٹی سالی شیاما شرما ہماچل پردیش کی وزیر رہ چُکی تھی اور اُن دِنوں بھی ایم ایل اے تھی۔ سِدھوُ صاحب کی بیوی جِن کا نام مدُھر تھا اُنو کی قریبی سہیلی تھی۔

سِدھُو صاحب کے سسُرال میں ہم لوگ تقریباً ۲۰-۱۵ دِن کی چھٹّیوں پر رہے جس دوران میں وہاں ہماری خُوب آؤ بھگت ہُوئی۔ شیاما شرما اُن کے بھائی اور اُن کی امّی سبھی نے ہمیں گویا ہاتھوں پر اُٹھا لیا۔ وہ لوگ عِلاقے کے پُرانے رئیس تھے اور اُن کے گھر میں لگ

بھگ ۲۴ گھنٹے گیسی چولھا جلتا رہتا تھا۔ اُن لوگوں نے گھر کے پچھواڑے میں گوبر گیس پلانٹ لگا رکھا تھا۔ شہر کے بڑے بڑے افسر تاجر لیڈر شام کے وقت اُن کے گھر کے باہر بڑی بیٹھک میں آتے کھاتے پیتے ناچتے گاتے اور چلے جاتے۔ یہ روز کا سِلسلہ تھا۔ اُن لوگوں کی لمبی چوڑی زمین جائداد تھی۔ ہماری جس طرح کی خاطر تواضع اُن لوگوں نے کی اُس سے لگتا تھا جیسے ۱۹۷۴ Batch کا IAS افسر مَیں ہوُں اور سِدھو صاحب کوئی ۱۹۷۷ Batch کے K.A.S افسر تھے۔ جب کہ حقیقت میں وہ .Additional Secy تھے اور مَیں .Under Secy تھا۔ بہر حال اُن لوگوں نے ہمیں ناہن کے پورے عِلاقے میں گھُمایا جہاں لوگوں نے ہماری سرکاری مہمانوں کی طرح عزّت کی۔

شِملہ میں Ridge کے قریب Green Hotel میں MLAs کو Suits مِلے ہوئے تھے۔ شاید وہ ہوٹل ہی MLAs Hostel کی طرح استعمال ہوتا تھا۔ مَیں اور انو جنوری فروری کے اُن دِنوں میں تین چار دِن Green Hotel میں شیاما شرما کے Suit میں جا کر رہے۔ شیاما کے بھائی سُکھدیو نے ہمیں جانے سے پہلے کہا تھا کہ Suit میں ایک چھوٹا سا مندر ہے جس کے پیچھے ایک بڑا سا صندوق پڑا ہے اُسے کھول کے دیکھ لینا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی مگر جب Hotel میں چھوٹے سے مندر کے پیچھے بڑا سا صندوق کھولا تو وہ بڑھیا انگریزی شراب کی چھوٹی بوتلوں سے بھرا ہوُا پایا۔ مَیں نے اور انو نے لگاتار گرتی ہوئی برف کے بیچ شِملہ میں تین چار دِن خُوب کھایا بھی پیا بھی اور ہر قِسم کی عیش بھی کی۔ شِملہ میں بِتائے ہوُئے ہمارے وہ تین چار دِن ہماری زِندگی کی حسین ترین یادوں میں شامِل ہیں۔

اِس موقعے پر مُجھے ناہن کے نزدیک ہی واقع گورودوارا پاؤنٹہ صاحب کی بھی یاد آ رہی ہے۔ گورودوارا پاؤنٹہ صاحب پہاڑوں سے نیچے کی طرف آتی ہوئی جمنا ندی کے کِنارے پر واقع ہے۔ یہاں سے جمنا مَیدانوں کی طرف نِکل جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے ریاست سرمور کا راجا گورو گوبند سِنگھ صاحب کا بڑا بھگت تھا اور اُسی کی درخواست پر گورُو گوبِند سِنگھ جی آ کر اپنے ساتھی ۵۲ کویوں (شاعروں) کے ساتھ یہاں قریب قریب چار مہینے کے لِئے رُکے تھے۔ گورُو گوبِند سِنگھ نے اپنے ساتھی کویوں سے کہا کہ یہاں آپ آزاد مَن سے کِوتا لِکھیئے اور ہر ہفتے ہم لوگ اپنی اپنی کِوتائیں ایک دُوسرے کو سُنایا کریں گے۔ (شاید) ہر اِیت وار کو گورُو صاحب سب کویوں کی نئی رچنائیں سُنتے، اپنی بھی سُناتے اور بہترین کویوں کو انعام بھی دیتے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دِن کُچھ کوی گورُو صاحب کے پاس آئے اور اُن سے کہا، ''مہاراج آپ تو ہمیں کِوتا لِکھنے کی تحریک دے رہے ہیں لیکن یہاں کل کل بہتی ہوئی جمنا ندی کا شور ہمیں دھیان لگا کر کِوتا نہیں کرنے دیتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گورُو صاحب دریا کے کِنارے کھڑے ہو کر جمنا سے مُخاطب ہوئے۔ ''اے جمنا! تیرے تیزی سے بہتے ہوئے پانی کا شور ہمارے شاعر دوستوں کے دھیان میں خلل ڈالتا ہے اور اِس طرح وہ آزاد مَن سے کِوتا لِکھنے میں تکلیف محسُوس کرتے ہیں۔ ہم تُم سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے شاعر بھائیوں کے لِئے یہاں سے خاموش ہو کر گُزرا کرو۔''

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ واقعی جمنا نے گورُو صاحب کی بات مان لی تھی یا کُچھ اور وجہ ہے لیکن جو بات مَیں نے اپنی آنکھوں دیکھی وہ یہ ہے کہ پیچھے پہاڑوں سے آتی ہوئی جمنا بھی

پُرشور ہے۔ آگے مَیدانوں کی طرف جاتی ہوُئی جمنا بھی پُر شور ہے۔ پاؤنٹہ صاحب گورُودوارے کے کِنارے خاموش ہے۔ گورُوگوبِند سِنگھ کے ساتھی فارسی شاعر نند لعل گویا کے دو شعر پیش کر رہا ہوُں:-

دِل اگر دانا بود اندر کنارش یار ہست

چشم گر بینا بود در ہر طرف دیدار ہست

دین و دُنیا در کمندے آں پری رُخصارِ ما

ہر دو عالم قیمتِ یک تارِ موئے یارِ ما

میرے سکوُل کے زمانے کے دوست روی گُپتا کے بہنوئی انجینیئر آر۔ سی۔ گُپتا اُن دِنوں سُندر نگر (ہماچل پردیش) میں محکمۂ بجلی کے سُپر اِنٹینڈنگ انجینیئر تھے۔ ایک رات ہم اُن کے پاس بھی رُکے۔ اُنہوں نے منالی میں ہمارے رہنے کے لِئے ایک گیسٹ ہاؤس میں سارے اِنتظامات کروادِئے۔ بِٹّو اور کمل بھی منالی میں ہم سے آ مِلے۔ منالی ایک نہایت خوبصورت شہر ہے۔ جِس میں چیڑ کے گھنے درختوں کا ایک جنگل (City Forest) ہے اور دریائے بیاس اِس شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ منالی میں ہم نے ۳۱ دِسمبر کی رات اِکٹھے گزاری۔ ہم لوگ منالی سے روہتانگ نام کے مشہور درّے کی طرف بھی گئے لیکن برف زیادہ ہونے کی وجہ سے روہتانگ تک پہنچ نہ پائے۔ منالی سے روہتانگ اور کیلانگ کے راستے لیہہ (لداخ) تک جانے والی سڑک پر گرمیوں کے کچھ مہینے بس بھی چلتی ہے۔ لیہہ کے لوگ منالی کے راستے بھارت کے دوسرے علاقوں سے رابطہ رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔ بنسبت کرگل اور سرینگر (کشمیر) کے۔ جب روہتانگ پاس سردیوں میں برف کی وجہ سے بند ہوتا ہے تو لیہہ

کے لوگ بذریعہ ہوائی جہاز دہلی اور چنڈی گڑھ سے سیدھا رابطہ رکھتے ہیں۔

منالی سے ہم لوگ واپس کُلّو آئے۔ کُلّو میں جِبھّی (Jibhi) نام کے ایک چھوٹے سے خوبصورت پہاڑی قصبے کے سکوُل میں کمل اُن دِنوں مدرّس (Teacher) تھے۔ ایک ہفتے کے قریب ہم جِبھّی (Jibhi) میں رہے۔ جِبھّی (Jibhi) میں مُجھے پونچھ لورن منڈی، راجوری، تھنّہ منڈی اور ڈیرہ گلی کے اپنے پہاڑی عِلاقے یاد آئے۔ جبھّی (کُلّو) اور پونچھ راجوری کے پہاڑی علاقے بالکل ایک جیسے ہیں۔ شاید یہ سارے کا سارا ایک ہی پہاڑی سِلسلہ ہے۔

<u>۱۹۸۷</u>ء کے اواخر میں میرے اکلوتے ماموُں بے انت سنگھ کے بڑے بیٹے پرم جیت سنگھ کی شادی اُن کی رہائش گاہ پونچھ میں ہونا طے پائی۔ میرے ماموں اور پرم جیت (جو اُن دِنوں پونچھ میں سینئر لیکچرار ہائر سکینڈری سکول تھے) خود ہمارے گاندھی نگر کے گورنمنٹ کوارٹر میں مُجھے اور انُو کو شادی میں شامِل ہونے کی دعوت دینے آئے تھے۔ مَیں نے اور انُو نے اُن سے کہا کہ جِن لوگوں نے میرے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیوں میں ہمیں نہیں شامِل ہونے دِیا وہ پرم جیت سنگھ کی شادی میں ہمارے شامِل ہونے سے آپ کے لِئے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتے ہَیں۔ پرم جیت اور ماموں دونوں ایک آواز میں بولے، "ہمیں ایسی کِسی بات کی کوئی پرواہ نہیں۔ آپ کو شادی میں شامِل ہونا ہی ہونا ہَے۔"

پرم جیت کی شادی کے بعد ڈیرہ ننگالی صاحب میں مَیں نے اور انُو نے گورُو گرنتھ صاحب کا اکھنڈ پاٹھ رکھوایا جس کا سارا اہتمام خود مہنت بچتر سِنگھ صاحب نے کِیا اور اکھنڈ پاٹھ کے بھوگ پر مُجھے اپنے ہاتھوں سے "سروپا" بھی پہنایا۔ کِسی بھی گورُودوارے میں کِسی کو "سروپا" دِیا جانا باعثِ عِزّت وفخر ہوتا ہَے۔ مہنت صاحب نے ہمارے ساتھ فوٹو بھی

کھنچوائے۔ جس دِن ہمیں واپس جموں آنا تھا بسوں لاریوں کی ہڑتال ہونے کی وجہ سے مہنت صاحب اپنی گاڑی (Van) پر ہمیں جموں اپنے ساتھ لے کر آئے۔

میری جموں کی فیلڈ پوسٹنگ کا اصل زمانہ فروری ۱۹۸۸ء میں شروع ہوُا۔ شاید یہی زمانہ تھا جب میری ذاتی اور ازدواجی زِندگی کو ایک استحکام حاصل ہونا بھی شروع ہوُا۔ یہیں سے میرے مالی سماجی حالات بھی بہتری کی جانب بدلنے شروع ہوئے۔ حالات کے تھپیڑوں نے ایک کھُردری سی نوکیلی شخصیت کو اب تک کِسی حد تک ایک گول پتّھر جیسی بنا دِیا تھا۔ کُچھ دُنیا داری کی سمجھ بھی آ چُکی تھی۔ ہر میدان میں دُنیا سے لڑنا اب خود کو بھی عجیب و غریب لگنے لگا تھا۔ آگے پیچھے اوُپر نیچے دائیں بائیں ایک دُنیا مُستحکم تھی، اپنا مسلسل عدم استحکام اب پریشان کُن لگنے لگا تھا۔

مَیں تو بند ھا ہوُا تھا چھُڑا لے گیا مُجھے
ہمزاد میرا مُجھ سے چُرا لے گیا مُجھے

پھِر چاہتے ہوئے بھی مَیں واپس نہ آ سکا
دریا جب اپنے ساتھ بہا لے گیا مُجھے

چکھا تھا راہ چلتے ہوئے اِک ثمر کہیں
پھِر کیا تھا سبز باغ اُڑا لے گیا مُجھے

مانگا تھا ابر مَیں نے زمینوں کے واسطے
اور آسماں پہ دستِ دُعا لے گیا مُجھے

بیتابؔ اندھے موڑ پہ روکا تھا پاؤں نے
پھر حادثہ خود آگے بڑھا لے گیا مجھے

فروری ۱۹۸۸ء میں میرا تبادلہ سیکریٹری جموں ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے طور پر ہُوا۔ اُردو کے جدید شاعر حکیم منظورؔ بھی کچھ عرصہ پہلے اِسی عُہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ اُن دِنوں حکیم منظورؔ میرے پڑوس میں رہتے تھے بلکہ میرے اور اُن کے سرکاری کوارٹروں کی چار دیواری آپس میں مِلتی تھی۔ حکیم صاحب نے مجھے بُلا کر جموں ڈیویلپمنٹ اتھارٹی میں نوکری کے کئی انداز سِکھائے۔ جموں ڈیولپمنٹ اتھارٹی (جِسے عُرفِ عام میں جے ڈی اے کہتے ہیں) کا کام ضِلع جموں کے شہری عِلاقوں میں تعمیرِ مکانات و دُکانات کے عِلاوہ ہر قِسم کی شہری پلاننگ کرنا اور رہائشی و تجارتی تعمیرات کو Town Planning Act کے دائرے میں لانا ہے۔ جے۔ ڈی۔ اے۔ نے جموں میں ترِکٹا نگر اور رُوپ نگر جیسی مشہُور رہائشی بستیاں بسائی ہیں۔ جموں میں ٹرانسپورٹ نگر بنایا ہے۔ باہُو پلازہ کمرشیل کمپلیکس بنوایا۔ ریل ہیڈ آفِس کمپلیکس بھی بنوایا۔ یہ اور ایسے دوسرے بہُت سے کام یا تو میرے آنے کے وقت پہلے سے جاری تھے یا پھر میرے آنے پر شروع ہوئے۔ اِس کے عِلاوہ جموں کی کئی ایک غیر قانونی بستیوں کو بھی جے ڈی اے نے مناسب معاوضہ لے کر Regularise کِیا اور اُن تمام بستیوں میں Town Planning Act کے مطابق سڑکوں وغیرہ کی تعمیرِ نو بھی کروائی۔

جے ڈی اے کے چئیر مین ریاستی وزیرِ مکانات تھے اور وائس چئیر مین (یعنی Executive head) ایک سینئر انجینئر تھے۔ مَیں سیکریٹری تھا جبکہ وائس چیرمین ایک کشمیری پنڈت تھے (مِسٹر وُتھو) اِتفاق سے اتھارٹی کے چیف ٹاؤن پلینر (Chief

(Town Planner بھی ایک کشمیری پنڈت تھے (مِسٹر رازدان) مالی معاملوں کے صلاح کار (Financial Advisor) بھی ایک کشمیری پنڈت تھے (مِسٹر کوٹھے دار) اور اِس پر طرّہ یہ کہ وزیرِ مکانات وشہری ترقّی بھی ایک کشمیری پنڈت تھے (مِسٹر ہنڈو) جو جموں ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے چئیر مین بھی تھے، کئی لوگ مُجھ سے اکثر آ کر کہتے کہ یہ لوگ سیکریٹری کے عُہدے پر بھی کِسی اپنے آدمی کو لانا چاہتے ہیں۔ آئے دِن میرے تبادلے کی افواہیں اُڑتی رہیں لیکن مَیں نے اِن افواہوں کے درمیان جے ڈی اے میں پونے تین سال تک کامیابی سے کام کِیا۔

میرے جے ڈی اے کے انہی پونے تین سالوں کے درمیان مِنسٹر فار ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ مِسٹر ہنڈو کی جگہ ایک اور سیاست دان مولانا سُہر اوردی نے لے لی اور اتھارٹی کا ماحول کافی بدل گیا۔ یہی نہیں کشمیر کے نامناسب و ناموافق حالات کے باعث فارُوق عبداللہ کی حکوُمت کو ہٹا کر ایک بار پھِر گورنر کی براہِ راست حکوُمت قائم کر دی گئی۔ گورنر کے عہدے پر جگموہن صاحب کی تقرّری ہوئی جو جے ڈی اے کے معاملات میں خُود بھی دِلچسپی لینے لگے تھے حالانکہ جے ڈی اے کے چئیر مین گورنر کے ایک صلاح کار تھے۔

میرے جے ڈی کے زمانے میں جموں میں رُوپ نگر نام کی کالونی میں وزیرِ مکانات یعنی چئیر مین اجے ڈی اے کے Discretionery quote سے لوگوں کو پلاٹ دِئے جا رہے تھے۔ رُوپ نگر کالونی میں میرے جے ڈی اے میں آنے سے پہلے ہی Normal quota کے پلاٹ لاٹری (Draw of lots) کے ذریعے بانٹے جا چکے تھے لیکن چئیر مین کے (Discretionery) کوٹہ سے پلاٹوں کی بندر بانٹ ایک

Marathon Race کی طرح جاری تھی۔ سیاسی اور افسر شاہی طبقے کے لوگ تو دھڑلّے سے وزیرِ مکانات سے سفارشی چِٹھّی لے آتے تھے اور پلاٹ حاصِل کر لیتے تھے لیکن دُوسرے لوگ کُچھ دے دِلا کر (یا کبھی کبھار ذاتی واقفیت سے) کِسی نہ کِسی سیاسی لیڈر کو وزیرِ مکانات کے پاس بھیجتے۔ وزیرِ مکانات کے دفتر میں بھی کُچھ دے دِلا کر Discretionery quota کی سفارشی چِٹھّی لا کر جے ڈی اے دفتر میں بھی کُچھ دے دِلا کر اپنا Allotment Case کلرک کی سطح سے شروع کر کے Chief Town Planner سے (No Objection) لیتے پھر سکریٹری سے ہو کر مِسل (فائل) وائس چئیر مین کے پاس پہنچتی۔ اِس طرح ہر سطح پر کُچھ دے دِلا کر ایسے لوگ بھی پلاٹ حاصل کر لیتے۔ آج بھی اگر جموں کی رُوپ نگر کالونی کے وزیرِ مکانات کے Discretionery quota کے پلاٹوں کی الاٹ منٹ کا احتساب کِیا جائے تو یقیناً اِس بات کی تصدیق ہو جائے گی۔ یہی عالم دُکانات وتجارتی shops اور Commercial sites کی الاٹ منٹ کا ہے حالانکہ ہر ایک نوعیت کی الاٹمنٹ کے لِئے ایک باقاعدہ قانُونی طریقہ کار تیار کِیا جاتا جِسے بڑی آسانی سے جِدھر چاہو موڑا جا سکتا ہے۔

دُور تک جِس کا کوئی سر تھا نہ پاؤں
ہم بھی شامِل اُسی قطار میں تھے
ہٹ کے جینے میں لطافت تھی مگر کیا کیجئے
ہار کر سونے کی زنجیروں کو اپنانا پڑا

میرے جے ڈی اے کے پونے تین سال کے دوران میرے ساتھ میری ازدواجی

اور ذاتی زندگی سے متعلق کُچھ ایک تواریخی واقعات پیش آئے۔ ایک تو میری اِکلوتی بیٹی چوُچوُ
نے ہماری شادی کے دس سال بعد یعنی ۲۸ جُون ۱۹۸۹ء کے دِن ہمارے گھر میں جنم لیا۔
دُوسرے مَیں نے مولانا سُہر اوردی سے درخواست کرکے چھنّی ہمّت ہاؤسنگ کالونی (جموں)
میں بارہ مرلے کا ایک رہائشی پلاٹ حاصِل کِیا۔ چھنّی ہمّت کالونی جے ڈی اے کے پاس
نہیں تھی بلکہ J&K Housing Board کی ایک کالونی تھی۔ یاد رہے کہ جے ڈی اے
کی طرح ہی ہاؤسنگ بورڈ کے چئیرمین بھی وزیرِ مکانات ہی ہوُا کرتے تھے۔ تیسری بڑی
بات یہ کہ اُسی زمانے میں یعنی ۱۹۹۰ء میں ہی ہم نے چھنّی ہمّت کے اپنے پلاٹ میں تعمیرِ
مکان کی بنیاد رکھی۔ پلِنتھ لیول کے اُوپر مکان کی پہلی اینٹ ہماری بیٹی چوُچوُ نے رکھّی تھی جو
اُس وقت مُشکل سے سوا سال کی تھی۔

مندرجہ بالا تین باتوں کے عِلاوہ اُس زمانے کی ایک اور خاص بات ہمیشہ یاد رہے
گی۔ دفتر میں کام کرنے والی ایک عارضی کلرک لڑکی نے ہمارے گھر میں آنا جانا شرُوع کر
دِیا۔ دو ایک بار تو وہ رات بھر بھی ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں ہی رہ گئی۔ ہمارے گھر میں اُس
وقت تک چوُچوُ کی پیدائش واقع نہیں ہوئی تھی۔ میری اور انو کی اُس لڑکی سے اُنس کی وجہ
صِرف یہ تھی کہ وہ کُچھ دیر پہلے گُزر چکے ایک ہِندی شاعر کی بیٹی تھی۔ اُسے نہ جانے کیا غلط فہمی ہو
گئی کہ ایک دِن وہ اپنی ماں کو لے کر دفتر میں آ دھمکی۔ اُس کی ماں نے سیدھے مُجھ سے کہا کہ
یہ لڑکی گھر میں چوبیس گھنٹے آپ کے نام کی رٹ لگائے رکھتی ہے اور پچھلے دِنوں تو اُس نے
آپ کا نام لے کر نیند کی کُچھ گولیاں بھی کھالیں۔ مَیں نے اُس کی ماں سے صاف صاف کہا
کہ مَیں تو اِسے اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتا ہوں اور یہ ہمارے گھر میں مُجھ سے زیادہ انُو سے
گھُلی مِلی ہوئی ہے۔ وہ لڑکی اپنی ماں کو لے کر اُس وقت تو چلی گئی لیکن اُس دِن کے بعد اُس

نے اپنے ایک نام نہاد ہمدرد نو جوان سے مُجھے دھمکی بھرے فون کروانے شروع کر دئے۔ اُس کے اُس نام نہاد ہمدرد نے ایک طرف تو اپنی کسی مسل (فائل) کے دفتر میں غائب ہونے کے نام پر مُجھ سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دِیا اور دوُسری طرف اکثر رات کے وقت مُجھے فون پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ چار چھ مہینے تک اُن دونوں نے مِل کر مُجھے ایک خوف کے عالم میں مُبتلا رکھّا۔ ایک دِن تنگ آ کر انوُ اُس لڑکی کے بھائی بھابھی سے مِلی اور کسی طرح میری جان چھُڑوائی۔ جِس دِن یہ معاملہ سُلجھا اُسی دِن اُس لڑکی کے اُس نام نہاد ہمدرد کے نام کی ایک مسل (فائل) بھی میرے دفتر کی میز پر پہُنچ گئی۔ اِس سے پہلے کہ مَیں اُس لڑکی کے اُس نام نہاد ہمدرد کا کُچھ کرتا مُجھے معلوم ہوُا کہ اُس (ہمدرد) کا رِشتہ میری بڑی بہن کی چھوٹی بیٹی کے ساتھ طے ہو چُکا ہے۔ مَیں چاہ کر بھی کُچھ نہ کر سکا۔

مَیں تو سگائی کی رسم کے وقت شامِل ہونے کے لِئے بُلایا بھی نہیں گیا تھا۔ شادی کے آٹھ دس سال بعد وہ اور اُس کی بیوی (یعنی میری بڑی بہن کی چھوٹی بیٹی) دونوں ایک سڑک حادثے میں خُدا کو پیارے ہو گئے۔

ایک اور خاص بات اُس زمانے کی یہ ہے کہ ایک دِن ایک خوبصورت شادی شُدہ لڑکی اپنی کسی سہیلی کو ساتھ لے کر میرے دفتر میں آئی اور اپنی اُس سہیلی کے پلاٹ کی الاٹمنٹ کے سِلسلے مس مُجھ سے جھگڑنا شروع کر دِیا۔ مُجھے یہ تو یاد نہیں کہ اُس کی اُس سہیلی کے پلاٹ کے case کا کیا ہوُا لیکن خود وہ لڑکی جِس کا نام آشا ہے (جو شادی سے پہلے آشا کپوُر تھی اور شادی کے بعد آشا شرما) آج تک میرے بہترین دوستوں میں سرِ فہرست ہے۔ آشا پیشے سے پرِنٹر اور پبلِشر ہے اور میرا اکثر اشاعتی کام کاج دیکھتی ہے۔ آشا ایک ایسی عورت ہے جو

کِسی کے بھی دُکھ کے وقت دوڑ کر پہنچتی ہے چاہے اُسے جانتی ہو یا نہ جانتی ہو۔ میری زِندگی میں تو وہ اِس طرح سے شامِل ہو چُکی ہے کہ اگر واقعی پچھلے جنم کے کوئی سمبندھ (تعلقات) ہوتے ہیں تو یقیناً میرے ساتھ اُس کا پچھلے جنم کا کوئی نہ کوئی رِشتہ ضرور رہے۔

اکتوبر ۱۹۹۰ء کے پہلے پندرواڑے میں مُجھے بھارت بھون بھوپال سے ''کوی بھارتی -۲'' نام کے سہ روزہ (شاعری سے متعلق) سیمینار میں شامِل ہونے کا دعوت نامہ مِلا۔ ''کوی بھارتی -۱'' ۱۹۸۷ء میں منعقد ہو چُکا تھا جِس میں بھارتی زبانوں (آئین میں منظوُر شُدہ) کے اوّل درجے کے تین تین شعرا بُلائے گئے تھے۔ اُس ''کوی بھارتی'' کے دوران مُجھے بھارت کی تمام بڑی زبانوں کے شعرا و شاعرات سے مِلنے کا موقع مِلا۔ ہم لوگوں نے باری باری اپنی تخلیقات اپنی اپنی زبان کے عِلاوہ ہندی اور انگریزی میں ترجمے کے ساتھ بھی سُنائیں۔ مَیں انو اور چؤ چؤ کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ چؤ چؤ کی عُمر ابھی ڈیڑھ سال سے بھی کم تھی۔ مُجھے یاد ہے اُسی سیمینار کے دَوران ایک دِن اُس وقت کے مدھیہ پردیش کے گورنر جناب کنور محموُد علی خان نے کوی بھارتی میں شامِل تمام شعراء کو دوپہر کے کھانے پر اپنی محل نُما سرکاری رہائش گاہ میں بُلایا تھا۔ اُنہوں نے چؤ چؤ کو دیکھ کر اپنے ہاتھوں میں اُٹھا لیا اور چؤ چؤ نے اُن کے کپڑوں پر سُو سُو کر دِیا تھا۔

بھوپال جموں کی طرح ہی ایک صاف سُتھرا خوبصورت شہر ہے۔ جِس کی اُونچی نیچی سڑکیں کِسی پہاڑی شہر کا دھوکہ دیتی ہیں۔ بھوپال کے ''بھارت بھون'' میں اُس کے بعد بھی دو تین بار ''ساہتیہ اکادمی دہلی'' کے ادبی پروگراموں میں میری شمولیت ہو چُکی ہے۔ ہندی کی مشہور افسانہ نِگار اور نقاد ڈاکٹر اُرمِلا سریش جو بھوپال کی رہنے والی ہیں ''کوی بھارتی -۲''

کے زمانے سے میری بہُت اچھی دوست ہیں۔ ۲۰۰۸ء میں جب ''نظم اکیسویں صدی'' کے ساتھ ہی میرے دیوناگری رسم الخط میں چھپے مجموعۂ غزلیات ''شہرِ غزل'' کا اجراء جموں کلب میں ہوُا تو آپ اپنے شوہر ڈاکٹر سریش کے ساتھ خاص طور سے جموں آئی تھیں اور ''شہرِ غزل'' سے متعلق ایک مقالہ بھی اُنھوں نے پڑھا تھا۔ ''شہرِ غزل'' کو آشا شرما نے چھپوایا تھا اور اس کِتاب پر حکومتِ ہِند کے سینٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ نے سال ۲۰۰۹ء کے لِئے مجھے ہِندی تر بھاشی لیکھک پُرسکار سے نوازہ تھا۔ اِس اِنعام میں ایک لاکھ رُوپے کا نقد اِنعام بھی شامِل ہے۔ یاد رہے کہ میری کِسی اُردُو کِتاب پر مجھے آج تک اِتنا بڑا کوئی اِنعام نہیں مِلا۔ بھوپال کی اور ڈاکٹر اُرمِلا سریش کی خوبصورت یاد ہمیشہ میرے دِل میں رہتی ہے۔

یاد کے بے نِشاں جزیروں سے
تیری آواز آرہی ہے ابھی (ناصِر کاظمی)

سوُرج پرکاش ایک ریوینیو افسر تھے اُس زمانے میں وہ جے ڈی اے میں زمینوں سے متعلق معاملات دیکھتے تھے ۱۹۹۰ء کے کِسی ایک دِن وہ میرے دفتر میں میرے سامنے بیٹھے تھے۔ کِسی نے کہا وہ ہاتھ بہُت اچھی طرح سے دیکھتے ہیں۔ مَیں نے قریب قریب مزاحیہ انداز میں اپنا ہاتھ آگے بڑھادِیا اور کہا بتایئے میرا یہاں سے تبادلہ کب ہوگا؟ اُنہوں نے ہاتھ دیکھتے ہی پھٹ سے کہہ دِیا۔ ۲۰ نومبر کے دِن۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کِسی کو اِس بات کی یاد نہ تھی جب ۲۰ نومبر کو اچانک ایک سِکھ افسر (Joint Director Inormation) آکر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ مَیں نے قریب قریب مزاحیہ انداز میں اُن سے کہا میری Transfer کا Order تو نہیں لے آئے؟ وہ بڑے تحمل آمیز لہجے میں بولے Sorry

Yes Sir۔ اُسی دِن سِدھو صاحب بھی JDA کے وائیس چیئر مین بن کر آئے تھے۔ مَیں اُسی دِن JDA سے چلا گیا اور .Information Deptt میں join کر لیا۔

وہ افسر (سیکریٹری) اور سِدھو صاحب (وائِس چیئر مین) شاید دونوں باہمی اشتراک سے JDA میں آئے تھے۔ اُن کے زمانے میں جے ڈی اے میں بہُت سی اَیسی الاٹ مینٹس ہوئی تھیں جنہیں بعد میں آنے والے کِسی وائِس چیئر مین نے معطل کر دِیا بلکہ ردّ کر دِیا تھا۔ یہ افواہیں عام تھیں کہ وہ سیکریٹری جے ڈی اے صاحب اُن تمام معطّل شُدہ الاٹ منٹوں کے لِئے رِشوت لے چُکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پیسہ واپس مانگنے والے لوگوں نے بالآخر کُچھ پیشہ ور musclemeu کی مدد لی۔ لہٰذا ریاستی سرکار کے ایک افسر کی جان چلی گئی۔ یاد رہے کہ اُس زمانے میں دہشت گردی کا بازار پنجاب کے عِلاوہ جموں کے کُچھ حِصّوں میں بھی گرم تھا۔

باب -۹

اُس زمانے میں رِیاست جموں و کشمیر کے ڈائریکٹر اِنفارمیشن جناب ظفیر الحسن تھے جو (شاید) دہلی سے آئے تھے۔ اُن کی بیگم بِلقیس ظفیر الحسن اُردو کی شاعرہ ہیں۔ ظفیر الحسن صاحب مُجھ سے مِل کر بہت خوش ہوئے۔ ہمارے درمیان دفتری کام کاج کے عِلاوہ اکثر ادب کے مسائل سے متعلق گفتگو ہوتی۔ کشمیر میں اِنتہا پسندی کی وجہ سے محکمہٗ اِطلاعات کا اُردو ماہنامہ جریدہ "تعمیر" بند پڑا تھا جِسے ہم لوگوں نے دوبارہ جاری کِیا۔ نومبر ۱۹۹۰ء سے اپریل ۱۹۹۱ء تک دربار جموں میں ہونے کی وجہ سے ہم جموں میں ہی رہے۔ البتہ میرے لِئے پریشانی یہ تھی کہ میری بیٹی چوچو (رُوچکا) اُس وقت مُشکل سے ڈیڑھ دو برس کی تھی، اُسے اور انو کو ساتھ لے کر دربار موو کے ساتھ کشمیر جانا بڑا مشکِل کام تھا کیونکہ کشمیر کی اِنتہا پسندی اُس زمانے میں اپنے عروُج پر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فاروق عبداللہ کی حکوُمت کو ہٹا کر بھارت سرکار نے جموں کشمیر میں گورنر جگموہن کا راج لاگو کر دِیا تھا۔

اِسی دَوران فروری ۱۹۹۱ء میں پونچھ میں ایک بہُت بڑا ادبی اجتماع منعقد کِیا گیا جِس کے تحت پونچھ کے گورنمنٹ کالج کے باہر اُردو کے مشہوُر افسانہ نِگار، ناول نِگار کرشن چندر کا پیتل کا مجسمہ نسب کِیا گیا تھا۔ کرِشن چندر کا بچپن کیونکہ پونچھ میں ہی گُزرا اور اُس کی بہُت سی تخلیقات کا ماخذ بھی پونچھ کا حسین منظر نامہ ہے۔ اِس لِئے پونچھ کے لوگوں کو کرِشن چندر اور اُس کی تخلیقات سے بہت محبت ہے۔ پونچھ کے اِس ادبی اِجتماع کے دوران ایک مشاعرے کا پونچھ کے منڈی ہال میں انعقاد ہوُا جِس کی نِظامت مُجھے سونپی گئی۔ اُس

مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد سمیت کئی شعرا جموں سے اور کچھ باہر سے بھی شامل ہوئے تھے۔ اِس دَوران میں ایک بار پھر پُونچھ کے خُوبصُورت قدرتی نظاروں کی زِیارت کرنے کا موقع مِلا لیکن افسوس کہ میری بیٹی رُوچکا (جو اُس وقت ڈیڑھ برس کی تھی) کو آج وہ سب یاد نہیں ہے۔ میری بیٹی جو ایک طرح سے پُونچھ کی بیٹی ہے اپنے وطن کے بارے میں صِرف سُنی سُنائی باتیں ہی جانتی ہے۔

مئی ۱۹۹۱ء میں دربار موُو کے دَوران اپنی Second hand فِئیٹ کار پر گھر کے ضروری ساز وسامان کے ساتھ ساتھ انوُ اور چوُ چوُ کو لاد کر مَیں جموں سے سرینگر کے لِئے روانہ ہو گیا۔ کشمیر میں اُس وقت دہشت گردی انتہا پر تھی۔ اِس لِئے کئی لوگوں نے بال بچّوں سمیت کشمیر جانے سے منع بھی کِیا لیکن مَیں اُس وقت انوُ اور ڈیڑھ دو سال کی چوُ چوُ کو پیچھے چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ خُدا کا نام لِیا اور چل پڑا، سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ گاڑی مَیں خود چلا رہا تھا۔ زِندگی کی طرح نوکری میں بھی نازک اور پیچیدہ موڑ آتے ہی رہتے ہیں۔ سرینگر میں جواہر نگر کالونی کا ایک دو منزلہ مکان ہمیں الاٹ ہوُا تھا۔ شام کو مَیں اپنی فئیٹ پر وہاں پہنچا اور اپنا سامان کوارٹر میں لگا دِیا۔ ماحول میں ایک عجیب طرح کا خوف کا عالم تھا۔ ہر ایک سرکاری کوارٹر کے باہر سی۔ آر۔ پی یا بھارتی فوج کے جوانوں کا پہرہ تھا۔

شام پانچ بجے کے بعد سڑک بازار بند ہو جاتے تھے۔ ایک عجیب خوفناک مُردنی ہر طرف چھا جاتی تھی۔ یہ وہ کشمیر نہیں تھا جس میں مَیں پہلے نو سال نوکری کر چُکا تھا۔ جہاں کبھی چاقو چھُری کی بات سُننے کو نہیں مِلتی تھی۔ وہاں کلاشنکو واور اے کے ۴۷ وغیرہ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ راکِٹ گولے عام بات تھی۔ جگہ جگہ بھیڑ بھاڑ کے عِلاقوں میں بھی بم دھماکے ہو رہے

تھے۔

رات کو ہم سونے والے تھے کہ ایسے محسوس ہُوا جیسے ہمارے مکان کی دیواروں پر گولیاں ماری جارہی ہیں۔ اِتفاق سے اُس کوارٹر کی دونوں منزلوں کے ہر کمرے میں کھڑکیاں موجود تھیں۔ گولیاں کِسی بھی کھڑکی سے اندر آسکتی تھیں۔ ہم لوگوں نے پوری رات چوُچوُ کو گود میں لِئے ہوُئے نچلی منزل سے اُوپر والی منزل میں آنے والی سیڑھیوں پر گُزاری۔ بیچ بیچ میں موقع پا کر ہم چوُچوُ کے لِئے دوُدھ گرم کرنے رسوئی میں بھاگ کر جاتے بھاگ کر واپس آ جاتے۔ صُبح سویرے اُٹھ کر مَیں اپنی colleague نسیم لنکر کے کوارٹر میں گیا۔ وہ لوگ بھی جواہر نگر میں ہمارے پڑوس میں ہی رہتے تھے۔ دراصل نسیم نے خوُد مُجھے جواہر نگر میں کوارٹر الاٹ کروایا تھا تاکہ وہ میرا اور انوُ، چوُچوُ کا خیال رکھ سکے۔ نسیم سے مَیں نے کہا کہ رات بھر ہماری چار دیواری پر اور کمروں کی دیواروں پر گولیوں کی برسات ہوتی رہی۔ اُس نے بتایا کہ یہ تو یہاں ہر روز کا کام ہے۔ دراصل پِچھلی رات بھارتی حفاظتی دستوں اور کشمیر ی اِنتہاپسندوں کے درمیان گولی باری ہوتی رہی تھی۔

صُبح ساڑھے نَو بجے دفتر کی گاڑی مُجھے لینے آئی تو مَیں نے جاتے ہوئے انوُ سے کہا کہ وہ اور چوُچوُ گھر سے باہر بالکل نہ نِکلیں۔ یہ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے سرینگر دفتر میں میرا پہلا دِن تھا۔ مَیں پورے دس بجے اپنی کُرسی پر بیٹھا۔ میرے بیٹھتے ہی میرا ایک اردلی یعنی چپراسی اندر آ گیا اور مُجھ سے گویا ہُوا، صاحب آپ کل شام کو آیا؟ مَیں نے کہا ''ہاں'' پھِر وہ بولا ''آپ چار بجے شام قاضی گُنڈ کراس کِیا؟ مَیں نے پھِر کہا ''ہاں'' پھِر وہ بولا ''ساڑھے چھ بجے آپ کانونٹ سکوُل کے راستے جواہر نگر گورنمنٹ کوارٹر نمبر J / ۴۰ میں پہنچا؟ مَیں نے

کہا ''لیکن یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ اُس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے پھر ایک سوال کِیا، ''آپ کا گاڑی کا نمبر ۱۴۳۶ ہے سفید رنگ کا فئیٹ کار''؟ مَیں نے کہا لیکن تُم......؟ ابھی مَیں اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ پھِر بولا ''صاحب آپ کشمیر میں جدھر چاہے گھُومو بے فِکر ہوکر آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ہم نے سب کو آپ کا بارے میں بول دِیا ہے۔'' میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، مَیں مزید کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔

دفتر میں کچھ لوگوں نے بتایا کہ یہاں ہتھیار بند اِنتہا پسند اکثر آتے رہتے ہیں اور دفتری معاملات میں دخل اندازی اپنا حق سمجھ کے کرتے ہیں۔ مُجھے اُن کے ساتھ نہ اُلجھنے کی صلاح دی گئی اور یہ بھی بتایا گیا کہ مِسٹر ہنڈو نام کے ایک کشمیری پنڈت اسِسٹنٹ ڈائریکٹر اِنفارمیشن کو اِن لوگوں کے ساتھ اُلجھنے کی سزا موت کے رُوپ میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی مل چُکی ہے۔

شام کو گھر پہنچا تو انُو نے بتایا کہ چار پانچ نقاب پوش ہتھیار بند نوجوان ہمارے کوارٹر کی چار دیواری پھاند کر اچانک اندر آگئے اور مجھے باہر کھڑے بھارتی حفاظتی دستوں کے پہرے دار جوانوں سے بات نہ کرنے کی تاکید کی اور یہ بھی کہا کہ پہلی بار ہے اِس لئے ہم آپ کو معاف کررہے ہیں۔ دُوسری بار ایسا ہوُا تو چھوڑیں گے نہیں۔ مَیں نے کہا تُم نے سی آر پی کے جوان سے بات کی ہی کیوںُ؟ انُو نے بتایا کہ وہ پانی مانگنے کے لِئے اندر آ گیا تھا۔ مَیں نے پینے کا پانی دے دِیا۔ اِتفاق سے وہ سی آر پی کا سِپاہی ایک سِکھ نوجوان تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اِنتہا پسند کئی لوگوں کو بھارتی حفاظتی دستوں کے مخبر قرار دے کر موت کے گھاٹ اُتار چکے تھے۔

ایک دِن شام کے وقت مَیں کِسی پڑوسی اَفسر کے گھر گیا۔ بیٹھک میں داخِل ہوتے

ہی مَیں نے دیکھا کہ ۴۰/۳۵ لوگ آپس میں سٹے ہوئے کسی سنجیدہ مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ مُجھے دیکھ کر سب لوگ یکدم خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، پھر تھوڑی دیر میں کسی نے کہا گفتگو جاری رکھی جائے بیتاب صاحب اپنے ہی آدمی ہیں کوئی غیر تھوڑا ہیں؟ عید نزدیک آنے والی تھی اور وہ لوگ پکڑے جا چکے جیل میں بند اِنتہا پسندوں کے لِئے اور اُن کے اہل و عیال کے لِئے تحفے تحائف خریدنے کی غرض سے چندہ وغیرہ اِکٹھا کرنے کے لِئے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ مُجھے کچھ گھُٹن محسُوس ہُوئی اور مَیں نسیم کے پاس چلا گیا۔ بیٹھک میں محوِ گفتگو لگ بھگ سبھی لوگ سرکاری افسران تھے۔ اُسی زمانے میں جموں و کشمیر سرکار کے پانچ بڑے افسروں کو اِنتہا پسندوں کے حمایتی ہونے کے جُرم میں نوکری سے برخاست (Dismiss) کر دِیا گیا تھا لیکن بہُت تھوڑے عرصے کے بعد وہ لوگ پھر بحال کر دِئے گئے بلکہ پہلے سے بہتر عہدوں پر بحال کِئے گئے۔ حالانکہ اُسی زمانے میں پنجاب کی سِکھ اِنتہا پسندی کی حمایت میں پائے گئے سمرن جیت سِنگھ مان (IPS) اور گورجنٹ سِنگھ (آئی اے ایس) جیسے افسروں کو کبھی نوکری میں واپس بحال نہ کِیا گیا۔

سرینگر میں حضرت بل ایک مقدّس مُسلم زیارت گاہ ہے۔ وہاں حضرت محمد کا موئے مُقدّس موجود ہے جس کی وجہ سے حضرت بل کشمیر کے مُسلمانوں میں نہایت اہم اور پاکیزہ زیارت گاہ سمجھی جاتی ہے۔ اُنہی دِنوں کُچھ اِنتہا پسند حضرت بل میں داخل ہو گئے اور کُچھ دِن تک انہوں نے سرکار کو پریشانی میں ڈالے رکھا۔ جتنے دِن اُن لوگوں نے حضرت بل کی مقدّس درگاہ کو یرغمال بنائے رکھا۔ نوکر شاہی اُن سے مذاکرات میں جُٹی رہی تا کہ کسی طرح وہ درگاہ سے باہر نکل جائیں اور درگاہ کو کوئی نُقصان نہ پہُنچے۔ آخر کار اُن اِنتہا پسندوں کو (مجبُوراً) سرکار نے اُنہی کی شرائط پر محفوظ راستہ (Safe passage) مہیا کِیا اور وہ لوگ جس ٹھاٹھ

سے درگاہ میں آئے تھے اُسی ٹھاٹھ سے واپس چلے گئے۔ ریاست کے اور دُنیا بھر کے سِکھوں کو بھارت سرکار کی اِس دوغلی پالیسی پر نہایت افسوس ہُوا تھا۔ حضرت بل بے شک کشمیر کے مُسلمانوں کے لِئے ایک پاک درگاہ ہے مگر اُس کی حیثیت وہ نہیں ہے جو دُنیا بھر کے مُسلمانوں میں مکّہ شریف اور کعبے کی ہے۔ جبکہ سِکھوں میں دربار صاحب شری ہرمندر صاحب امرتسر (Golden Temple) کی حیثیت وہ ہے جو دُنیا بھر کے مُسلمانوں میں مکّہ شریف اور کعبہ کی ہے۔ جب جرنیل سِنگھ بھنڈراں والے اور اُن کے ساتھیوں نے دربار صاحب امرتسر میں اپنا اڈّا جما لیا تھا تو بھارت سرکار نے دربار صاحب کے اندر فوجی ٹینک تک داخل کر دِئے اور سِکھوں کی نہایت اہم اور مقدّس عمارت اکال تخت صاحب کو تحس نحس کر دِیا تھا۔ دربار صاحب کی اِسی توڑ پھوڑ کی ردّ میں بلکہ ضِد میں وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کو اپنی جان گوانی پڑی اور پھر دِلّی اور بھارت کے کئی دُوسرے علاقوں میں سِکھوں کے قتلِ عام کا ننگا ناچ بھی منظرِ عام پر آیا۔

میری colleague نسیم (لنکر) نے اُس افراتفری کے عالم میں کشمیر میں میرا اور میرے اہل وعیال کا پورا خیال رکھا بلکہ ہماری ہر طرح سے مدد کی۔ اُس زمانے کے خوف کے عالم میں نسیم اور اُس کے کُچھ دوسرے رِشتہ دار میرا comfort zone تھے۔

ابھی مُجھے سرینگر کے اِنفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے ہوئے دو چار دِن ہی ہوئے تھے کہ ایک دِن سرینگر دور درشن کے ایک ملازِم جو میرے اچھّے واقِف کار تھے دفتر میں آئے اور مُجھ سے میرے مندرجہ ذیل شعر کے سِلسِلے میں پوچھ تاچھ کرنے لگے۔

بستی میں سانپ آنے لگے ہر طرف نظر
اور پھر بسے بسائے ہوئے گھر اُجڑ گئے

دراصل کُچھ عرصہ پہلے ممبئ دوردرشن کے ایک کُل ہند مشاعرے میں مَیں نے جو غزل پڑھی تھی یہ شعر اُسی غزل کا ایک حِصّہ تھا۔ اُن دِنوں دوردرشن کے بیشتر کُل ہند مشاعرے مُلکی سطح (National network) پر دِکھائے جاتے تھے۔ دوردرشن کے اُس ملازم نے مُجھے بتایا کہ کشمیر کے کُچھ اِنتہا پسند آپ کو ڈھونڈتے ہوئے دوُردرشن کیندر میں آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپ نے یہ شعر اُنہی کے لِئے (کشمیر کے اِنتہا پسندوں کے لِئے) کہا ہے۔ مَیں نے اُس شخص کو جواب دِیا کہ یہ شعر (بلکہ یہ غزل ہی) کشمیر کی اِنتہا پسندی کے آغاز سے بہُت پہلے کا کہا ہوُا ہے۔ جِس کے ثبوت میرے پاس موجود ہَیں۔ اُس نے مُجھ سے کہا کہ وہ تو میری اِس دلیل کو مان لے گا مگر اِنتہا پسند کہاں مانیں گے؟ وہ بولی کی نہیں گولی کی زبان سمجھتے ہیں اور پھر اِنتہا پسندوں کی کئی کئی تنظیمیں ہیں۔ آپ کِس کِس کو اِس شعر کی تخلیق کی حقیقت سمجھاتے پھریں گے۔ اِچھّا یہی ہے کہ آپ اپنا تبادلہ کروا کر جموں چلے جایئے۔

مَیں نے اِس بات کا ذِکر اُس وقت کے سیکریٹری جنرل ایڈمِنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ سے کِیا جِنھوں نے چیف سیکریٹری سے بات کر کے میرا تبادلہ پروجیکٹ افسر (Command Area Rural Dev. Agency Jammu) کے طور پر کرنے کی تجویز گورنر جگموہن صاحب کو بھیج دی۔

جِس شہرِ سرینگر میں پہلے نو سال تک مَیں نے (سِول سیکریٹریٹ کی) بلاخوف نوکری کی تھی اُسی شہرِ سرینگر میں اِس بار میرے وہ ڈھائی مہینے صدیوں کی طرح بلکہ یگوں

یگوں کی طرح گزرے

یہ کیا ہُوا کہ عزمِ سفر لے گئی ہوا
اُڑتے ہوئے پرِندوں کے پر لے گئی ہوا

گُنجان بستیاں سبھی ویران ہو گئیں
ایک ایک اذان اور گجر لے گئی ہوا

بادام و سیب ہو گئے ویران بے طرح
پتّے تمام سارے ثمر لے گئی ہوا

ایک ایک کر کے اپنی جڑوں سے جُدا ہوئے
کیا کیا بلند تھے جو شجر لے گئی ہوا

بیتابؔ مُجھ کو میری فنا کا گلا نہیں
مُجھ سے مِری انا بھی مگر لے گئی ہوا

سرینگر میں ایک پنجابی ادبی تنظیم (پنجابی ساہتیہ سبھا سرینگر) کافی عرصے سے خِدمتِ ادب میں مصرُوف ہے۔ اُس زمانے میں اِس ادبی تنظیم کی ہفتہ وار نشِستیں اکثر سبھا کے صدر جناب ترلوک سِنگھ راہیؔ کے گھر پر ہُوا کرتی تھیں۔ ترلوک سِنگھ راہیؔ پیشے سے ایک زرگر ہیں۔ اُس زمانے تک اُن کی دُکان سرینگر کے (محلّہ امیرا کدل میں) مہاراجہ بازار میں موجود تھی۔ ایک عرصے سے شام کے وقت کئی ادیب دوست اُن کی دوکان پر بیٹھ کر آپس میں حالاتِ حاضرہ اور رفتارِ ادب سے متعلق اکثر گُفتگو کِیا کرتے تھے۔ ایک شام مَیں راہیؔ صاحب کی دُکان پر بیٹھا ہُوا تھا جب اُنہوں نے بتایا کہ اُنہیں بالواسطہ بِلا واسطہ دُکان بند

کرنے کے لِئے مجبُور کِیا جا رہا ہے۔ اِس لِئے اب وہ شاید زیادہ دیر تک اپنی دُکان سرینگر میں جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ مَیں نے کہا سِکھ سردار ہو کر ڈر رہے ہو؟ مَیں نے یہ فِقرہ مذاق مذ اق میں کس دِیا تھا مگر اُنہوں نے سنجیدہ ہو کر بتایا کہ جِس دِن سرینگر میں علیحدگی پسند کشمیری عوام کا مشہور (یو این او آفِس تک) مارچ منعقد ہُوا تھا اُس دِن اُنہوں نے لاکھوں لوگوں کو ایک مشتعل ہجوم کی صورت میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اُس دِن اس طرح محسُوس ہو رہا تھا کہ ساری دھرتی کو اِس ہجُوم نے اپنے سر پر اُٹھا لیا ہے۔

یہ ہجوم ہند مخالف اور نام نہاد آزادیٔ کشمیر کی حمایت میں تھا۔ راہیؔ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ایک جوتے گانٹھنے والا کُچھ مہینے پہلے تک اُن کی دُکان کے باہر بیٹھا کرتا تھا۔ لوگوں کے جوتے پالِش کر کے اور اُن کی مُرمّت کر کے اپنا روزگار چلایا کرتا تھا۔ جب سے اُس کا ایک بیٹا ہتھیار بند اِنتہا پسند بن گیا ہے وہ جوتے پالِش کرنے والا اور گانٹھنے والا علاقے کا ایک بڑا معتبر آدمی بن گیا ہے بلکہ اُس کے سامنے آنے پر بڑی بڑی دُکانوں کے مالکان اُسے فرشی سلام پیش کرتے ہیں۔ راہیؔ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ خُود تو اُس سے نظر ہی نہیں مِلاتے کیونکہ اُن کے جوتے تو وہ اُن کی دوکان سے خود اُٹھا کر لے جایا کرتا تھا اور واپس آ کر اُن کے پاؤں میں پہنا بھی دِیا کرتا تھا۔

سِول سیکریٹیریٹ کے نزدیک ہی سرینگر کے محلّہ بارہ پتھّر میں ایک اور سِکھ زرگر پنجابی شاعر اوتار سِنگھ چندنؔ ایک کِرائے کی چھوٹی سی دُکان میں اپنا روزگار چلاتے تھے۔ دُکان کا مالک ایک کشمیری مُسلم تھا جو دُکان خالی کروانا چاہتا تھا۔ چندنؔ صاحب کا ذریعۂ معاش وہی دُکان تھی جب کُچھ دیر انہوں نے دُکان خالی نہ کی تو ایک دِن کُچھ مُسلح نقاب پوش

اُنہیں اُٹھالے گئے اور کسی خفیہ مقام پر اپنے امیرِ اعلیٰ (Chief Area Commander) کے سامنے پیش کر دِیا۔ امیرِ اعلیٰ نے چندن صاحب کو دیکھا تو خود اپنا نقاب اُتار کر دُور پھینک دِیا اور بولا، ''چندن انکل! آپ! آپ یہاں کیسے؟'' چندن صاحب نے کہا، ''بیٹا آپ کے لوگ ہی اُٹھا لائے ہیں مُجھے، شاید میری دُکان خالی کروانا چاہتے ہیں۔'' امیرِ اعلیٰ نے اپنے ماتحتوں کو ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا، ''حرامزادو! یہ کِسے اُٹھا لائے ہو''؟ یہ تو میرے انکل ہیں۔ انہیں باعزّت واپس چھوڑ آؤ اور خیال رکھو کہ آئندہ اِنہیں کوئی تنگ نہ کرے۔'' چندن صاحب مارے خوف کے کشمیر کو خیر باد کہہ کر جموں چلے آئے اور کچھ دِنوں کے بعد اِس جہانِ فانی کو ہی خیر باد کہہ گئے۔

هم نے جِن کو بیرُونی طاقت سمجھا تھا
هم سے لڑنے والے اپنے بچّے نکلے

کبھی کبھی مَیں سوچتا ہوں کہ کشمیر کی مُسلّح اِنتہا پسندانہ تحریک کہنے کو تو بے شک ہِند مُخالِف اور (نام نہاد) آزادی پسند تحریک تھی لیکن اپنے اصل میں یہ تحریک انقلابِ فرانس اور اِنقلابِ روس کی طرز پر ایک (ناکامیاب) سیاسی سماجی معاشی اِنقلاب کی طرح تھی۔ لڑنے والے لگ بھگ سبھی چھوٹے موٹے کام کاج کرنے والوں اور غریب لوگوں کے بچّے تھے۔ امیر وں اور دوسرے بڑے لوگوں کے بچّے یا تو ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے یا پِھر تعلیم حاصِل کرنے کے بعد بھارت کے بڑے بڑے اداروں میں بھاری بھر کم تنخواہوں پر نوکریاں کر رہے تھے۔ کئی بڑے تاجروں نے تو اپنے بچوں کو کلکتہ، مُمبئی، بنگلور، میسُور، گووا اور کئی دوسرے بھارتی شہروں میں اپنے تجارتی ادارے کھول کر دِئے تھے

جبکہ دُوسروں خاص کر چھوٹے لوگوں کے بچوں کو وہ نام نہاد آزادیٔ کشمیر کی تحریک کے لِئے لڑنے مرنے کی ترغیب دینے میں فخر محسوس کر رہے تھے۔ مَیں اِس سِلسلے میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا حالانکہ بہُت کُچھ جانتا ہُوں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ کشمیر کے کِسی بڑے سیاسی لیڈر، کِسی بڑے افسر یا کِسی بڑے تاجر یا اُن کے بچّوں کو نام نہاد آزادیٔ کشمیر کے لِئے شہید ہوتے ہوئے نہیں پایا گیا جبکہ ہزاروں مسلّح کشمیری نوجوان اِس تحریک میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔

کشمیری پنڈت لوگ یہ اِنتہا پسندی کا ننگا ناچ دیکھ کر گھبرا گئے اور ڈر کے مارے کشمیر سے ایک اور ہجرت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یاد رہے کہ کشمیری پنڈتوں کی کشمیر سے ہجرت کی تاریخ صدیوں پُرانی ہے۔ ہمارے مئی ۱۹۹۱ء تک سرینگر پہنچتے پہنچتے ۹۵ فی صد سے زیادہ کشمیری پنڈت کُنبے اپنی زمینیں جائدادیں گھر گھاٹ نوکری چاکری سب چھوڑ چھاڑ کر جموں کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ کُچھ لوگ بعد میں جموں سے بھی آگے دہلی اور ہندوستان کے کُچھ اور شہروں کے لِئے روانہ ہو گئے۔ کشمیر میں پنڈتوں کے بعد دُوسری بڑی اقلیتی آبادی سِکھوں کی ہے۔ سِکھوں کی گِنتی کشمیر میں شاید دو تین فی صدی سے زیادہ نہیں ہو گی مگر سِکھوں نے اپنی زمینیں، اپنے باغ، اپنے گھر نہیں چھوڑے بلکہ وہ مخالف حالات میں بھی وہاں ڈٹے رہے۔ جواہر نگر (جہاں ہم لوگ رہ رہے تھے) میں بھی کُچھ ایک سِکھ کُنبے طوفان میں بھی اپنا چراغ جلائے ہوئے تھے۔ جواہر نگر کے گوردوارے میں بھی صُبح شام کیرتن پاٹھ ہو رہا تھا۔ حالانکہ شام کا پاٹھ (رہ راس) اپنے وقت سے پہلے ہی مکمّل کر دِیا جاتا کیونکہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے لوگ اپنے اپنے گھروں کے اندر چلے جاتے تھے۔ کشمیر میں سِکھوں نے کوئی بھی گوردوارا بند نہیں ہونے دِیا حالانکہ ہندوؤں کے زیادہ تر مندر اُس طوفانی عہد میں

بند پڑے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دہائی کے پہلے پانچ چھ سالوں میں اقلیتوں پر جو گزر رہی تھی اُس کا بیان وہی کرسکتا ہے جو اُن دِنوں کشمیر میں موجود رہا ہو اور اِتنا ہی نہیں اُس کا اقلیتی فرقوں سے متعلق ہونا بھی ضروری ہے

جب سے تعلقات کے خیمے اُکھڑ گئے
اپنے گھروں میں رہتے ہوئے لوگ اُجڑ گئے

کل تک جو ہجرتوں میں بھی زنجیرِ پا رہی
آج اُس زمیں سے پاؤں ہمارے اُکھڑ گئے

ایک اِک طناب ہم نے کسی حسرتوں سے تھی
آنکھوں کے سامنے سبھی خیمے اُکھڑ گئے

بیتابؔ اپنے اصل میں یہ سارے ایک تھے
اِک دوسرے سے راستے کِتنے بچھڑ گئے۔

کشمیر میں کچھ لیڈر کھُلے بندوں کشمیر کو پاکستان میں شامل کرنے کی بات کرتے ہَیں تو وہیں دُوسرے کئی لیڈر ہیں جو کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان دونوں سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ کُل مِلا کر ۲۰/۲۵ باقاعدہ تنظیمیں ہیں جو کھُلے عام نام نہاد تحریکِ آزادئ کشمیر کی حمایت کرتی ہیں۔ اِس کے عِلاوہ کُچھ خُفیہ تنظیمیں ہیں جو مُسلح تحریک کے ذریعے کشمیر کو بھارت سے الگ کرنا چاہتی ہیں۔ اِن میں بھی کُچھ ایک تنظیمیں کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ہیں جب کہ کچھ دُوسری کشمیر کو ہندوپاک سے الگ رکھنا چاہتی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے وقت انگریز نے پاکستان کی سرحدیں واضح کر

کے لگ بھگ پورے برِ صغیر میں اپنی بندر بانٹ مکمّل کر دی۔ جموں کشمیر کے مہاراجہ ہری سِنگھ کے دِل میں ایک قِسم کا لالچ تھا کہ (شاید) وہ جموں کشمیر کو ہندو پاک سے الگ ایک آزاد ریاست رکھنا چاہتے تھے۔ قبایلیوں کی لوٗٹ کھسوٗٹ اور پاکستانی فوج کی مدد سے اُن کے ریاست کے کافی سارے علاقوں پر قبضہ جما لینے کے بعد مہاراجہ ہری سِنگھ نے ریاست کا بھارت کے ساتھ ایک عارضی اور مشروٗط الحاق پنڈت جواہر لعل نہرو اور شیخ محمد عبداللہ کے دباوٗ میں کر تو دِیا لیکن وہ الحاق آج تک مکمّل اور حتمی نہ ہو سکا۔ ایک دُنیا جانتی ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے یو۔ این۔ او میں حالات ٹھیک (Normal) ہونے پر ریاست میں حتمی فیصلے کی غرض سے رائے شماری کروانے کی بات کہی تھی۔ یہی نہیں آئینِ ہند میں دفعہ ۳۷۰ کے ذریعے ریاست جموں و کشمیر کو پنڈت نہرو کے عہدِ حکومت میں ہی ایک خصوصی ریاست کا درجہ دِیا گیا۔ معاملہ یہیں تک رہتا تو بھی کوئی بات نہیں تھی مگر بھارت میں پنڈت نہرو حکومت میں ہی ریاست جموں و کشمیر کے لِئے ایک الگ آئین (Constitution) تیار کِیا گیا اور لاگوٗ کِیا گیا جِس کے تحت ریاست میں سِول سیکریٹیریٹ پر ایک طرف بھارت کا ترنگا جھنڈا (پرچم) لہراتا ہے تو دوسری طرف ریاست کا الگ پرچم بھی لہراتا ہے۔

مہاراجہ ہری سِنگھ پنڈت نہرو اور شیخ محمد عبداللہ نے بھارت کے ساتھ ایک لنگڑا الحاق کر کے اس ریاستی مسئلے کو قومی اور پھر بین الاقوامی مسئلہ بنانے میں اپنا بھرپور تعاون دِیا جسے آج دُنیا مسئلۂ کشمیر کہتی ہے۔ کشمیر کے لوگ تو خاص طور سے شیخ محمد عبداللہ کو ہی اِن تمام بگڑے ہوئے حالات کے لِئے ذِمہ وار مانتے ہیں۔ مُجھے یاد ہے میرے ایک کشمیری مُسلم واقِف کار کے بچّے کو جب پولِیس اِنتہا پسندوں کے ساتھ تعلق ہونے کے شُبے میں پکڑ کر لے گئی تو اُس نے اپنے گھر میں لگ بھگ گالیاں نکالتے ہوئے کہا تھا، ’’بُرا ہو اِس شیخ عبداللہ کا

جِس نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا، نہ ہمیں آزادی مِلی نہ ہم پوری طرح ہندوستانی ہی بن سکے۔ اگر اِس نے ہمیں ایک بار کہہ دِیا ہوتا کہ ہمیں ہندوستان میں ہی رہنا ہے تو ہم لوگ آج پوری طرح سے ہندوستانی تو بن گئے ہوتے۔

واپس بھی آسمان سے آنا پڑا ہمیں
یہ بھی ہؤا کہ پاؤں زمیں سے اُکھڑ گئے
کھودی تھیں ہم نے اپنی روایات کے لِئے
یہ کیا ہؤا کہ ہم اِنہی قبروں میں گڑ گئے

الگاؤ پسند یہ دلیل دیتے ہوئے نہیں تھکتے کہ جِس ریاست کا اپنا الگ آئین ہو، اپنا الگ جھنڈا ہو وہ بھارت کا اٹوٹ حِصّہ کیسے ہوسکتی ہے؟ لہٰذا کشمیر پر بھارت کا قبضہ ناجائز ہے اور کہ مسئلہ کشمیر کا حل ابھی باقی ہے۔

۱۹۹۱ء میں میرے سرینگر قیام کے دوران نام نہاد تحریک آزادیٔ کشمیر اپنے عرُوج پر تھی اور معاشرے کے دُوسرے تیسرے درجے (معاشی طور پر) کے عوام کو لگتا تھا کہ جلد ہی بھارت کی فوجیں کشمیر چھوڑ دیں گی اور کشمیر آزاد ہو جائے گا۔

بڑے بڑے لوگوں کے بچّے تو اچھے اچھے محفوظ کھیل کے میدانوں کا استعمال کرتے تھے لیکن چھوٹے لوگوں کے بچّے اکثر خالی سڑکوں پر کرِکٹ وغیرہ کھیل کر اپنا شوق پورا کرتے تھے۔ اُن دِنوں سڑکوں پر بچّوں کی ایک کرِکٹ ٹیم بھارت کی بنائی جاتی اور دوسری پاکستان کی۔ پاکستان کی ٹیم اگر بلّے بازی کر رہی ہوتی تو بھارتی ٹیم کے گیند باز اکثر کمزور گیند پھینکتے تا کہ بلّے باز آسانی سے چوکا چھکّا لگا سکیں۔ گیند اگر پکڑی جا سکنے والی بھی ہوتی تو بھارتی ٹیم

کے فیلڈر اُسے چھوڑ دیتے بلکہ ہاتھ مار کر باؤنڈری پار کروا دیتے۔ لہٰذا پاکستانی بلّے باز کا چوکا لگ جاتا۔ اگر بھارتی ٹیم بلّے بازی کر رہی ہوتی تو بلّے باز اکثر کوشش کر کے رن آؤٹ یا ایل بی۔ ڈبلیو (.L.B.W) ہو جاتے۔ یہ جذبہ ننھّے بچوں میں بھی موجود تھا۔

اُن دِنوں محمود الرحمٰن ریاست کے گھریلو معاملات کے سیکریٹری (Home Secretary) تھے۔ رحمٰن صاحب ادب کا اچھا خاصا ذوق رکھتے ہیں اور رشتے میں میرے دوست آصف نعیم کے ماموں ہوتے ہیں۔ آصف نعیم کافی دِنوں تک کشمیر یونیورسٹی میں فارسی کے اُستاد رہے ہیں۔ اُن دِنوں دو ایک بار میرا رحمٰن صاحب کی سرکاری رہائش گاہ میں جانا ہوا۔ اُن دِنوں وہاں کئی لوگ انتہا پسندانہ معاملات میں پکڑے گئے اپنے بچّوں کو چھڑوانے کے لِئے عرضیاں لے کر آیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کا اکثر یہ دعویٰ ہوتا کہ پولس معصوم بچوں کو خواہ مخواہ اِنتہا پسندی کے جُرم میں گرفتار کر لیتی ہے۔ جن بچوں کے ماں باپ دو دو تین تین لاکھ روپیہ دے سکتے ہیں اُن کو چھوڑ دِیا جاتا ہے۔ باقی بچوں کو یا تو نقلی مقابلوں میں مار دِیا جاتا ہے یا پھر تیسرے درجے (Third degree torture) کی مار کھائے ہوئے وہ بچے اکثر سرحد پار چلے جاتے ہیں اور بدلہ لینے کی غرض سے مصلّح جنگجو اِنتہا پسند بن جاتے ہیں۔

اچھے اچھے سیاسی لیڈروں نے اپنی اپنی سیاسی تنظیموں سے اِنتہا پسندوں کے ڈر سے اِستعیفا دے رکھا تھا اور اِن اِستعیفوں سے متعلق اِشتہارات اُن دِنوں کشمیر کے مقامی اخبارات میں عام طور پر دیکھنے کو مِل جاتے تھے۔ انتہا پسند تنظیمیں اُن دِنوں سیاسی تنظیموں کو تحریک مخالف گردانتی تھیں مگر سیاسی تنظیموں کے اِستعیفے دِئے ہوئے لیڈر بھی معصوم بچّوں کو چھڑوانے کے لِئے سِفارش کرنا اور اُس کے عوِض میں پیسہ لینا نہیں بھولتے تھے۔ کئی ایک

لیڈروں نے اِس کام میں خوب پیسہ کمایا۔ اِس کے عِلاوہ کُچھ ایک سرکاری افسروں نے بھی اپنے اپنے محکموں میں اِنتہاپسندی کی آڑ میں اچھی خاصی لوٗٹ کھسوٗٹ مچائی۔

☆☆☆

باب - ۱۰

وہ ۱۷یا ۱۸ جولائی ۱۹۹۱ء کی صُبح تھی جب چھ بجے کے قریب مَیں نے انُو اور دو سال کی چوُچوُ کو اپنی سیکنڈ ہینڈ فئیٹ کار میں ضروری ساز و سامان کے ساتھ سوار کِیا اور خود گاڑی چلاتے ہوئے جموں کے لِئے روانہ ہو گیا۔ میرے جموں آ جانے کے پندرہ دِن بعد جس سرکاری گاڑی میں مَیں دفتر جایا کرتا تھا اُسی گاڑی میں گھر سے دفتر جانے کے لِئے ابھی ابھی سوار ہوئے جوائِنٹ ڈائریکٹر اِنفارمیشن سیّد صاحب کو مسلّح نوجوان گاڑی سمیت اپنے ساتھ لے گئے اور کُچھ دِن بعد اُن کی لاش ایک سڑک پر پھینک کر آگے بڑھ گئے۔

آج (۲۰۱۱ء میں) میری بیٹی روچیکا (چوُچوُ) ۲۲ سال کی ہے اور اُسے وہ سب یاد نہیں جو اُس نے ڈیڑھ دو سال کی عُمر میں سرینگر میں دیکھا تھا۔ آج مَیں اُسے وہ زمانہ یاد کرواتا ہوں تو وہ کہتی ہے ''پاپا مُجھے کُچھ یاد نہیں بلکہ مَیں حیران ہوں کہ کیا واقعی مَیں اِن سب باتوں کی گواہ رہی ہوں''۔

سرینگر جموں شاہراہ پر موجود قریب قریب دو کلو میٹر لمبی جواہر ٹنل نام کی سُرنگ پار کرتے ہی ریاست کا صوبہ جموں شروع ہو جاتا ہے۔ سُرنگ سے باہر آتے ہی مَیں نے خُدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کِیا اور ایک لمبی سانس لی۔ ٹنل کے اِس پار ہوا مسموُم تھی نہ فضا نفرت آمیز۔ صوبہ جموں میں ہندو مُسلم سِکھ عیسائی خوشی خوشی اِکٹھے رہتے چلے آ رہے ہیں۔

بٹوت کے صحت افزا مقام سے آگے پٹنی ٹاپ نام کے مشہور زمانہ خوبصورت پہاڑی

مقام پر ہم دو ایک گھنٹے رُکے۔ خود کھانا کھایا چؤ چؤ کو دودھ پلایا اور اپنی سیکنڈ ہینڈ فئیٹ کار کو پانی
۔ اپنی اُس گاڑی کے بعد مَیں نے کئی کئی گاڑیاں بدلی ہیں لیکن جِن نامناسب حالات میں اُس
پُرانی فئیٹ کار نے میرا ساتھ دِیا مَیں اُس کے لِئے اُس کا احسان جنموں جنموں تک نہیں بھُلا
سکتا۔ وہ پُرانی سفید فئیٹ کار معلوم نہیں کہاں ہوگی کہیں ہوگی بھی یا نہیں لیکن وہ میرے دِل
میں آج بھی زِندہ ہے۔ کل بھی زِندہ رہے گی۔ اِس کے عِلاوہ میری Colleague نسیم
(لنکر) نے اُس نفرت آمیز ماحول میں بھی جِس طرح سے میرا اور میرے اہل وعیال کا خاص
خیال رکھّا وہ بھی کوئی معمُولی اور آسان کام نہیں تھا۔ نسیم کے والِد اور اُس کے مائکے میں
دوسرے کئی رِشتہ دار ایسے ہیں جو نسیم کی طرح ہی بڑے اور نیک دِلوں کے مالِک ہیں۔ شاید
ایسے ہی کُچھ لوگ رہے ہونگے جِن سے متعلق مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ء کی مارکاٹ کے
دوران کہا تھا ''مُجھے کشمیر میں روشنی کی کِرن نظر آتی ہے''۔

پروجیکٹ آفیسر رورل ڈیولپمنٹ ایجنسی کمانڈ ایریا جموں کے طور پر مجھے ضِلع جموں
کے وِجے پور اور سانبہ بلاک اور ضِلع کٹھوعہ کے ہیر انگر، گھگھوال، برنوٹی اور کٹھوعہ بلاک
دیکھنے تھے۔ میرا کام اِن دیہی عِلاقوں میں غریبی کی سطح سے نیچے رہ رہے لوگوں کے لِئے چھوٹی
چھوٹی ترقیّاتی سکیموں کو چلانا اور اُن کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اِس دَوران مَیں نے اِن دیہی
عِلاقوں کا کئی کئی بار دورہ کِیا۔ کئی کنڈی عِلاقوں میں موٹر پمپ لگوا کر چھوٹے کِسانوں کی
خُشک زمینوں کو آبی زمینوں میں تبدیل کِیا۔ کئی ایک بہُت ہی غریب کُنبوں کو قوانین وضوابط
کے تحت گائے بھینس اور دُوسرے جانور دِلوا کر اُن کی حالت بہتر کرنے کی حتّی الوسع کوشش
کی۔

میری ڈھائی سال کی اِس دیہی ترقیاتی تقرّری کے دَوران میرے اُوپر دو افسر رہے جو ڈائیریکٹر کمانڈ ائیریا بھی تھے اور میری ایجنسی کے چئیر مَین بھی۔ دونوں حضرات میرے کام سے بہُت خوش تھے اور میرے ذاتی تعلّقات بھی اُن سے بہُت اچھے تھے۔ لیکن جہاں سردار دلیپ سِنگھ جی نے میری خُفیہ رِپورٹ میری قابلیت اور کارکردگی سے زیادہ اچھی لِکھّی وہیں سوم ناتھ شرما صاحب نے میری خُفیہ رِپورٹ میری قابلیت اور کارکردگی سے بہت کم اچھی لِکھّی۔ یہ بات مَیں بہُت سوچ وِچار کے بعد لِکھ رہا ہُوں۔ آخر سچّائی کو کہاں تک چھپاؤں؟

ڈورایا دوڑا نام کا جموں کے سانبہ بلاک کا ایک گاؤں مُجھے آج بھی یاد آتا ہے جہاں میری ایجنسی کی قائم کردہ کُچھ ایک ہتھ کھڈّیاں بڑی کامیابی سے چل رہی تھیں۔ اُس گاؤں کے مرد جہاں کھیت کھلیانوں میں کام کرتے تھے وہیں عورتیں دِن بھر اُن کھڈّیوں پر بڑے خوبصورت گرم شال بُنا کرتی تھیں۔ اِس مناسبت سے اُس گاؤں کا نام ہی عُرفِ عام میں Handloom village پڑ چُکا تھا۔ وہ گاؤں اب بھی میرے خوابوں کی زینت بنتا ہے۔

اِسی طرح ایجنسی کی مدد سے لگائے گئے موٹر پمپوں کے ذریعے زمین کے دُوراندر سے پانی نِکلتے ہوئے اور خُشک زمینوں کو آبی زمینیں بنتے ہوئے دیکھ کر میرے دِل میں ایک عجیب سی خوشی پیدا ہوتی تھی۔ میرے کئی خوابوں میں آج بھی میرے سامنے اکثر وہ موٹر پمپ آجاتے ہیں جن سے بڑی تیز رفتار میں ٹھاٹھیں مارتا ہُوا پانی نِکل رہا ہوتا ہے۔ ایجنسی میں پروجیکٹ افسر کے ماتحت تین Asstt. Project Officer ہوتے تھے۔ ایک کھیتی

باڑی سے متعلق معاملات کی دیکھ ریکھ کرتا تھا۔ ایک جانوروں کی خرید اور اُن سے متعلق قائم شُدہ اِکائیوں (units) کو دیکھتا تھا جبکہ تیسرا .A.P.O باقی ماندہ اِکائیوں اور دفتری معاملات (Administrative issues) کا خیال رکھتا تھا۔ اِس تیسری نوعیت کا ایک .A.P.O تھا جس کا نام مسٹر کھجوریہ تھا۔

یہاں یہ بتانا غیر اہم نہ ہوگا کہ میرے والد کے دو ماموں تھے۔ دونوں غیر سِکھ (ہندو) تھے۔ باؤجی بتایا کرتے تھے کہ پُونچھ کے شاہی قِلعے کی باہری سڑک سے (۱۹۴۷ء سے پہلے) جن دو چار لوگوں کو گھوڑے پر سوار ہو کر گزرنے کی اِجازت مِلی ہوئی تھی اُن میں اُن کے ماموں امی چند کھجُوریہ بھی تھے جو راجا پُونچھ کی حکومت میں ایک عُہدے دار ہُوا کرتے تھے۔ باؤجی کے ماموں زاد بھائیوں میں ایک تو پُونچھ کے پنڈت چُونی لعل تھے اور دُوسرے شمبھو ناتھ کھجُوریہ پُونچھ میں محکمہ تعلیم کے افسر رہے ہیں۔ شمبھو ناتھ کھجُوریہ پُونچھ کے (شائید) اکلوتے اَیسے آدمی ہیں جنہیں اپنی سماجی خِدمات کے عِوض میں بھارت سرکار نے پدم شری کا اعزاز دِیا ہے۔ شمبھو ناتھ کھجوریہ بے شک رِشتے میں میرے چچا ہوتے ہیں لیکن وہ میرے بہترین دوستوں میں شامِل ہیں۔ پُونچھ میں باؤجی کے ایک اور ماموں زاد بھائی رہتے ہیں جن کا نام اِس وقت مُجھے یاد نہیں آ رہا۔ البتہ اِن لوگوں کے حوالے سے میرے دِل میں پُونچھ کی ہندُو برہمن برادری کے لِئے ایک خاص قِسم کی رغبت ہمیشہ سے رہی ہے بلکہ اِس تعلق سے مُجھے ہند دیومالا سے بھی ایک خاص قِسم کا اساطیری لگاؤ / جڑاؤ رہا ہے۔

پنجاب کی سِکھ اِنتہا پسندی کا اثر جموں کشمیر کے کچھ حلقوں پر بھی تھا۔ اُس زمانے میں میرے ایک دوست اور پنجابی کے پروفیسر مِسٹر کھجوریہ (جو اپنے مذہب کے اصولوں پر

صِدق دِلی سے چلتے تھے اور سِکھ ہونے کے باوجود اپنے نام کے آگے کھجوریہ لکھنا کبھی نہیں بھُولتے تھے) پنجاب کی سِکھ اِنتہا پسندی سے تعلقات ہونے کے جُرم میں اپنی سرکاری نوکری سے معطّل ہو چکے تھے۔ کافی عرصے سے وہ پولیس کے اعلیٰ افسروں کے دفتروں میں چکّر کاٹ رہے تھے لیکن کوئی اُن کے معاملے میں ہمدردانہ رویّہ نہیں رکھتا تھا۔ ایک دِن اچانک پروفیسر کھجوریہ مُجھ سے ملے اور کہا کہ وہ نوکری پر بحال ہو چکے ہیں۔ مَیں نے اُنہیں مبارک باد دی اور پوچھا کہ اِتنا بڑا کام ہوا کیسے؟ اُنہوں نے بتایا کہ ریاست میں پولیس کے ایک بڑے عُہدے پر مِسٹر کھجوریہ کی تعیناتی ہونے پر اُنہوں نے اپنے دفتر میں پروفیسر کھجوریہ کی فائل دیکھی تو اُنہیں اپنے دفتر میں بُلوا بھیجا تھا۔ بس پھِر کیا تھا کھجوریہ سے کھجُوریہ مِلے کر کر لمبے ہاتھ......... "۔ اپنی ایک نظم منُو کون تھا"؟ یاد آ رہی ہے

منُو کون تھا؟ میرا کوئی باپ دادا\
یا شاید اُن کا بھی کوئی دادا پردادا\
معلوم نہیں وہ کوئی تھا بھی یا نہیں\
لیکن اُس کی کہی ہوئی چند باتیں\
یُگوں یُگوں سے دوہرائی جا رہی ہیں\
اِنہی سُنی سُنائی باتوں نے مُجھے برہمن بنا دِیا\
اور دُوسروں کو کشتری ویَش بلکہ شُودر تک بنا دِیا\
معلوم نہیں منُو نے اِس سب کی بنیاد ڈالی بھی تھی یا نہیں\
لیکن میرے اندر کا برہمن نسل در نسل برہمن ہی رہا\
اپنے اندر کے برہمن سے پیچھا چھڑانے کے لِئے

مَیں نے بُدھ مذہب اِختیار کیا کبھی اِسلام قبول کیا
کبھی مَیں عیسائی بنا تو کبھی سِکھ مذہب اپنایا
مگر افسوس کہ میرے اندر کا برہمن بدستور برہمن ہی رہا
جو اپنے آپ کو کشتری ویش اور شوُدر سے
بہتر مخلوُق سمجھتا رہا
منو کوئی تھا یا نہیں
لیکن میرے اندر کا برہمن خود منو ہے
جو اپنی سمرتیوں کو یگوں یگوں سے
دُہراتا چلا آرہا ہے
مَیں بُدھ مسلم عیسائی اور سِکھ تک بن کر بھی
اپنی سمرتیوں سے پیچھا نہ چھُڑا سکا
بلکہ اپنی اِن زنجیروں کو اپنے قیمتی گہنے سمجھ کر
ہمیشہ اِن پر فخر کرتا رہا ہوں

سِکھوں کے دسویں گورُو گورُو گوبند سِنگھ صاحب نے ۱۶۹۹ء کی بیساکھی کے دِن جب پانچ الگ الگ ذاتوں (Castes) سے اور ہندوستان کے پانچ الگ الگ عِلاقوں سے پانچ پیاروں کا اِنتخاب کیا تو یہ اعلان کیا کہ آج کے بعد سِکھ کی ذات ''خالصہ'' ہوگی۔ اُس کی اور کوئی ذات نہیں ہوگی۔ افسوس کہ آج بھی ہم سِکھ لوگ اپنے اپنے نام کے آگے سیٹھی، ساہنی، کھورانہ، رَینہ، بخشی، بادل، گِل، سِدھوُ، سندھوُ، گریوال وغیرہ وغیرہ لکھنا نہیں بھولتے۔ ہم لوگ سِکھ ہوتے ہوئے بھی اندر اندر اپنے برہمن، کھتری، جٹّ (جاٹ) وغیرہ

ہونے پر بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ عام طور پر نام نہاد اونچی ذات کے سِکھ نام نہاد (نسبتاً) نیچی ذات کے سکھوں کے ساتھ بیٹی بیاہنا تو دُور بیٹا بیاہنا بھی پسند نہیں کرتے۔ جب کہ گورو نانک نے کہا تھا ''نیچاں اندر نیچ ذات، نیچی ہُوں ات نیچ / نانک تِن کے سنگ ساتھ، وڈیاں سیؤں کیا ریس''، مَیں نے بچپن میں کوئی ہندی فِلم دیکھی تھی جس میں ایک لڑکی کی ماں گجراتی اور باپ مراٹھی تھا۔ ماں لڑکی کی شادی کِسی گجراتی لڑکے کے ساتھ کروانا چاہتی تھی جب کہ باپ اُس کی شادی کِسی مراٹھا لڑکے سے کروانا چاہتا تھا۔ اُس زمانے کا مشہُور مزاحیہ فن کار محمُود جو اُس فِلم میں اُس لڑکی سے محبت کرتا ہے ایک سِکھ سردار کا رُوپ اِختیار کر لیتا ہے اور لڑکی کی ماں سے کہتا ہے ''مَیں باہر سے پکّا سردار ہوں مگر اندر سے پکّا گُجراتی ہوں''۔ لڑکی کے باپ کے پاس جا کر وہ اُسے کہتا ہے، ''مَیں باہر سے پکّا سردار ہوں لیکن اندر سے پکّا مراٹھا ہوں۔'' آج اکثر و بیشتر ہم (سِکھ) لوگوں کی حقیقت لگ بھگ یہی ہے۔ باہر سے ہم پکّے سِکھ سردار ہیں اندر سے پکّے برہمن کھتری ویش یا شوُدر۔

رورل ڈیویلپمنٹ ایجنسی میں ڈھائی سال نوکری کرنے کے بعد میرا تبادلہ ایک بار پھِر سیلز ٹیکس ڈیپارٹمنٹ جموں میں ہو گیا۔ اِس بار میری تعیناتی ڈِپٹی کمِشنر اپیلز (D.C. Appeals) کے طور پر ہوئی تھی۔ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن افسروں کے Assessing Authorities کے طور پر کِئے گئے فیصلوں کے خِلاف اپیل سُننا میرا کام تھا۔ میری پوسٹ ایک Appelate Authority کی تھی۔ وُکلا کے ذریعے اپیل کرنے والوں کے معاملات میرے سامنے پیش کِئے جاتے۔ میرا یعنی D.C.Appeals کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلہ ہوتا۔ اِس لِئے اِس کے خِلاف یا تو کمِشنر سیلز ٹیکس کی عدالت میں سُنوائی ممکن تھی یا پھِر ہائی کورٹ میں۔ سیلز ٹیکس کے وُکلا اِنکم ٹیکس کے بھی وکیل ہوتے ہیں۔ کئی وُکلا حضرات تو

میرے ایل۔ ایل۔ بی کے ہم جماعتی بھی تھے۔

میرا دفتر پھر ایک بار اُسی لمحہ لمحہ ،گرتی ہوُئی عمارت میں تھا جہاں مَیں پہلے بھی ڈپٹی کِمشنر سیلز ٹیکس کے طور پر کام کر چُکا تھا۔ اِس بار میرا کمرہ اُس عمارت کے عَین سامنے تھا، جس میں مَیں ڈپٹی کِمشنر سیلز ٹیکس کی اپنی پہلی تعیناتی کے دَوران بیٹھا کرتا تھا۔ اب اُس عمارت کی چھت سے میری آنکھوں کے سامنے تھوڑے عرصے کے بعد کوئی نہ کوئی اینٹ نیچے ،گر جاتی اور کبھی کبھار ،کسی راہگیر کے سر پر آن ،گرتی۔

سُنا ہے کہ زیادہ تر سرکاری دفاتر اب وہاں سے کہیں اور منتقِل ہو چُکے ہیں لیکن یہ بھی سُنا ہے کہ کئی دفاتر ابھی تک اُسی لمحہ لمحہ ،گرتی ہوُئی عمارت میں ہی کام کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی سُنا ہے کہ جہاں پہلے ایک ایک اینٹ ،گرتی تھی وہاں اب دو دو تین تین اینٹیں اِکٹھی ،گرنے لگی ہیں۔ شاید یہ ریاست جموں و کشمیر کی سیاسی سماجی حالت کی علامتی تصویر ہے۔

ایک دِن مَیں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ جب اچانک پنڈت ترلوچن دت میرے سامنے آ کے بیٹھ گئے۔ پنڈت ترلوچن دت ایک زمانے میں ریاست کے وزیرِ مال تھے اور حکوُمت میں اُن کا بڑا دبدبہ تھا۔ رُعب دار شخصیت، اُونچی لمبی قد کاٹھی کے پنڈت جی بڑے تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ مُجھے یاد ہے جب جموں میں ۱۹۴۷ء میں پاکستانی کشمیر سے آئے ہوُئے مہاجروں نے (جن میں زیادہ تر سِکھ اور تھوڑے سے ہندو بھی تھے) اپنی الاٹ شُدہ زمینوں میں ۱۹۷۰ء کے آس پاس نانک نگر نام کی ایک رہائشی بستی بسانی شروُع کی تھی تو پنڈت جی نے وزیرِ مال کی حیثیت میں اِس کالونی کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کی تھی۔ میرے والدین نے بھی اُس بستی میں ایک پلاٹ لے کر ایک چھوٹا سا (جو اب تک کافی بڑا ہو چُکا

ہے) رہائشی مکان تعمیر کروایا تھا۔ نانک نگر کے کچھ تعمیر شُدہ مکانوں پر بلڈوزر تک چلوانے کی کوشش کی گئی۔ نانک نگر نام کی بستی تو بُلڈوزروں سے بچ گئی مگر سیاسی اکھاڑے کے champion unbeaten پنڈت ترلوچن دت آگے چل کر اسمبلی کی الیکشن ہار گئے اور اُن کے سیاسی کیریئر کا گراف بتدریج اوُپر سے نیچے آنے لگا۔ یہی نہیں اُن کو بیوپار میں بھی مسلسل گھاٹے کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دِن وہ بھی آگیا جب اُنہیں اُس شخص کے سامنے آکر اپنے سیلز ٹیکس کا کیس خود پیش کرنا پڑا جو اپنے لڑکپن میں نانک نگر نام کی بستی کو گرانے کے لِئے بھیجے گئے سرکاری بلڈوزروں کے سامنے زِندہ باد مُردہ باد کِیا کرتا تھا۔

پنڈت جی کی حالت اِتنی خراب دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُن کی صحت بہُت کمزور ہو چُکی تھی اور رنگ بھی کافی حد تک کالا پڑ چُکا تھا۔ میرے دِل میں اُن کے لِئے بچپن کے زمانے سے بھرا ہوُا سارا غُصّہ کافُور ہو گیا۔ مَیں نے اُنہیں اپنے ساتھ والی کُرسی پر بٹھایا اور پورے احترام سے اُن کے معاملے کی سُنوائی کی۔ یہ واقعہ اُسی شِکستہ خستہ محل نُما عمارت میں رُونما ہوُا جِس کی دیواریں چھتیں کھڑ کِیاں اور جِس کے گلیارے لمحہ لمحہ الوپ ہوتی ہوئی ایک شاہانہ تہذیب کے نوحے پڑھ رہے تھے

بیتاب صاحب! ذرا ذرا سی بات پر
چراغ کو رگڑتے ہو جِنّ کو بُلاتے ہو
اور حُکم دیتے ہو
ایک ایک اشارے سے
دُنیا جہان کی نعمتیں پاتے ہو

لیکن اِس عالم میں بھی اِتنا تو ہے یاد

کہ جن تو ہے اُسی کا غلام

چراغ ہے جس کے پاس

اور چراغ کی تو روایت ہی یہ ہے

کہ آج اِس کے پاس تو کل اُس کے پاس

ارے جب حیات ہی محدُود ہے

تو چراغ کی پاسداری لامحدُود کیسے ہوسکتی ہے۔ (نظم۔ یادِ جنگل میں راستہ رکھیئے)

اُسی عمارت میں جہاں راجاؤں مہاراجاؤں کی کہانیوں کے نشانات الوپ ہو رہے تھے وہیں میری خوبصورت دوست آشا شرمانے (جس کی مُجھ سے دوستی جے ڈی اے کے زمانے میں ایک جھگڑے سے شرُوع ہوئی تھی اور جو اُسی علاقے کے ایک محلّے میں رہتی تھی) کبھی کبھی دوپہر کے وقت میرے لِئے اپنے ہاتھوں سے پکایا ہوُا کھانا لانا شرُوع کر دِیا۔ آشا کا گھر میرے دفتر کے ساتھ لگتے محلّے میں واقع تھا۔ دوپہر کی Lunch break میں ہم دونوں وہ کھانا اکثر اُس پُرانے تہذیب محل کی بڑی بڑی کھُلی اور چوڑی کھڑکیوں میں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے جہاں شاید کِسی زمانے میں راجا مہاراجہ لوگ اپنی رانیوں مہارانیوں اور گولیوں کے ساتھ بیٹھ کر راج لیلا رچاتے رہے ہونگے۔

دوسروں نے سُنائے جب ہم کو

اپنے حالات بھی فسانے لگے

سیلز ٹیکس میں ڈِپٹی کمِشنر اپیلز کی پوسٹ جموں کے لِئے الگ ہے اور کشمیر کے لِئے

الگ لیکن سرکار اگر چاہے تو کسی خاص وجہ سے جموں کا کوئی کیس صوبہ کشمیر یا صوبہ کشمیر کا کوئی کیس صوبہ جموں کی عدالت میں مُنتقِل کر سکتی ہے۔ اِسی سِلسلے میں کشمیر کے ایک بڑے سیاسی لیڈر اور بڑے تاجر کا کیس میری عدالت میں کشمیر سے مُنتقِل ہو کر آیا۔ کیس کے وکیل میرے ایک دوست تھے۔ مَیں نے جب پوچھا کہ یہ کیس کشمیر میں کیوں نہیں پیش کِیا گیا تو اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے موکّل کیونکہ ایک سیاسی رہنما ہیں۔ اِس لِئے اُن کو کشمیر میں ہر دم اِنتہا پسندوں سے خطرہ رہتا ہے۔ لٰہذا یہ کیس جموں میں پیش کِیا گیا ہے۔ دراصل اُن کے موکّل کا کروڑوں روپے کا ٹیکس کا بقایا واجب الادا تھا جسے وہ سرکاری خزانے میں جمع نہیں کروا رہے تھے بلکہ تخمینے (Assesement) کے خِلاف اپیل کر کے وقت نِکال رہے تھے۔ وہ وکیل صاحب جب بھی عدالت میں مِرے سامنے پیش ہوئے اگلی شُنوائی کے لِئے لمبی تاریخ مانگتے۔ دو ایک تاریخیں دے دینے کے بعد مَیں نے آئندہ کوئی بھی لمبی تاریخ دینے سے منع کر دِیا۔ اُنہوں نے دلیل دی کہ اُن کا موکّل چونکہ ایک سیاسی لیڈر ہے وہ اِنتہا پسندوں کے ڈر سے عدالت کے سامنے نہیں آ سکتا۔ مَیں نے کہا کہ اِسی دلیل کی بِنا پر تو کیس کشمیر سے جموں مُنتقل کِیا گیا ہے۔ اب اُن کے جموں آ کر پیش ہونے میں کیا جھجک ہے۔

میرے کِمشنر صاحب نے مُجھے اپنے کمرے میں بُلا کر کہا کہ اُس عہد کے حاکمِ اعلیٰ نے اِس کیس میں لمبی تاریخ کی سِفارش کی ہے۔ مُجھے نہیں معلوم کہ حاکمِ اعلیٰ نے واقعی ایسی کوئی سِفارش کی تھی یا نہیں لیکن اِتنا ضرور ہوُا کہ میرے سِفارش نہ ماننے پر ڈِپٹی کِمشنر اپیلز کی پوسٹ سے ہٹا کر مُجھے ڈِپٹی کِمشنر آڈِٹ بنا دِیا گیا۔

اُنہی دِنوں میرے کُچھ ساتھیوں سمیت مجھے ایک اور ترقّی مِلی اور مَیں کشمیر

ایڈمنسٹریٹو سروس کے سلیکشن سکیل میں آ گیا یعنی اب میری حیثیت ڈپٹی سیکریٹری سے بڑھ کر

ایڈیشنل سیکریٹری کی ہو چکی تھی۔ عین اُسی زمانے میں ہمارے چھنّی ہمت کالونی والے مکان کی پہلی منزل تیار ہو چکی تھی اور ہم لوگ گاندھی نگر کا گورنمنٹ کوارٹر چھوڑ کر اپنے نو تعمیر شدہ مکان میں منتقل ہو گئے۔ گاندھی نگر کے گورنمنٹ کوارٹر میں ہم لوگ بارہ سال رہے تھے۔ اُس گورنمنٹ کوارٹر نے ہماری مالی حالت کو کمزور سے پل پل مضبوط ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ گاندھی نگر کا وہ کوارٹر میری ادبی ترقی کے بہترین دنوں کا گواہ بھی رہا ہے۔ میرے ساتھ والے کوارٹر میں حکیم منظور رہتے تھے۔ تھوڑی دوری پر جہاں ایک طرف جگن ناتھ آزاد صاحب رہتے تھے تو دوسری طرف عابد مناوری نام کے ایک مقامی سطح کے اُردو شاعر۔ ہم لوگوں کی شامیں اکثر شعری و ادبی شامیں ہوا کرتی تھیں۔ آزاد صاحب کے اندر شعر و ادب کے علاوہ دانشوری کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ چھپا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وجد میں آ کر وہ اپنے خزانے کا مُنہ کھولتے تو ایسی ایسی علم و دانش کی باتیں بتاتے جن کا سُننا کسی بھی دانشور کے لئے خوش بختی کے مترادف ہے۔

۲۸ جون ۱۹۸۹ کے دن گاندھی نگر کے اُسی گورنمنٹ کوارٹر میں ہماری بیٹی چوچو (روچکا) دُنیا بھر کے خزانے لے کر ہمارے گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ چوچو کے آتے ہی ہماری مالی حالت بہتر سے بہتر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ مَیں تو اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ چوچو اپنے ساتھ ہماری خوشحالی لے کر آئی تھی۔ گاندھی نگر کے اُسی کوارٹر کی دیواروں پر خاص طور سے باہر کی دیواروں پر چوچو اپنا سکول کا ہوم ورک کیا کرتی تھی۔ مَیں نے اپنے مجموعے ''خود رنگ'' میں شامل اپنی مندرجہ ذیل نظم ''اپنا اپنا کینواس'' اُسی زمانے میں تخلیق کی تھی۔

نرسری کلاس میں پڑھنے والی میری ننھی بیٹی

نوٹ بُک کے بجائے دیواروں پر

ہوم ورک کرنا زیادہ پسند کرتی ہے

مَیں ڈانٹ ڈپٹ کر کے نوٹ بُک پر

اُس سے ہوم ورک تو کروا لیتا ہوں

لیکن دیواروں پر ہوم ورک کرنے

عجیب و غریب تصویریں بنانے

اور نہ جانے کیا کیا لِکھنے سے

اُسے روک نہیں سکتا

یعنی جِتنا مَیں اُسے

نوٹ بُکس میں سمیٹنا چاہتا ہوں

اُتنی وہ

دیواروں پر پھیلتی جا رہی ہے۔

اُنہی دِنوں کی بات ہے ہم لوگ اَپنے دوستوں کے ساتھ جموں کے امر سِنگھ کلب میں رات کے کھانے پر گئے ہُوئے تھے۔ تین چار سال کی چُوچُو کو اُس کی ایک ننھی سہیلی کے ساتھ ۲۰ رُوپے دے کر مَیں نے آلُو chips کے دو پیکٹ لے کر کھانے کے لِئے بھیجا۔ تھوڑی دیر میں چُوچُو خالی ہاتھ واپس آئی اور بولی، ''پاپا chichh کی دُکان بند ہو گئی ہے، مَیں نے کہا پیسے کہاں ہَیں؟'' چُوچُو بولی، ''وہ مَیں نے وہیں پھینک دِئے۔'' مَیں نے پُوچھا ''پھینک کیوں دِئے؟'' چُوچُو بولی ''جب chichh ہی نہیں تھے تو پَیسے کیا کَرنے تھے۔''

مَیں نے باہر جا کر دیکھا کہ chips stall کا تو بند ہو چُکا تھا لیکن پیسے وہاں نہیں تھے، شاید کوئی اُٹھا لے گیا تھا۔

گاندھی نگر کے کوارٹر میں ہی مَیں نے اپنی پہلی موٹر کار یعنی سیکنڈ ہینڈ فئیٹ کار خریدی تھی۔ آج بھی جب کبھی اُس کوارٹر کے سامنے سے گزرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ بے دھڑک اندر چلا جاؤں مگر وہاں موجود اجنبی چہرے دیکھ کر سارا جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

چھنّی ہمّت کالونی کے اپنے مکان میں مُنتقِل ہونے کے کُچھ دیر بعد شاید دِسمبر ۱۹۹۵ء میں میرا تبادلہ ایڈیشنل ڈِپٹی کمِشنر ضلع اودھم پور (ایڈیشنل ڈِسٹرکٹ مجِسٹریٹ) کے طور پر ہو گیا اودھم پور میں مَیں مِیونسپل کمیٹی کا چئیر مین بھی تھا۔ شہر اودھم پور جموں سرینگر شاہراہ پر جموں سے ٦٦ کِلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اِسی شاہراہ پر چالیس کِلو میٹر اور آگے جا کر ''پٹنی ٹاپ'' نام کا مشہُورِ زمانہ صحت افزا پہاڑی مقام واقع ہے۔ اودھم پور بھی ایک خوبصورت پہاڑی قصبہ ہے جہاں کے خوبصورت لوگ بڑی خوبصورت ڈوگری زبان بولتے ہیں۔ اِس ہندو اکثریتی ضِلعے میں دُوسری بڑی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ تھوڑے سے سِکھ بھی ہیں۔ شہر میں زیادہ تر دائیں بازو کی ہندو مذہبی سیاسی سماجی تنظیموں کا بول بالا رہتا ہے۔ اِسی ضِلعے کے ایک عِلاقے سُدھ مہادیو میں اپنے زمانے کے مشہور یوگی دھیریندر برہمچاری کا یوگ آشرم قائم ہے۔ سُنا ہے دھیریندر برہمچاری کی وفات کے بعد اُس آشرم کی حالت خستہ ہو چُکی ہے ورنہ کِسی زمانے میں وہاں دُنیا بھر سے لوگ یوگ دھیان سیکھنے آیا کرتے تھے۔ اُس وقت تک ہِندُوؤں کا مشہُور تیرتھ استھان کٹڑہ ویشنو دیوی بھی ضِلع اُدھم پور میں ہی شامِل تھا۔ اب وہ عِلاقہ نئے بنے ضلع ریاسی میں شامِل ہو چُکا ہے۔ ہندو لوگوں میں یہ وِشواس ہے کہ سُدھ مہادیو ہی وہ مقام ہے جہاں شِو (شنکر) اور پاروتی کی شادی ہوئی تھی۔

پہلے دِن جب مَیں اودھم پور شہر میں داخل ہو رہا تھا تو مَیں نے بڑی خوبصورت آواز میں جموں کے عِلاقائی ڈوگری انداز میں سارنگی کے ساتھ کِسی کو کارک (جموں کا ایک لوگ گیت) گاتے ہوئے سُنا۔ مَیں نے سمجھا ریڈیو پر کِسی کا گانا بج رہا ہے۔ مَیں نے اپنے ڈرائیور نصیب چند سے پوچھا کہ کیا یہ یہاں کے ریڈیو سٹیشن سے کِسی کا گانا چل رہا ہے۔ اُس نے جواب دِیا کہ اودھم پور کا اپنا کوئی الگ ریڈیو سٹیشن نہیں ہے۔ جو پروگرام بھی آتے ہیں ریڈیو جموں سے ہی آتے ہیں۔ مَیں نے کہا یہ آواز تو مَیں نے جموں ریڈیو سے کبھی نہیں سُنی۔ اُس نے جواباً کہا ''جناب یہ تو ایک جوگی ہے جو لوگوں کے گھروں میں گانا سُنا تا ہے۔ لوگ اِسے کُچھ آٹا چاول وغیرہ دے دیتے ہیں۔ اِس طرح یہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ مَیں حیران تھا اور مُجھے اپنے جموں کے معاشرے پر افسوس ہو رہا تھا کہ اِتنی خوبصورت آواز اِتنا منجھا ہوُا گانا اور اُوپر سے اِتنی ماہرانہ انداز میں بجائی جا رہی سارنگی اور یہ آدمی بھیک مانگ کر گزارہ کرتا ہے۔ مَیں نے نصیب چند ڈرائیور سے کہا کہ اِس جوگی کو میرے پاس لے کر آنا۔ مُجھے اُس سے کُچھ بات کرنا ہے۔ دوسرے دِن نصیب چند آیا اور بولا، ''جناب وہ جوگی تو آپ کا نام سُنتے ہی تھر تھر کانپنے لگا۔ روتے ہوئے بولا کہ مَیں نے تو کوئی قانون نہیں توڑا۔ ڈی۔ سی صاحب مُجھے کیوں بُلا رہے ہیں؟ مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا، ''بیوقوف! مُجھے اُس کا گانا سُننا ہے۔ پھِر جاؤ اور اُسے بولو گانا سُنائے گا تو انعام مِلے گا۔''

اگلے دِن جوگی گوری ناتھ میرے سامنے تھا۔ سفید مگر مَیلا کُچیلا کُرتا پاجامہ سفید مگر مَیلی کُچیلی پگڑی، اُس کی حالت دیکھ کر میرے دِل کو زبردست دھکّا لگا اور میرے اندر سے آواز آئی، ''جِس مُلک میں فن کاروں کی یہ حالت ہے اُس مُلک کا حال جو بھی ہو مُستقبِل کبھی اچھا نہیں ہوسکتا''۔ مَیں اکثر کہا کرتا ہوُں کہ جو سماج اپنے سچّے فن کاروں کی مناسب عِزّت

افزائی نہیں کر سکتے اُن کا تہذیبی مُستقبل ہرگز اچھا نہیں ہو سکتا۔ مَیں نے جوگی گوری ناتھ سے ویشنو ماتا کی بھینٹیں (بھجن) سُنی، کُچھ کارکیں (ڈوگری قصّے) سُنی اور دیر تک سُنتا رہا۔ کُچھ دِنوں بعد جب انو اور چؤ چؤ اودھم پور آئے تو مَیں نے انو کو بھی جوگی گوری ناتھ کا گانا سُنوایا تو وہ بھی حیران رہ گئی۔ انو کی مادری زبان ڈوگری ہے اور وہ گانے کا ذوق بھی رکھتی ہے۔ انو نے کہا کہ اِس آدمی کو بڑے پیمانے پر منظرِ عام پر آنا چاہیے۔ مَیں نے جموں ریڈیو سٹیشن کے ڈائیریکٹر سے بات کی تو اُنہوں نے کہا اُسے بھیج دیں ہم اُس کا آڈیشن (گانے کا اِمتحان) لیں گے پھر دیکھیں گے کیا ہو سکتا ہے۔

مَیں نے دو جوڑے اچھے کپڑے سِلوا کر نئی پگڑی کے ساتھ اُسے دِئے۔ جوگی گوری ناتھ ریڈیو سٹیشن کے آڈیشن میں کامیاب ہو گیا۔ مَیں نے ریاستی کلچرل اکادمی میں بھی گوری ناتھ کو متعارف کروایا۔ جو بھی اُس کا گانا سُنتا اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ جموں ریڈیو سے دو چار بار گوری ناتھ کو گانے کا موقع بھی مِلا۔ اپنے کُچھ ایک پروگراموں میں کلچرل اکادمی نے بھی اُسے بُلوایا لیکن مُجھے معلوم ہؤا کہ ہر جگہ اُس کا نِہاد چھوٹی ذات اور نچلے طبقے سے متعلق ہونا آڑے آتا رہا۔

لوک گیت اور لوک گائک ہر معاشرے میں عوام میں سے پیدا ہوتے ہیں اور اکثر دور دراز کے دیہی عِلاقوں میں اپنا جلوا بکھیرتے ہوئے پائے جاتے ہیں لیکن صوبہ جموں کا ڈوگری لوک سنگیت سارے کا سارا شہر جموں کے کُچھ ایک باشندوں تک سِمٹ گیا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ دور دراز سے کوئی لوک گائک جموں تک پہُنچ بھی جائے تو اُونچے گھروں اور اُونچے طبقوں سے تعلق رکھنے والے اِجارہ دار اُسے آگے نہیں بڑھنے دیتے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ صوبہ جموں کا اصل ڈوگری لوک سنگیت اور لوک ساہتیہ صُوبہ جموں کے دور دراز عِلاقوں میں اپنی اصل حیثیت میں موجود ہے جب کہ جموں شہر میں اِس میں اِدھر اُدھر کی مِلاوٹ بہت زیادہ ہے۔ سُنا ہے کہ میرے اودھم پور سے آ جانے کے بعد جوگی گوری ناتھ پھر سے سارنگی اُٹھا کر اپنی آٹے کی گٹھڑی کندھے پہ لٹکائے ہوئے گھر گھر آٹا چاول مانگ رہا ہے اور گانا سُنا رہا ہے۔ پھر سے وہی مَیلا کُچیلا کُرتا پاجامہ وُہی مَیلی کُچیلی پگڑی۔

پاکستان کی مشہورِ زمانہ مُغنیہ ریشما بھی کِسی زمانے میں چھوٹی سطح پر گایا کرتی تھی۔ سُنا ہے کراچی ریڈیو سٹیشن کے ڈائیریکٹر نے اُسے کہیں راہ چلتے ہوئے سُنا تو ریڈیو سٹیشن میں بُلا لِیا اُس کے بعد ریشما ہندو پاک کی نام ور گائکہ بن گئی۔ لیکن افسوس کہ جموں نے جوگی گوری ناتھ کو ریشما کی طرح مشہور نہ ہونے دِیا۔ میری اِس بات سے کِسی کو تکلیف ہو تو مَیں مُعافی کا خواستگار ہوں۔

مُجھے یاد ہے اودھم پور سے مُتصل ''چک رکوالا'' نام کے ایک گاؤں میں بھارت سرکار کے فیلڈ پبلِسٹی ڈیپارٹمنٹ اور ریاستی سرکار کے سماجی بہبود سے مُتعلق محکمے نے مِل جُل کر ایک ثقافتی پروگرام کا اہتمام کِیا تھا جس کی صدارت مُجھے کرنا تھی۔ اُس پروگرام میں اُس عِلاقے کے مُختلف فن کاروں نے رنگ رنگ کے نئے نئے قِسم کے ڈوگری لوک گیت پیش کِئے۔ مَیں نے وہ لوک گیت پہلے کبھی نہیں سُنے تھے۔

جموں جا کر مَیں نے ریڈیو اور کلچرل اکادمی وغیرہ کے لوگوں سے کئی بار کہا کہ آپ لوگ اُس عِلاقے میں جا کر اپنے Talent Hunt (فن کی کھوج) پروگرام منعقد کروائیں۔ آپ کو بالکل نئی نئی اور عُمدہ سے عُمدہ چیزیں مِلیں گی جو ڈوگری کے لوک وِرثے

میں اِضافہ کرسکتی ہیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی کون سُنتا ہے؟ میری مادری زبان پنجابی ہے لیکن مَیں چاہتا تھا کہ ڈوگری لوک ادب کے نایاب نمُونے کہیں Record میں آجاتے۔ مُجھے اِس سب سے کُچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مَیں شِعر اُردُو میں کہتا ہُو مادری زبان پنجابی ہے۔ مَیں تو صِرف یہ چاہتا تھا کہ ڈوگری لوک ادب اور لوک سنگیت کے کُچھ ایک نایاب خزانے محفوُظ ہو جاتے لیکن جب مُدعی سُست اور گواہ چُست ہو تو مقدّمے کا حشر کیا ہوتا ہوگا خُدا جانے۔

کئی بار مَیں سوچتا ہوں کہ جموں کے لوگ بھی لگ بھگ پنجاب کے لوگوں جیسے ہی ہَیں۔ شکلیں صورتیں کھانا پینا نسل رنگ مذہب سب کُچھ ایک جیسا ہے، پھِر پنجاب میں لوک فن کار خاص طور سے لوک گائک اِسقدر زیادہ ترقی یافتہ اور مشہور کیوں ہیں؟ جموں کے گانے والے جموں سے باہر نہیں جانے جاتے جب کہ پنجاب کے لوک گائک دُنیا کے کونے کونے میں مشہور ہیں۔ اِس پر ہر بار جواب یہی مِلتا ہے کہ جموں کی ساری فن کاری شہر جموں تک سِمٹی ہوُئی ہے جب کہ پنجاب کے فن کار پنجاب کے ہر چھوٹے بڑے عِلاقے سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ مَیں نام نہیں لینا چاہتا لیکن پنجاب کے کُچھ ایک بڑے بڑے فن کار بہُت چھوٹے عِلاقوں اور نام نِہاد چھوٹی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ جموں کے لوگوں کی شکلیں صورتیں پنجاب کے لوگوں سے مِلتی جُلتی ہیں، رنگ نسل مذہب بھی ایک جیسے ہیں مگر پنجاب میں لوک فن کار چھوٹے عِلاقے اور نام نِہاد چھوٹی ذات سے تعلق رکھنے کے باوجود ترقی کر سکتے ہیں جب کہ جموں میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ ورنہ جموں کے جوگی گوری ناتھ بھی ہندوستانی پنجاب کے ہنس راج ہنس اور پاکستانی پنجاب کی ریشما کی طرح مشہورِ زمانہ لوک گائک ہوتے۔

اودھم پور میں ہندی کے مشہور کوی اور لیکھک ڈاکٹر آدرش، ڈوگری اور سنسکرت کے وِدوان لیکھک پرکاش پریمی، ڈوگری کے دو شاعر بھائی ابھیشاپ اور جگدیپ دُوبے، اُردُو کے صاحبِ کِتاب شاعر آنند سروپ انجمؔ ڈوگری قلم کار شِو نرموہی وغیرہ کچھ لوگ ہفتے کے دِن میری سرکاری رہائش گاہ پر اِکٹھے ہوتے اور ایک اچھّی خاصی ادبی نِشست ہو جاتی۔ اِس کے عِلاوہ ڈرامہ سے تعلق رکھنے والے سُدیش سُلطان پوری موسیقی سے تعلق رکھنے والے آر کے شرما اور جوگی گوری ناتھ وغیرہ بھی اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ اودھم پور کی اُس ادبی اور فن کارانہ فضا سے میرا آج بھی دِلی اور روحانی رِشتہ موجود ہے۔

میری اودھم پور کی پوسٹِنگ کے دوران گورنمنٹ سکولوں کے اُستادوں کی تقرریوں کے لِئے مُجھے اودھم پور کی سبھی تحصیلوں (رام نگر، چینینی، ریاسی، اودھم پور) میں جا کر اُمید واروں کے اِنٹرویو لینے کا موقع مِلا۔ اُس وقت کے ریاستی ریکروٹمنٹ بورڈ کے چیئر مین مِسٹر سلووا جو چیف سیکریٹری رینک (Rank) کے آئی۔ اے۔ ایس آفیسر تھے انگریزی کے عِلاوہ کوئی دُوسری زبان نہیں بولتے تھے (کیونکہ اُن کا تعلق ہندوستان کی ریاست میزورم سے تھا اور اُن کی مادری زبان میزو تھی)۔ اودھم پور کے زیادہ تر اُمیدواروں کا قافیہ انگریزی میں (بہُت) تنگ تھا۔ لِہٰذا مُجھے سلووا صاحب اور اکثر اُمید واروں کے بیچ دو بھاشیے (Interpretter) کا کام بھی کرنا پڑتا۔ میری کوشش ہوتی کہ ہندی پنجابی اور اُردو پڑھے ہوئے (ایم۔ اے۔ یا پی۔ ایچ۔ڈی) اُمیدوار زیادہ سے زیادہ مُنتخب ہو جائیں لِہٰذا مَیں ایسے اُمیددواروں میں زیادہ دِلچسپی لیتا۔ اُردُو کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کِئے ہوئے اُمّید واروں سے میرا پہلا سوال ہوتا کہ لفظ اُردُو کے لغوی معنی کیا ہیں؟ زیادہ تر اُمیدوار جواب میں کہتے صاحب اُردُو ایک زبان ہے اور یہی لفظ اُردُو کے معنی ہیں۔ پورے ضِلعے میں تحصیل

چینی کی ایک لڑکی نے (جو محض بی اے تک پڑھی ہوئی تھی) اِس سوال کا صحیح جواب دِیا۔ بعد میں مَیں نے جموں یونیورسٹی کے شُعبۂ اُردُو کے اُس وقت کے صدر سے جب اِس بارے میں بات کی تو وہ اپنی اور آس پاس بیٹھے ہوئے دوسرے اُردو کے استادوں کی بغلیں جھانکنے کے سِوا کُچھ نہ کر سکے۔

اِسی طرح ہندی کے ایم اے پی ایچ ڈی اُمیّد واروں سے میرا پہلا سوال ہوتا کہ لفظ ''ابھوُت پورو'' کے معنی کیا ہیں۔ پورے ضِلعے میں کِسی اُمّید دار نے صحیح جواب نہ دِیا۔ مُجھے یاد ہے تحصیل رام نگر میں اِنٹرویو کے دوران ایک پی ایچ ڈی (سنسکرت) لڑکی نے بتایا کہ اُس کا پی ایچ ڈی میں ٹاپک یعنی مضمون Shaivism in Kashmir تھا۔ ہم لوگوں نے بلکہ سِلوا صاحب نے خود اُس سے پوچھا کہ How is Shaivism in Kashmir different from Shaivism elsewhere in India? یہی سوال مَیں نے اُس لڑکی سے ہندی اُردُو میں کِیا۔ وہ پی ایچ ڈی لڑکی سِوائے رونے کے اور کُچھ نہ کر سکی۔ جب اُس نے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نِکالا تو ہم نے مُتفقہ فیصلے کے تحت اُسے صِفر نمبر دِئے۔ شاید وہ پورے ضِلعے میں اکیلی لڑکی تھی جِسے پورے ضِلعے میں صِفر نمبر لینے کا اعزاز حاصل ہوُا۔

ضِلع اودھم پور اُس زمانے میں بہُت دور دور تک پھیلا ہوُا تھا۔ آج کا پورے کا پورا ضِلع ریاسی اُن دِنوں تک اودھم پور میں شامِل تھا۔ اِس کے عِلاوہ آج کے ضِلع رام بن کا عِلاقہ گوُل گُلاب گڑھ بھی اُن دِنوں ضِلع اودھم پور ہی میں شامِل تھا۔ گوُل گُلاب گڑھ جانا براستہ ریاسی بڑا جوکھم کا کام ہے۔ اِس لِئے گوُل کا سفر زیادہ تر براستہ رام بن کِیا جاتا ہے۔ رام بن

سے سنگل دان، دھرم گُنڈ اور پھر گوُل۔

گوُل ٹھنڈا پہاڑی عِلاقہ ہے۔ اِس کے آس پاس کے پہاڑوں پر اکثر کشمیر کی اِنتہا پسند تحریک سے مُتعلق مسلّح دہشت پسندوں کا غلبہ رہتا ہے۔ دراصل یہ لوگ اِن اُونچے پہاڑوں پر خود کو محفوظ محسوس کرتے ہیں کیونکہ کٹھن سنگلاخ پہاڑی عِلاقوں پر (پکی سڑکیں نہ ہونے کی وجہ سے) بھارتی فوجی دستے نہیں پہُنچ پاتے یا بہُت کم پہُنچ پاتے ہیں۔ اُن دِنوں بلّو گوُجر اور امان اللہ نام کے دو دہشت پسند رہنما اِن عِلاقوں میں کافی مشہوُر تھے یا بدنام تھے۔ بھیم داسا، ڈیڈا، اور چھچھوا جیسے اُونچے پہاڑی عِلاقوں کے کئی دیہات سے ہِندو لوگ ہجرت کر کے رام بن بٹوت اودھم پور اور جموں تک آچُکے تھے۔ کئی وہاں اِنتہا پسندوں کے ہاتھوں مارے بھی جاچُکے تھے۔

گوُل کے چھوٹے سے قصبے میں اُن دِنوں کِسی طرح شاید بجلی کے ننگے تاروں سے آگ پھیل جانے کی وجہ سے بازار میں لکڑی کی اکثر دُکانیں جل کر خاک ہوگئی تھیں۔ کِسی بڑے افسر کو گوُل میں جا کر دوکانوں کے نقصانات کا اندازہ لگانا تھا تاکہ جِن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے اُنہیں معاوضے کی سرکاری مدد (Exgratia Relief) دی جاسکے۔ ڈپٹی کِمشنر عبدالسلام بھٹ نے خود جانے کے بجائے پہلے ریاسی کے SDM شاہین کا بڑا سے گوُل جانے کے لِئے کہا۔ اُن دِنوں گوُل SDM ریاسی کے تحت آتا تھا۔ اِتّفاق سے مَیں اور چیئر مین ریکروٹمنٹ بورڈ مِسٹر سِلوا اُن دِنوں ریاسی قصبے میں ہی پرائمری سکولوں کے استادوں کے لِئے اُمیدواروں کے اِنٹرویو لے رہے تھے۔ ریاسی کے SDM میرے پاس آئے اور پریشانی کے عالم میں کہنے لگے، ''ڈی سی صاحب مُجھے گوُل جانے کے لِئے کہہ

رہے ہیں۔ گوُل دہشت گردوں کا علاقہ ہے اور مَیں باہر سے آیا ہوُا افسر ہوں۔"

SDM صاحب کو شاید اغوا کر لِئے جانے کا ڈر تھا۔ اُن کی حالت قریب قریب رونے جیسی ہو رہی تھی۔ آخر میں عبدالاسلام بھٹ صاحب نے مُجھے گوُل جانے کے لِئے کہا۔ عبدالسلام بھٹ اُن پانچ اَفسروں میں سے ایک تھے جنہیں کُچھ عرصہ پہلے اِنتہا پسندوں سے مُتعلق ہونے کے جُرم میں dismiss کِیا گیا تھا اور پھِر بحال کر دِیا گیا تھا۔

مَیں صُبح سویرے اپنے دو تین ماتحتوں اور محافظوں کے ساتھ گوُل کے لِئے نِکل پڑا اور گوُل کے بازار میں قریب قریب خاکستر ہو چُکی دُوکانوں کا مُعائینہ کِیا اور متعلقہ کاغذات وغیرہ مکمّل کر لِئے۔ گوُل کے بازار میں عِلاقائی لوگوں کا ایک ہجُوم میرے ساتھ ساتھ رہا۔ گوُل اُس وقت تک نیابت تھی اور ایک نائب تحصیل دار ہی وہاں محکمہ مال کے بڑے افسر تھے (آج کل شاید گوُل ایک تحصیل ہے) کام ختم ہونے کے بعد نائب تحصیلدار صاحب (جو عِلاقہ پونی بھارک، ریاسی کے ایک سردار صاحب تھے) سے کھانے کی میز پر مَیں نے پوچھا "سُنا ہے اِس عِلاقے میں دہشت گردوں کا غلبہ ہے۔ کیا آپ کا سامنا بھی ہوتا ہے کبھی اُن لوگوں سے؟" اُنہوں نے جواب دِیا، "جناب روز آتے ہیں میرے پاس سرکاری کام کاج کے سِلسِلے میں۔" مَیں نے کہا، "مُجھے تو کوئی دہشت گرد نظر نہیں آیا۔ اپنے پیچھے چلنے والے ہجُوم میں" وہ بولے "جناب اِن میں زیادہ تر وہی لوگ تھے۔ وہ جو ایک کانا بھینگا جیسا بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا اُسے نہیں پہنچانا آپ نے؟" مَیں نے کہا، "مُجھے یاد نہیں کون سے کانے بھینگے کی بات کر رہے ہیں آپ"۔ وہ بولے "جناب وہی تو ہے مشہوُر دہشت گرد۔" کُچھ دیر کے لِئے مَیں اندر سے پریشان ہو گیا حالانکہ مَیں نے ایسا کُچھ ظاہر نہیں ہونے دِیا۔

دو بجے کے قریب برف باری شروع ہوگئی۔ نائب تحصیلدار نے مُجھ سے کہا، ''جناب آپ نِکل جائیں تو اچھا ہے کیونکہ زیادہ برف باری کے بعد رام بن کا راستہ بند ہو جائے گا اور پھر بعد میں آپ جا نہیں پائیں گے۔ ویسے بھی عِلاقے کے سبھی دہشت گردوں کو خبر ہو چکی ہوگی کہ اودھم پور کا ایڈیشنل ڈِپٹی کمِشنر گوُل میں ہے۔ کوئی بڑی بات نہیں کہ کوئی آپ کو اغوا کرنے کی کوشِش ہی کر بیٹھے۔ یوں بھی ہمارے پولیس کے محافظوں کی تو دہشت گردوں کے سامنے بندوقیں ہی جام ہو جاتی ہیں اور اکثر ایسے موقعوں پر وہ لوگ پولیس والوں کی بندوقیں بھی چھین لے جاتے ہیں۔

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ نائب تحصیلدار صاحب کی باتوں میں صداقت تھی یا پھر وہ میری زیادہ مہمان نوازی نہیں کرنا چاہتے تھے مگر اِتنا یاد ہے کہ برف باری کے درمیان ہی ہم نے واپس سنگل دان اور دھرم گُنڈ کے سنگلاخ راستے طے کرتے ہُوئے اور اِنتہا پسندوں کے مُمکِن الوقُوع حملے کا risk نہ لیتے ہُوئے رام بن میں آ کے دم لِیا۔ شام تک ہم واپس اودھم پور پہُنچ گئے۔

۱۹۹۰ء میں اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ فارُوق عبداللہ کی حکوُمت کو ہٹا کر ریاست میں گورنر (جگموہن) کا راج لاگوُ کِیا گیا تھا۔ جگموہن کی چونکہ الگاؤ پسندوں اور کشمیر کے سیاسی حلقوں میں سخت مخالفت ہو رہی تھی۔ اِسلئے اُن کو ریاست سے ہٹا لیا گیا۔ اِسی دوران ریاست میں دوبارہ اِنتخابات کروانے کی کوششیں شروُع ہو گئی تھیں۔ حالانکہ کشمیر کی مسلّح اِنتہا پسندی اُن دِنوں شباب پر تھی لیکن دِسمبر ۱۹۹۶ء میں ریاست کے اِنتخابات منعقد کروائے گئے اور فارُوق عبداللہ دوبارہ ریاست کے وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔ فروری ۱۹۹۷ء میں فارُوق عبداللہ

اپنے بیٹے (عُمر عبداللہ) بیٹی اور کُچھ دوسرے مہمانوں کے ساتھ دوتین دِن کے لِئے اودھم پور کے سرکاری گیسٹ ہاؤس ''تارانِواس'' میں آ کرُ رکے۔ تارانِواس ۱۹۴۷ء سے پہلے مہاراجہ ہری سنگھ کی مہارانی تارادیوی کے نام پر تعمیر کروایا گیا ایک محل ہے جو آج کل بڑے بڑے لوگوں (VVIP's) کے لِئے سرکاری رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اودھم پور میں اپنے اِس دوتین دِن کے مستقِل قیام کے دَوران ڈاکٹر فارُوق عبداللہ نے عید بھی وہیں منائی۔ شام کے وقت اودھم پور کی ایک بینڈ پارٹی نے گانے بجانے کا پروگرام بھی پیش کیا۔جس کے دَوران مَیں نے اپنا تازہ شائع شُدا مجموعۂ کلام ''خودرنگ'' بھی ڈاکٹر فارُوق عبداللہ کو پیش کیا۔ فارُوق عبداللہ اُس کے بعد ہمیشہ کے لِئے میری شاعری کے مدّاح بن گئے۔ مَیں نے بعد میں وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے اپنے شِعری مجموعے بھی ڈاکٹر فارُوق کی خِدمت میں پیش کِئے۔ سیاست جو بھی ہو جیسی بھی ہو مگر فارُوق عبداللہ ادب اور دُوسرے فنونِ لطیفہ کے زبردست باذوق مدّاح ہیں بلکہ گانے کا شوق بھی رکھتے ہیں اور اُن کی آواز بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔

''خودرنگ'' میرا تیسرا اشعری مجمُوعہ ہے جِس میں کُچھ نظمیں ہَیں، کُچھ غزلیں ہَیں۔ اِس مجمُوعے کا دیباچہ جو شمس اُلرحمٰن فارُوقی کا لِکھا ہُوا ہے بہُت پسند کیا گیا۔ اِس مجموعے نے میرے شِعری وقار کو اور بھی بڑھا دِیا تھا۔

☆☆☆

باب -۱۱

اپریل ۱۹۹۷ء کے اوائل میں میرا تبادلہ ریاست کے ڈائریکٹر لائبریریز کے طور پر ہو گیا۔ محکمے کا مُستقل ہیڈ آفس کشمیر (سرینگر) میں تھا اور زمانہ مُسلّح اِنتہا پسندی کے شباب کا تھا۔ ایک سیکشن آفیسر نے اسِسٹنٹ ڈائریکٹر کی ایک آسامی خالی دیکھ کر اُس پر قبضہ جما لیا۔ یہیں تک نہیں اُس نے کُچھ دیر بعد ڈِپٹی ڈائریکٹر کی ایک آسامی خالی دیکھ کر اُس پر بھی قبضہ جما لیا تھا اور پھر کِسی طرح ہائی کورٹ سے سٹے آرڈر بھی حاصِل کر لیا تھا (Status quo)۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانین وضوابط کے مُطابق کوئی سیکشن آفیسر پروموٹ ہو کر اسِسٹنٹ ڈائریکٹر لائبریریز بن ہی نہیں سکتا بلکہ اسِسٹنٹ ڈائریکٹر بننے کے لِئے پہلے چیف لائبریرین ہونا ضروری ہے۔ اُس لمحہ لمحہ خوف کے ماحول میں مَیں زیادہ کُچھ تو نہ کر سکا لیکن اُس سیکشن افسر کا ڈِپٹی ڈائریکٹر کی پوسٹ پر لیا ہوا status quo کا آرڈر ہائی کورٹ سے کینسل کروا لیا۔ اب وہ اسِسٹنٹ ڈائریکٹر کی پوسٹ پر قابض تھا۔ اِس سے پہلے کہ مَیں اُسے اسِسٹنٹ ڈائریکٹر سے واپس سیکشن آفیسر کی پوسٹ پر لانے کے لِئے ہائی کورٹ سے دُوسرا آرڈر لاتا میرا وہاں سے تبادلہ ہو گیا لیکن میرے بعد آنے والی ڈائریکٹر محترمہ عتیقہ بیگم نے یہ فریضہ بھی بخوبی انجام دِیا اور وہ صاحب اپنی اصل کرسی یعنی سیکشن آفیسر کی پوسٹ پر واپس آ گئے۔ مُجھے میرے ڈائریکٹر لائبریریز کے قلیل سے عہد میں طرح طرح سے ڈرانے دھمکانے کی کوششیں کی گئیں۔ کئی بار کُچھ نوجوانوں کو میرے دفتر میں لایا گیا جن کے بارے میں کہا گیا کہ یہ اِنتہا پسندوں کی تنظیموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مَیں نے اُن لوگوں کے

سوالات کے جواب ڈٹ کر دیئے۔ ہر بار وہ لاجواب ہو کر واپس چلے گئے۔ مَیں کئی بار سوچتا ہوں کہ شاید وہ لوگ اِنتہا پسند تھے ہی نہیں بلکہ میرے دفتر کے کُچھ ناراض مُلازمین کے کرائے پر لائے ہوئے بھاڑے کے ٹٹو تھے۔

اُس زمانے میں وزیرِ تعلیم قیوم صاحب تھے جو ایک باذوق اور بہُت ہی بھلے آدمی تھے۔ میرا اُن کا اکثر اُٹھنا بیٹھنا رہتا اور شعر و ادب سے متعلق گفتگو رہتی۔ اُنہیں کِتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ اُسی زمانے میں محکمہ تعلیم کے کِمشنر سیکریٹری جناب مادھولعل تھے وہ بڑے شانت سُبھاؤ کے بہُت ہی قابل افسر ہیں۔ اُنہوں نے میرے کام کی ہمیشہ تعریف کی۔ میری اُن سے اکثر کئی مُعاملوں پر سنجیدہ گفتگو ہُوا کرتی۔

لائبریریز ڈیپارٹمنٹ کا ایک حِصّہ Research & Publication Wing کے طور پر جانا جاتا ہے۔ جِس کے تحت محکمے کی ایک لائبریری سِری نگر میں کشمیر یونیورسٹی کے اندر موجود ہے۔ اِس لائبریری میں پُرانے نادر مخطوطات کا ایک نایاب خزانہ موجود ہے۔ جِس میں عربی فارسی اور سنسکرت کے بے شمار مخطوطے موجود ہیں جِن میں کُچھ ایک بھوج پتر پر لِکھی ہوئی پُراتن سنسکرت کی بھارتی پانڈولِپیاں بھی ہیں۔ اُس زمانے میں سُنا تھا کہ کشمیر یونیورسٹی کے اعلیٰ حُکام اِس نایاب خزانے کو یونیورسٹی کے حوالے کر دِئے جانے کی بھرپور وکالت کر رہے تھے۔ مَیں نے اِتنا ضرور کِیا کہ جدید سائنسی طریقوں سے اِس خزانے کی حفاظت اور رکھ رکھاؤ (maintenance) کے اِنتظامات کروائے اور مخطوطات کی scientific cataloging کروائی۔ مَیں نہیں جانتا کہ وہ خزانہ ابھی تک لائبریریز ڈیپارٹمنٹ کے پاس ہے یا کہ کشمیر یونیورسٹی نے اُسے ہتھیا لِیا ہے۔ البتّہ یہ ضرور جانتا ہوں

کہ کچھ مخطوطات ایسے ہیں جو اگر چوری ہو جائیں تو بیرونی ممالک میں کروڑوں اربوں روپے کے بھاؤ نیلام ہو سکتے ہیں۔

وزیرِ تعلیم قیوم صاحب اور کمشنر سیکریٹری محکمہ تعلیم مادھو لعل صاحب کے ساتھ میرا وقت خوشی خوشی گزر رہا تھا حالانکہ میں دہشت گردی کی جھوٹی سچّی دھمکیوں اور پریشانیوں کے ماحول میں بھی گھرا ہوا تھا۔ میں ڈرنے والوں میں سے تو نہیں ہوں مگر کسی حد تک یہ پریشانی ضرور تھی کہ جب دربار جموں کی طرف موو کر جائے گا تو دہشت گردی کے اُس ماحول میں میرے لئے سرینگر میں دُشمنی بھرے ماحول کے بیچ گھرے ہوئے کام کرنا خاصہ مُشکل ہو جائے گا۔ سوچ وِچار کی اِسی اُدھیڑ بُن کے درمیان ایک دِن وزیرِ تعلیم قیوم صاحب نے مُجھے اپنے کمرے میں بُلایا اور مُجھے اپنی بلکہ سرکار کی ایک اُلجھن کے بارے میں بتایا۔

دراصل اُس وقت کے بھارت سرکار کے ایک وزیر اور اُس وقت تک نیشنل کانفرنس (جموں کشمیر کی حکومتی پارٹی) کے لیڈر کی بیگم کو ریاستی سرکار ڈائیریکٹر ایجوکیشن بنانا چاہتی تھی لیکن جوائٹ ڈائیریکٹر کے طور پر محترمہ عتیقہ بیگم اُس میڈم سے سینیئر تھی۔ اِس لئے یہ کام مُشکل ہو رہا تھا۔ مَیں چونکہ سیاسی اور طبقاتی طور پر کمزور ہونے کے ناتے ایک soft target تھا۔ سرکار چاہتی تھی مُجھے اُٹھا کر کہیں اور پھینک دِیا جائے اور محترمہ عتیقہ بیگم کو ڈائیریکٹر لائبریریز بنا دِیا جائے تا کہ اُس میڈم یعنی مرکزی وزیر کی بیوی کے ڈائیریکٹر ایجوکیشن بننے کا راستہ صاف ہو سکے۔ قیوم صاحب کیونکہ دانش ور تھے اور بھلے آدمی تھے۔ اِس لئے اِنہوں نے یہ بات سیدھے سیدھے مُجھے بتا دی بلکہ بظاہر میرا لحاظ رکھنے کے لئے اِس بارے میں میری رائے بھی پوچھ لی۔ بہت چھوٹے اقلیتی طبقے سے ہونے کی وجہ سے سیاسی اور طبقاتی طور پر کمزور ہوتے

ہوئے میرے پاس بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ تو قیوم صاحب کی مہربانی تھی جو اُنہوں نے یہ بات اِس طرح سے میرے سامنے رکھی ورنہ میری اوقات ہی کیا تھی جو مَیں سرکار کے فیصلے کے آڑے آتا۔ مَیں تو سیاسی طور پر نو میں تھا نہ تیرہ میں۔

ڈائیریکٹر لائبریریز کے طور پر مَیں نے صوبہ لداخ کا دَورہ بھی کِیا۔ ہم لوگ سرینگر سے ہوائی جہاز کے ذریعے لیہہ چلے گئے اور پھر سڑک کے راستے کرگل اور دراس وغیرہ سے ہوتے ہوئے واپس سرینگر آئے۔

لیہہ میں ہم نے دریائے سِندھ کے کِنارے سِندھو درشن نام کے میلے میں سَیر و تفریح کا لُطف اُٹھایا۔ لیہہ کے بودھ مٹھ دیکھے اور وہاں کے قُطب خانوں کا جائزہ بھی لِیا۔ لیہہ سے کرگل کی طرف واپس آتے ہوئے تیس کِلومیٹر کے فاصلے پر ایک گورودوارا ہے جِسے گورُودوارا پتھر صاحب کہتے ہیں۔ اِس گوردوارے کی دیکھ ریکھ کے سارے اِنتظامات بھارتی فوج کے حوالے ہیں۔ مَیں نے انو اور چوُچوُ نے اِس گوردوارے میں ماتھا ٹیکا۔ اُس گوردوارے میں ایک بڑے کمرے کے سائز کا گول پتھر موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کِسی راکشس نے پیچھے کھڑے اُونچے پہاڑ سے یہ پتھر گورو نانک دیو پر اُنہیں مارنے کی غرض سے لُڑھکایا تھا مگر وہ بڑا پتھر عَین گورُو نانک کی پیٹھ کے پاس آ کر رُک گیا۔ گورو نانک لیہہ سے پیدل کشمیر اور پھر جموّں سے ہوتے ہوئے ہی پنجاب کو لوٹ آئے تھے۔ کشمیر میں مٹّن صاحب اور اونتی پورہ میں گورو نانک دیو کے سفرِ کشمیر سے متعلق تو ارِیخی شواہد موجود ہیں۔ مٹّن صاحب اور اونتی پورہ میں گورو نانک دیو کے نام سے گوردوارے موجود ہیں۔

جموں میں بھی گورونانک دیوجی کی آمد سے متعلق تواریخی وجغرافیائی شواہد موجود ہیں۔ خاص طور سے ستواری (جموں) پیر بُڈھن شاہ کی زیارت گاہ پر گورُونانک دیواور پیر بُڈھن شاہ کی مُلاقات کی تواریخی رِوایت موجود ہے۔ گورونانک کے عِلاوہ سِکھوں کے چھٹے گورُو ہرگوبند صاحب کے بھی کشمیر کے کئی مقامات پر تشریف لانے کے شواہد کے طور پر کئی گورودوارے موجود ہیں۔ مثلاً سرینگر کاٹھی دروازے کے پاس مشہور گوردوارا چھٹی پاتشاہی۔ کشمیر کے ضِلع پلوامہ میں گوردوارہ شاذی مرگ بھی گورُو ہرگوبند صاحب کی وہاں تشریف آوری کا تواریخی شاہد ہے۔ اِسی طرح ضِلع بارہ مولا میں بھی گورُو ہرگوبند صاحب کی آمد کے تواریخی شواہد کی حیثیت میں گوردوارے موجود ہیں۔

میرے خیال میں سِکھ گوروؤں کے پیروکار کشمیر میں ضرور اُسی زمانے سے پیدا ہونے شروع ہوگئے ہونگے۔ رِوایت مشہور ہے کہ کشمیری پنڈتوں کا ایک وفد سِکھوں کے نویں گورُو تیغ بہادر صاحب کے سامنے اورنگ زیب کی حکومت کی زیادتیوں کے خِلاف اپنے مذہبی مُعاملات سے متعلق کُچھ شکایات لے کر پیش ہوا تھا۔ گورُو تیغ بہادُر صاحب نے اُداس ہوکر کہا تھا کہ آج کِسی بڑی شخصیت کی قربانی درکار ہے۔ پاس کھڑے اُن کے نو سال کے بیٹے گورو گوبند سِنگھ نے اپنے والِد سے کہا تھا، ''پِتاجی آج کے دَور میں آپ سے بڑی کون سی شخصیت ہوگی یہ قُربانی دینے کے قابل؟'' گورُو تیغ بہادُر دِلّی چلے گئے تھے اور لال قِلعے کے سامنے چاندنی چوک میں اپنے دو پیروکاروں بھائی متی داس اور بھائی ستی داس کے سمیت ہندوستان کی مذہبی سیاسی سماجی تہذیبی اور ثقافتی آزادی کے لِئے قربان ہوگئے۔ اِس تعلق سے کشمیر میں رہنے والے سِکھوں کی تاریخ اُتنی ہی پُرانی ہے جتنی کہ خود سِکھ مذہب کی۔

یہ خُدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ حملہ اِنتہا پسندوں کی طرف سے کیا گیا تھا یا کسی کی طرف سے۔ البتہ لاکھوں کی تعداد والی سِکھ آبادی اب کشمیر میں ہزاروں کی تعداد تک سمٹ گئی ہے۔ بے شک سِکھ کسانوں نے اپنے کھیت کھلیان اپنے گھر مکان ابھی تک چھوڑے نہیں، لیکن آج ایک عجیب قسم کی ہجرت کشمیر میں رہنے والے ہر سِکھ فرد کے دِل میں چل رہی ہے۔

شجر سب نوچ ڈالے ہیں خزاں نے
یہی چند ایک پتے سخت جاں ہیں
کھول کر دیکھو در مکانوں کے
لامکانی ہی لامکانی ہے
اونچا پہاڑ دفن ہُوا گہری کھائی میں
خاموش دیکھتے رہے اپنا زوال ہم
مٹّی کے ساتھ رِشتے ہمارے قدیم تھے
یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب ہم مقیم تھے
ہجرت اِک ایک چہرے پہ بیتابؔ تھی رقم
کہنے کو لوگ اپنے گھروں میں مقیم تھے

بارہ مولا سرینگر بڈگام پلوامہ، ترال اور اننت ناگ کے کئی دیہات میں آج بھی سِکھوں کے کھیت کھلیان ہیں گھر مکان ہیں۔ اُن کی اپنی ایک پہاڑی لب و لہجے کی پنجابی زبان ہے۔ اُن کی اپنی پنجابی کشمیری تہذیب ہے ایک ثقافت ہے، مگر حالت یہ ہے کہ

یوں دھوپ سے بچنا مرا ممکن ہے کہاں تک
گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں کھڑا ہوں

کشمیر کے سکھ سرکاری ملازموں میں زیادہ تعداد ڈرائیوروں، چپراسیوں، کلرکوں اور پرائمری اسکول کے استادوں کی ہے۔ اپنی چھوٹی موٹی نوکریوں اور اپنے کھیتوں باغوں سے جُڑے ہوئے سکھ کسان کشمیر میں ڈٹے ہوئے ہیں لیکن حقیقت دم بہ دم یہی ہے کہ:-

جو ہجرت ہی مقدر ہے تو بیتاب
رفاقت بے سبب دیوار و در سے

اِس اجتماعی تذبذب کا نتیجہ ہے کہ آج کشمیر میں رہنے والے کشمیری سکھوں کی تعداد کشمیر سے باہر آباد ہو چکے کشمیری سکھوں کی تعداد کا بمشکل ۱۰ فی صد ہوگی۔

ہر لمحہ کوئی اینٹ اُکھڑ جاتی ہے جس کی
ہم لوگ اُسی دیوار کے سائے میں کھڑے ہیں

سرینگر، بارہ مولا اور علاقہ ترال (پلوامہ) میں پنجابی ادب سے متعلق کچھ سبھائیں (تنظیمیں) خراب سے خراب حالات میں بھی کام کرتی رہی ہیں۔ البتہ پہلے جہاں یہ نشستیں کھُلے عام منعقد ہوا کرتی تھیں اِنتہا پسندی کے عہدِ شباب میں یہ نشستیں پنجابی شعرا و اُدبا کے گھروں کے اندر منعقد ہونے لگیں۔ میں اپنے ڈائیریکٹر لائبریریز کے زمانے میں بھی پنجابی کی اِن ادبی نشستوں میں شامل ہوتا رہا ہوں۔ کشمیری اِنتہا پسندی کے اُس دَور میں غالباً پورے کے پورے صُوبہ کشمیر میں ادب کے نام پر صرف پنجابی ادبی تنظیمیں ہی باقاعدہ کام کرتی رہی ہیں۔ کشمیر میں پروفیسر پریم سنگھ، پروفیسر سیوا سنگھ، کنولؔ کشمیری، گورچرن سنگھ

گُلشن ، ڈاکٹر جوگندر سِنگھ شان، اجیت سِنگھ مستانہ، سُمیر سِنگھ مستانہ، کیرت سِنگھ انقلابی، جسبیر سِنگھ سرنا، ہربھجن سِنگھ ساگر، ڈاکٹر موہن سِنگھ شانت، آر ایس راجن، شانت رفیع آبادی، پوپندر سنگھ پارس وغیرہ اہم پنجابی ادبا وشعرا آج بھی سرگرمِ ادب ہیں۔ اِنھی لوگوں کی بدولت پنجابی ادب کا چراغ وادیٔ کشمیر کے ہر ایک طوفان میں جلتا رہا ہے۔ ڈاکٹر جوگندر سِنگھ شان ''کیسر مہکاں'' اور کیرت سِنگھ اِنقلابی ''جہلم'' نام سے دو پنجابی ادبی جریدے بھی کشمیر سے مُسلسل نِکالتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر جوگندر سِنگھ شان میرے بہترین دوستوں میں شامل ہیں۔ پنجابی کی مشہُورِ زمانہ افسانہ نِگار اور ناول نِگار سُرِندر کور نیر بھی بُنیادی طور پر کشمیر سے تعلق رکھتی ہیں۔ حالانکہ جموں کے افسانہ نِگار بلجیت رینہ سے شادی کر کے وہ آج کل جموں میں ہی قیام پذیر ہیں۔

اُس زمانے میں کشمیر میں اُردو شعر وادب کے میدان میں رفیق راز، شفق سوپوری، رُخسانہ جبین، اِقبال فہیم، حامدی کاشمیری، شبیب رِضوی، فرید پربتی، شجاع سلطان، سیّد رضا، نسیم شفائی، نذیر آزاد، ہمدم کشمیری اور کئی دُوسرے شعرا وادبا سرگرمِ عمل تھے۔ وہ لوگ کھُل کر منظرِ عام پر کم کم ہی آتے تھے مگر اپنی اپنی جگہ مِعاصر حسیّت کے حامِل شِعر وادب کی تخلیق میں یہ سب لوگ مصروف رہے ہیں۔ کشمیری ادب کا معاملہ البتہ تھوڑا الگ ہے۔ جہاں کشمیر میں رہنے والے کشمیری زبان کے قلم کار کشمیر کے موجودہ حالات کے گواہ تھے اور اپنی تخلیقات میں بالواسطہ بلا واسطہ اِس کرب کا ذِکر بھی کر رہے تھے وہیں کشمیر سے ہجرت کر چکے ہندو کشمیری قلم کار اپنی تخلیقات میں کشمیر سے اپنی ہجرت کی کڑواہٹ اور رنجش سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ صِرف کشمیری زبان کے ہی نہیں بلکہ ایسے ہندی کے کُچھ لیکھک بھی اپنے وِستھاپن (ہجرت) کے قصّے سے آگے کُچھ بیان کرنے سے معذور دِکھائی دیتے تھے۔

ڈائریکٹر لائبریریز کی حیثیت میں اُن دِنوں میرا اقیام سرینگر شہر کی مشہورِ زمانہ جھیل ڈل کے کِنارے بُلوارڈ روڈ پر تعمیر شُدہ ہوٹل (Imperial) میں تھا۔ یہ ہوٹل کشمیر کے مشہورِ زمانہ نہرُو پارک کے عین سامنے ہے۔ دراصل سرکار نے سرینگر کے قریب قریب سبھی ہوٹل کرائے پر لے رکھّے تھے اور زیادہ تر سرکاری ملازموں کو اُن کے رُتبے کے حساب سے اُنہی ہوٹلوں میں کمرے الاٹ کر دِئے جاتے تھے۔ کھانے رہنے اور صاف صفائی کا اِنتظام ہوٹل کی طرف سے ہی کِیا جاتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ ہزار روپے ایک ایک دِن کے کرائے والے ہوٹلوں کے کمرے ملازموں (افسروں) کو مُفت میں مِل جاتے تھے۔ البتّہ کھانے کے لِئے تنخواہ کا کُچھ فی صد سرکار کے خزانے میں جمع کروانا پڑتا تھا۔ چھوٹے ملازموں (Non gazetted Officers) کو شاید وہ بھی معاف تھا۔ ہوٹیلوں کی حفاظت بھارتی نیم فوجی دستوں کے ہاتھ میں ہُوا کرتی تھی۔ مُلازموں کو لوہے کی جالیوں والی بند گاڑیوں میں حفاظتی دستوں کی دیکھ ریکھ میں قیدیوں کی طرح ہوٹیل سے سیکریٹیریئٹ اور سیکریٹیریئٹ سے ہوٹیل تک پہنچادِیا جاتا جیسے مُقدّمے کی تاریخ والے دِن قیدیوں (ملزموں) کو جیل سے عدالت اور عدالت سے واپس جیل پہنچایا جاتا ہے۔ بڑے افسر البتّہ اپنی سرکاری کاروں میں اَپنے اَپنے دفاتر تک پُہنچ جاتے لیکن حفاظتی دستوں کی دیکھ ریکھ میں۔

نیم فوجی دستوں کا سرینگر (اور کشمیر کے دوسرے تمام حِصّوں) پر گویا مکمّل قابو (Control) تھا۔ اُنہی دِنوں ایک دِن مَیں اپنی گاڑی پر دفتر کی طرف روانہ تھا جب میرے سامنے سڑک پر چلتا ہُوا ایک سکوٗٹر سوار برابر سے گزرتی ہوئی نیم فوجی دستے کی گاڑی کے سامنے سڑک کے کِنارے گر کر بُری طرح زخمی ہوگیا۔ نیم فوجی دستے کی گاڑی تو آگے بڑھ گئی لیکن کُچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر اُس سکوٹر سوار کو اُٹھایا اور سرکار اور فوجی دستوں کے خِلاف

حسبِ معمول نعرے بازی بھی کی۔ زخمی سکوٹر سوار ایک سفید پوش تھا جو غالباً کوئی سرکاری ملازم تھا جو اپنے دفتر کی طرف روانہ تھا۔

تھوڑی دیر کے لِئے بھیڑ کی وجہ سے سڑک پر آمد و رفت رُک گئی لہٰذا مُجھے یہ نظارہ دیکھنے کو مِل گیا ورنہ ایسے تماشے اُن دِنوں کشمیر کی ہر چھوٹی موٹی سڑک پر ہر روز کئی کئی بار ہوتے رہتے تھے جِن میں سے کئی ایک کبھی کبھار کشمیر کے عِلاقائی اخبارات کی سُرخی بھی بن جاتے۔ اُس دِن یہ نظارہ دیکھ کر اپنی سرکاری موٹر کار میں بیٹھے بیٹھے مندرجہ ذیل شِعر مُجھ پر گویا نازل ہُوا تھا۔

بیتابؔ مُجھ کو میری فنا کا گِلا نہیں
مُجھ سے مِری انا بھی مگر لے گئی ہوا

بعد میں اُسی دِن شام کے وقت اپنے ہوٹیل کے کمرہ نمبر ۳۰۹ (غالباً) میں مَیں نے وہ غزل مُکمّل کی جِس کا پہلا مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

شب کا طِلسم رنگِ سحر لے گئی ہوا
آنکھوں میں تھے جو شمس و قمر لے گئی ہوا

اِنتہاپسندی کے اُس عہدِ شباب میں کشمیر میں فوجی اور نیم فوجی دستوں کے ہاتھ میں قانوناً طاقت (power) تھی۔ اِس طاقت کے بے جا نااِنصافانہ بلکہ ظالمانہ استعمال کی شِکایات کشمیری عوام کی طرف سے جلسے جلوُس اور اخبارات کے ذریعے ایک عام بات تھی۔ الگاوَ پسند حلقوں کی طرف سے فوجی اور نیم فوجی دستوں کے خِلاف اِنسانی حقوق کی دوسری خِلاف ورزیوں کے عِلاوہ زنا بالجبر کی شِکایات بھی اُن دِنوں ایک عام بات تھی۔ الگاوَ پسندوں

کے مخالف سیاسی سرکاری حلقوں کا اکثر جواب یہ ہوتا کہ زنا بالجبر کے مُعاملات مُسلّح اِنتہا پسندوں سے متعلق ہُوا کرتے تھے نہ کہ فوجی اور نیم فوجی دستوں سے مُتعلق اُونچے اُٹھتے ہوئے ہر دھوئیں کے نیچے کہیں نہ کہیں آگ ضرور سُلگ رہی ہوتی ہے۔

اُسی زمانے میں میرا صُبح وشام جھیل ڈل کے کِنارے بنی سڑک پر دُور تک لمبی سیر کا معمول ہُوا کرتا تھا۔ ایک شام مَیں چار پانچ کلومیٹر کی سَیر کر کے واپس مُڑ ہی رہا تھا کہ ایک نیم فوجی دستے کے مسلّح جوان نے مُجھے گھیر لیا اور پوچھا، ''گیانی جی! کہاں جا رہے ہو''؟ مُجھے اُس کے اندازِ بیان سے بہُت تکلیف ہوُئی البتہ مَیں نے جواباً کہا، ''بھئی مَیں Imperial ہوٹیل میں رہتا ہوں، شام کی سَیر کر کے واپس جا رہا ہوں؟'' وہ بولا آجکل کشمیر میں ٹورِسٹ تو کوئی نہیں آتے تُم کیسے ہوٹیل میں رہ رہے ہو''؟ مَیں نے پھِر جواباً کہا، ''بھئی مَیں ایک سرکاری افسر ہوں مُجھے سرکار نے اُس ہوٹیل میں ٹھہرا رکھا ہے'' اور مَیں نے جیب سے اپنا سرکاری شناختی کارڈ دِکھاتے ہوئے پھِر کہا، '' بھئی مَیں ڈائیریکٹر لائبریریز ہوں اور تمہارے I.G.P. کے رینک کے برابر کا افسر ہوں۔'' وہ پھر بولا، ''ایسے کئی کارڈ جیب میں ڈال کر یہاں آتنک وادی روز گھومتے پھِرتے ہیں''۔ مُجھ سے غُصّے پر اور قابو نہ رہ سکا۔ مَیں لگ بھگ چلّاتے ہوئے بولا، ''پھِر کیا کرو گے تم؟ مُجھے مار دو گے؟ مار دو؟ مَیں نے غُصّے میں یہ سب کہہ تو دِیا لیکن میرے اندر سے یکدم ایک آواز آئی کہ اِس کا کیا بھروسہ ہے جھوٹے مقابلے Fake (encounter) میں مار ہی ڈالے۔ جان تو میری جائے گی۔ مُجھے غصّے میں دیکھ کر وہ بھی تھوڑا سا نرم ہُوا اور بولا، ''گیانی جی کرنے کو تو ہم بہُت کُچھ کر سکتے ہیں پر پتہ نہیں کیوُں تم پر رحم آ رہا ہے۔'' مَیں چُپ چاپ بھیگی بلّی کی طرح کِھسک نِکلا اور دوُر تک پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ اُس دِن کے بعد مَیں نے شام تو شام صُبح کی سَیر بھی بند کر دی حالانکہ مَیں ظیابطیس

(Diabities) کا مریض ہوں اور مجھے صبح وشام کی لمبی سیر ڈاکٹروں نے لازمی بتائی ہوئی ہے۔ اُس دِن دیر رات تک مَیں اپنے کمرے میں بے چین رہا سونہ سکا، کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ کشمیر کے عوام خصوصاً چھوٹے موٹے کام کرنے والے غریب لوگ اِن حالات میں کِس طرح زِندگی گزارتے ہونگے۔ مَیں تذبذب میں تھا کہ اِس واقعے سے متعلق شکایت چیف سیکریٹری سے کروں نہ کروں۔ کیونکہ عوام کی طرف سے ایسی سینکڑوں شکائتیں آئے دِن سُننے میں آتی تھیں۔ کبھی کِسی کا خاطر خواہ نتیجہ تو سامنے آیا نہیں تھا۔

ڈائریکٹر لائبریریز کی اپنی پانچ مہینے کی پوسٹنگ کے دَوران جہاں مَیں نے صوبہ لداخ کا دَورہ کِیا وہیں کشمیر کے الگ الگ اندرونی عِلاقوں میں دہشت گردی سے متعلق حالات کی وجہ سے بند پڑے کتب خانوں کو دوبارہ کھلوانے کی غرض سے وہاں بھی دَورے کِئے۔ اِس دَوران مَیں نے دیکھا کہ کشمیر کے بیشتر اندرُونی عِلاقوں میں چھوٹے موٹے ندی نالوں پر اکثر وبیشتر پُل ٹوٹے پڑے تھے۔ زیادہ تر سرکاری مدرسوں کی عِمارتیں یا تو جلادی گئی تھیں یا پھِر ٹوٹی پھوٹی ہوئی تھیں۔ کئی ایک جگہوں پر تحصیل بلاک اور دوسرے سرکاری دفتروں کی عِمارتیں بھی یا تو جلی سڑی پڑی تھیں یا ٹوٹی پھوٹی ہوئی۔ کئی جگہوں پر کتب خانے بھی اِسی وجہ سے بند پڑے تھے۔ اِس اجتماعی شِکستگی کے لِئے الگاوٗ پسند حلقے فوج اور پولیس کو ذِمّے دار ٹھہراتے تھے جب کہ سرکاری سیاسی حلقوں کی طرف سے اِس کا ذِمہ دار اِنتہا پسندوں کو ٹھہرایا جاتا۔ جو بھی ہو نقصان غریب عوام کا ہو رہا تھا۔ سکولوں میں تعلیم کا نقصان ہسپتالوں میں صحتِ عامہ کا نقصان اور دوسرے سرکاری دفتروں میں عوام کے چھوٹے موٹے کاموں کا نقصان۔ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر جان تو بے چارے خربوزے کی ہی جاتی ہے۔ ایک طرف سرکاری بددیانتی، بدنظمی، بدنیتی اور ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ کے خِلاف عوام

میں کڑواہٹیں تھیں، دُوسری طرف سرحد پار سے ہتھیار بند تحریک کی ٹریننگ لے کر آنے والے نوجوان بھی عوام میں ہند مخالِف پروپیگنڈا اور نام نِہاد آزادی کے خوابوں کو ہوا دے رہے تھے۔ اِنتہا پسندوں اور فوجی نیم فوجی دستوں کے درمیان ہونے والی گولا باری کے بیچ عام آدمی پس رہا تھا۔

ہم بھی ہیں وہی لوگ وہی شہر وہی ہے
بس آج یہ بدلی سی ہوا دیکھ رہے ہیں

بیسویں صدی کی نوہیں دہائی سے پہلے کشمیر میں کبھی چھرے بازی تک کی واردات دیکھنے سُننے میں نہیں آتی تھی، مگر اِسی صدی کی آخری دہائی میں آج بھارتی افواج کی گاڑیوں بلکہ قافلوں (Convoys) پر مسلّح حملے ہو رہے تھے۔ کئی ایک ریاستی وُزراُ کی گاڑیوں کو زمین دوز بارُودی سرنگوں سے اُڑایا جا رہا تھا۔ ایک طرف تو ہتھیار بند گوریلا جنگ کے ذریعے اِنتہا پسند بھارتی افواج اور نیم فوجی دستوں کے لِئے دردِ سر بنے ہوئے تھے دوسری طرف عوام میں بھارت سرکار اور ریاستی سرکار کے خِلاف تلخیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ اِنسانی حقوق کی خِلاف ورزیوں اور زنا بالجبر کے الزامات اکثر فوجی و نیم فوجی دستوں پر لگائے جا رہے تھے۔ بھارت سرکار اور ریاستی سرکار کی طرف سے ایسی شِکایات کو اکثر نکار دِیا جاتا لِہٰذا عوام کا غُصّہ مُسلسل اُبل رہا تھا۔

میری اور میرے دوسرے جموں سے تعلق رکھنے والے Colleague افسروں کی خواہش تھی کہ نوکری کی اِس سطح پر ہمیں بھی ضِلع کے Collector یعنی ڈِپٹی کمِشنر کی آسامی پر تعینات کِیا جائے۔ لیکن ایک غیر اعلان شُدہ مخصوص پوشیدہ پالیسی کے تحت

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۲ء کے زیادہ تر K.A.S افسروں کی طرح ہم ۱۹۷۷ء کے K.A.S افسروں میں سے بھی چُن چُن کر اپنے چہیتے افسروں کو ڈِپٹی کمشنر بنادِیا جاتا جب کہ باقی افسروں کو زیادہ تر ایڈیشنل ڈِپٹی کمشنر جیسی غیر اہم آسامیوں پر تعینات کر دِیا جاتا اور بہُت کم کِسی کو ڈِپٹی کمشنر بنایا جاتا۔ ریاستی اسمبلی میں صوبہ کشمیر کے لِئے ۴۴ سیٹیں رکھی گئی ہیں جب کہ صوبہ جموں کے لِئے اِن سیٹوں کی تعداد ۳۷ ہے (حالانکہ آبادی دونوں صوبوں کی لگ بھگ برابر ہے اور حدودِ اربعہ کے اعتبار سے صوبہ جموں کا عِلاقہ کشمیر کے عِلاقے کے مُقابلے میں بہُت زیادہ ہے) ایک تو اِس وجہ سے نظم ونسق میں ہمیشہ کشمیر کا ہاتھ اوپر اور جموں کا ہاتھ نیچے رہا ہے۔ شاید اِس میں بھارت سرکار کی کوئی مصلحت اندیشی (Appeasement Policy) پوشیدہ ہے جِس کے ذریعے وہ کشمیر کے نام نِہاد دانش ور طبقے کو بھارت اور بھارتی نظریۂ کشمیر کے ساتھ جوڑ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ بظاہر تو اِس مصلحت اندیشی (Appeasement Policy) کے نتائج مُثبت ہیں مگر بباطِن تصویر بالکل اِس کے اُلٹ ہے۔ جہاں تک میرا ذاتی تجربہ اور میری سمجھ کام کرتی ہے میری نظر سے آج تک جموں و کشمیر میں کشمیری زبان بولنے والا اور اکثریتی طبقے سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جو دِل سے بھارت یا بھارتی نظریۂ کشمیر کے حق میں ہو۔ گُفتار سے البتہ بھارت کے لِئے خون دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ جموں کشمیر میں بھارت اور بھارتی نظریۂ کشمیر کے زیادہ تر حمایتی یا تو ریاست کے تمام تر غیر مُسلم باشندے ہیں یا پھر صوبہ جموں کے پونچھ راجوری ڈوڈہ ضِلعوں اور کشمیر کے پہاڑی عِلاقوں میں بسنے والے غیر کشمیری یعنی پہاڑی گوجر وغیرہ باشندے ہیں۔

وہی تھا بند جس پر ہم کھڑے تھے
کھلے در بھی نظر کے سامنے تھے

جنوں میں ہم نے بے شک طے کئے تھے
کڑے لیکن بہت وہ مرحلے تھے

وہ پاگل پن ہی تھا شاید ہمارا
جو صحرا میں سمندر سوچتے تھے

یہ ہم بھی جانتے تھے اندر اندر
کہ سب نعرے ہمارے کھوکھلے تھے

اوائلِ ستمبر ۱۹۹۷ء میں میرا تبادلہ کشمیری مہاجروں (Migrants) کے معاملات کی دیکھ ریکھ کرنے والے سرکاری ادارے کے سربراہ یعنی Relief Commissioner کے طور پر کر دیا گیا۔ مَیں یہ بات بھی چھپانا نہیں چاہتا کہ اُس وقت میرے دِل میں خواہش تو کِسی ضِلع کے ڈِپٹی کِمشنر بننے کی تھی مگر سرکار نے مُجھے ایک ایسی اقلیت سے متعلق ہونے کی وجہ سے جس کا ریاست میں کوئی ووٹ بینک نہیں ہے اِس قابِل نہیں سمجھا اور ڈائریکٹر لائبریریز کی اپنی پوسٹ خوشی خوشی چھوڑ دینے کے عِوض میں مُجھے ریلیف کِمشنر بنا دِیا جبکہ اُس وقت K.A.S افسروں کی فہرست میں مُجھ سے کافی سینئیر افسر یسٰین بیگ اُس وقت Relief Organisation میں ڈِپٹی کِمشنر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ محمد یسٰین بیگ اُردُو کے شاعر بھی تھے اور میرے دوست بھی۔ دو ایک مہینے اُن کو مُجھ سے سینئیر ہوتے ہوئے بھی میرے ماتحت کام کرنا پڑا۔ جس دَوران مَیں نے اُنہیں ہمیشہ پوری

عِزّت دی۔ بعد میں اُن کا تبادلہ کہیں اور ہو گیا۔ محمّد یٰسین اِس سے پہلے ضِلع اننت ناگ کے ڈِپٹی کمِشنر رہ چُکے تھے۔ یعنی مُجھے اُس افسر کا حاکم بنا دِیا گیا جو خُود ایک ضِلع کا ڈِپٹی کمِشنر رہ چُکا تھا مگر مُجھے ڈُپٹی کمِشنر نہیں بنایا گیا۔ واہ کیا جمہُوریت ہے؟

باب - ۱۲

ستمبر ۱۹۹۷ء میں میں نے جموں میں ریلیف کمشنر (مائگرینٹس) کا عہدہ سنبھال لیا۔ ریلیف آرگنائزیشن نام کا یہ سرکاری ادارہ ۹۰-۱۹۸۹ء میں معرضِ وجود میں آیا تھا جب کشمیری پنڈت اور کچھ دوسرے مہاجر لوگ کشمیر چھوڑ کر جموں چلے آئے تھے۔ انتہا پسندی کے یک دم اُبال اور اُچھال نے ہند حمایتی ان لوگوں میں خوف کا ایک ماحول پیدا کر دیا اور وہ اپنے گھر گھاٹ کھیت کھلیان نوکری دُکان وغیرہ سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر افراتفری کے عالم میں جموں پہنچ گئے۔ سرکار نے ان لوگوں کی بازآبادکاری اور ہر قسم کی مدد کے لئے یہ محکمہ قائم کیا جو عارضی ہوتے ہوئے بھی ۳۰ سال سے زیادہ عرصے سے قائم ہے اور لگتا ہے کہ آگے بھی بدستور قائم رہے گا۔ عین بھارتی آئین کی دفعہ ۳۷۰ کی طرح جو عارضی ہوتے ہوئے بھی مستقل حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یاد رہے کہ بھارتی آئین کی دفعہ ۳۷۰ جموں کشمیر ریاست میں ایک علیحدہ آئین کی اجازت دیتی ہے اور ریاست کو دوسرے کئی معاملات میں بھی ایک خاص ریاست کا درجہ دیتی ہے۔ اس دفعہ کے تحت بھارت کی دوسری ریاستوں کا کوئی باشندہ جموں کشمیر میں نوکری یا زمین حاصل نہیں کر سکتا ہے کہ جبکہ کشمیر کا کوئی باشندہ دوسری کسی بھی بھارتی ریاست میں ایسا کر سکتا ہے۔

ان مہاجر سرکاری ملازموں کو گھر بیٹھے ان کی تنخواہ مل رہی ہے جسے Migrant [illegible] مل رہی (Salary [illegible] باقی بستیاں [illegible]

[illegible] کی فضا

بسائی گئی ہیں۔ اِن کے مسائل و مُعاملات کے حل کی غرض سے رِلیف آرگنائزیشن میں تحصیلدار اور کُچھ دوسرے افسران کیمپ کمانڈر بنائے گئے ہیں جو الگ الگ بستیوں (Camps) میں مہاجروں کی راشن سپلائی اور ماہانہ مُعاوضے کی ادائیگی کی دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔ اِس کے عِلاوہ اُن کے صحتِ عامہ، تعلیم، صفائی وغیرہ دُوسرے معاملات بھی اِنہی کمانڈروں کے ذِمّے ہیں۔

کُچھ مہاجر جنھیں افراتفری میں کوئی سرکاری رہائش گاہ مہیّا نہ کی جاسکی وہ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں اور اُن کے مُعاملات کی دیکھ ریکھ کے لِئے Migrant Zones اور زونل افسر مقرّر رکِئے گئے ہیں۔ کیمپ کمانڈروں اور زونل افسروں کے اُوپر تین ڈِپٹی کمِشنر ہیں اور سب سے اوپر (یعنی Head of the deptt.) رِلیف کمِشنر کا عُہدہ ہے۔ یہ (عارضی) ادارہ محکمہ مال کے تحت کام کررہا ہے۔ بھارت سرکار حفاظتی معاملوں کے لِئے جو پیسہ ریاستی سرکار کو دیتی ہے (Security Related Expenditure) اُسی میں سے اِس رلیف کے اخراجات بھی نِکلتے ہیں۔

کشمیری پنڈت اکثر و بیشتر پڑھے لِکھے چُست وچالاک لوگ ہیں۔ دوتین مہینے تک محکمے میں یہ افواہیں گرم رہیں کہ بیتاؔب سیاسی طور پر ایک کمزور آدمی ہے۔ اِسے کون زیادہ دیر رِلیف کمِشنر رہنے دے گا۔ یہ تو آج آیا اور کل گیا۔ لیکن جب مَیں نے بے قابو گھوڑوں کی لگامیں کسنا شرُوع کر دیں تو خطرناک سے خطرناک گھوڑے کا رویّہ بھی بھیگی بِلّی جیسا ہو گیا۔ حالانکہ اُس محکمے میں کام کرنا بہُت مُشکل تھا۔ اپنے گھروں گھاٹوں کو چھوڑ کر آئے ہوئے غُصّے پریشانی درد و غم، طرح طرح کی ذہنی وجسمانی بیماریوں کے شِکار پڑھے لِکھے لوگوں کو

سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگوں کا رویّہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے حزبِ مُخالف جیسا ہوتا تھا۔ یہ لوگ سرکار کو اور سرکاری افسروں کو اپنا دُشمن سمجھ بیٹھے تھے۔ اُن میں کئی لوگ سوچتے تھے ریاستی سرکار نے (اور خاص طور سے سرکار کے مسلم عناصر نے) اُنہیں اپنی زمین جائیدادیں چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ بھارت سرکار کا یا ریاستی سرکار کا کوئی وزیر یا بڑا افسر کیمپ میں جاتا تو یہ مہاجر اُس پر مدھو مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے اور اُسے بغیر اپنی بات سمجھائے ہی پریشان کر دیتے۔ ایسے حالات میں اکثر افسر اور دوُسرے ملازمین اپنا وقت نکالنے کی کوشش کرتے اور اپنی ذات کو مُعاملات و مسائل میں زیادہ نہیں اُلجھاتے۔ لیکن مَیں نے اِن مہاجروں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی اور یہ تہیّہ کر لیا کہ مَیں اِن کے مسائل کو حتّی الوسع حل کرنے کی کوشش کروں گا اور تہہِ دِل (Missionery spirit) سے کام کروں گا۔ جیسا مَیں نے پہلے ہی ذِکر کیا ہے کہ کشمیری پنڈت پڑھے لکھے چالاک اور سمجھ دار لوگ ہیں۔ جلد ہی اُنہیں سمجھ آگئی کہ یہ سردار سچّے دِل سے اُن کی بھلائی کے لِئے کام کرنا چاہتا ہے۔ رفتہ رفتہ کڑواہٹیں کم ہونے لگیں۔ کام کرنے میں لُطف آنے لگا۔ دونوں طرف پریشانیاں اور دباؤ (Tensions) کم ہونے لگا۔

کشمیری مائگرینٹس کی طرف سے سرکار اور رِلیف آرگنائزیشن کی مخالفت میں نِکالے جانے والے جلسوں جلوسوں کا مُدّعا اکثر اُن مہاجروں کے حق میں رِلیف کی نقد ادائگی (Monthly Cash Relief) میں تاخیر ہوتا۔ رِلیف کے اخراجات کا خرچہ Security Related Expenditure کی صورت میں بھارت سرکار کی طرف سے ریاستی سرکار کو دی جانے والی مالی اِمداد کے ایک حصّے کے طور پر رِلیف آرگنائزیشن کو مِلتا تھا۔ کبھی کبھار تو بھارت سرکار سے پیسہ آنے میں دیر ہو جاتی۔ کبھی کبھار ریاستی سرکار سے آگے

رِلیف آرگنائزیشن کو پیسہ دینے میں تاخیر ہو جاتی ۔ دونوں صورتوں میں رِلیف کمشنر اور دُوسرے متعلقہ افسروں کو مہاجروں کے زبردست غم و غُصّہ کا سامنا کرنا پڑتا۔ رِلیف کمشنر دراصل اِن مہاجروں اور سرکار کے درمیان ایک Safety Valve کی حیثیت میں تھا۔ مہاجر جن کیش رِلیف یا راشن کی ادائیگی میں تاخیر کے خِلاف غم و غُصّہ کا اِظہار کرنے کے لئِے خطرناک سے خطرناک نعرے لگانے سے بھی گُریز نہیں کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ کئی شرارتی عناصر بیچ میں کشمیر کے اِنتہا پسندوں کے نعروں سے مِلتے جلتے نعرے بھی لگا دیتے۔ لیکن سرکار کی طرف سے ہمیشہ نرمی برتنے کی ہدایات ہوُا کرتی تھیں۔ لہٰذا رِلیف کمشنر اور رِلیف کے دوسرے افسروں کو ہر طرح کے دباوٗ میں کام کرنا پڑتا۔

مُجھے یاد ہے کئی بار میرے دفتر کا گھیراوٗ کر لیا جاتا۔ کئی بار دیر رات تک مُجھے گھر نہ جانے دِیا جاتا۔ کئی بار مُجھے سِول سیکریٹریٹ سے اعلیٰ افسران یا وزراء کی طرف سے کام کے سِلسلِے میں بلاوا بھیجا جاتا مگر مَیں دفتر کے اِرد گرد ہوئے گھیراوٗ کی وجہ سے وہاں نہ پہنچ سکتا۔ لہٰذا کئی بار میری پوزیشن سرکار کے سامنے خراب ہونے تک کی نوبت آ جاتی۔ اعلیٰ پیمانے پر اکثر meetings میں رِلیف کی تاخیر ہی واحِد مدعا ہوتا۔ بھارت سرکار کی طرف سے اکثر S.R.E کے تحت دِئے گئے پیسے کا حِساب کِتاب مانگا جاتا جو مہیّا کرنے میں ریاستی سرکار کی طرف سے بوجوہ تاخیر ہو جاتی۔ رِلیف آرگنائزیشن میں مہاجر کیمپوں کے گلی کوُچوں ، نالیوں، ڈسپینسریوں، سکوُلوں، کمروں کی مرمّت میں ہوئے اخراجات کا حِساب کِتاب ایک مخصوص وقت میں مہیّا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کئی بار بھارت سرکار کی طرف سے (پچھلا حِساب نہ مِلنے کی وجہ سے) اگلی رقومات فراہم ہونے میں تاخیر ہو جاتی۔ محکمہ رِلیف میں کام کرنے والے زیادہ تر ملازم خود مہاجر کشمیری پنڈت ہی ہوتے ہیں۔ کُچھ ایک افسر

دُوسرے متعلقہ محکموں سے آتے ہیں مثلاً تحصیلدار، Accountants، اور انجینئیر وغیرہ ،ایک عجیب قسم کی لحہ لحہ بیقراری، افراتفری اور رواروی کا عالم رہتا ہے اِس محکمے کے اندر بھی اور آس پاس بھی۔

سرکار کی بظاہر پالیسی اِن مہاجروں کو واپس کشمیر بھیجنے کی ہے اور اِس اعتبار سے یہ محکمہ بجائے خود ایک عارضی محکمہ ہے مگر نہ تو مہاجر کشمیری پنڈت ہی دِل سے کشمیر واپس جانے کے لِئے تیار ہیں اور نہ سرکار کے پاس ہی کشمیر میں اُن کی بازآبادکاری کے مکمّل اور مناسب (Perfect) منصوبے میسّر ہیں۔ بظاہر سرکار کی طرف سے بھی ببانگِ دُہل مہاجر کشمیری پنڈتوں کی کشمیر واپسی کے دعوے اب عام بات ہوگئی ہے۔ کچھ ایک مہاجر کشمیری پنڈت بھی بظاہر واپسی کے لِئے تیار ہیں مگر ایک تو ایسے لوگوں کی مخالفت مہاجرین کے زیادہ تر حلقوں میں ہی ہو رہی ہے دوسرے اندر اندر اُنہیں بھی معلوم ہے کہ یہ سب کاغذی منصوبے ہیں جِن کی عمل آوری کبھی ممکن نہیں ہونے والی۔ کُچھ (مہاجر) حلقوں کا ہمیشہ یہ رویّہ ہوتا ہے کہ جب کشمیر میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے ہم لوگ واپس جانے کو تیار ہو جائیں گے اور پھر آپس میں بات کرتے ہوئے یہ لوگ اکثر کہتے ہیں کہ نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی۔

کشمیری پنڈتوں کی ہجرت ۹۰-۱۹۸۹ء سے شروع ہوئی، جو مہاجر بچّے ہجرت کے وقت دو چار برس تک کی عُمر کے تھے یا جو بعد میں پیدا ہوئے، اُن کے لِئے کشمیر کا تصوّر عَین غیر کشمیری لوگوں کے تصوّرِ کشمیر کے جیسا ہے۔ ان نوجوانوں اور اُن سے بھی آگے آنے والی نسلوں نے کشمیر دیکھا ہی نہیں۔ مُجھے نہیں لگتا کہ یہ نئی نسلیں کشمیر جا کے وہاں کے موجودہ اور آنے والے ماحول میں گھُل مِل (Adjust) سکیں گی۔ پُرانے اور بزرگ لوگ تو دُنیائے

فانی کو باری باری خیر باد کہتے جا رہے ہیں۔ نئی اور نو جوان نسلوں کے لوگ جو کشمیر سے باہر پیدا ہوئے پلے بڑھے وہ کیوں اور کس لئے کشمیر (واپس) جانا پسند کریں گے۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جس کے بارے میں سوچنے کی نہ سرکاری حلقوں میں کسی کو فرصت ہے نہ کشمیری مہاجر حلقوں میں یا پھر شاید اندر اندر سب اصلیت سے واقف ہیں اور زبانی جمع خرچ سے ایک دوسرے کو بیوقوف بنا رہے ہیں اور اگر ایسا ہے تو پھر یہ سب لوگ دراصل خود سے ہی بیوقوف بن رہے ہیں۔

محکمہ رلیف میں میری تعیناتی کے دور میں سرکار نے مہاجر کشمیریوں کی کشمیر واپسی کے لئے ایک Committee بنا رکھی تھی جس کے چیئرمین اُس وقت کے ریاست کے Planning Commissioner تھے جو خود بھی ایک کشمیری پنڈت تھے۔ رلیف کمشنر اور کچھ دوسرے سرکاری افسروں کے علاوہ کشمیری (پنڈت) مہاجروں کے کچھ نمائندے بھی اِس کمیٹی کے ارکان تھے۔ اُس وقت یعنی ۹۸-۱۹۹۷ء میں اِس کمیٹی نے ۲۹۰۰ کروڑ روپے کی لاگت کا ایک منصوبہ بھی بنایا تھا جس کے تحت اِن مہاجروں کی کشمیر واپسی کے تمام انتظامات کئے جانے تھے۔ لیکن سرکاری اور غیر سرکاری دونوں اطراف سے سنجیدگی اور مکمّل ایمانداری کے فقدان کے باعث یہ منصوبہ آج تک سرے نہ چڑھ سکا۔ حالانکہ اب تک یہ منصوبہ ۲،۹۰۰ کروڑ کے تخمینے سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

اب تو سُنا ہے کہ کشمیری پنڈت مہاجروں کے لئے سرکار نے جموں میں کئی جگہوں پر سینکڑوں ہزاروں فلیٹ تعمیر کروا دئے ہیں گویا اُنہیں مستقل طور پر جموں میں بسایا جا رہا ہے۔ ایسے میں کشمیر واپسی کا تو تصور ہی باطل ہو جاتا ہے۔

کشمیری مہاجروں کا ایک دوسرا زاویہ بھی ہے، وہ ہے مُسلم مہاجرین جن میں زیادہ تر سیاسی کارکن ہیں۔ وہ سیاسی کارکن جن کو کشمیر میں اسمبلی اور پارلیمنٹ کے اِنتخابات میں اُمیدواروں کے لِئے کام کرنے کی وجہ سے یا محض ہند حمایتی سیاسی کاروائیوں میں حِصّہ لینے کی وجہ سے حفاظتی مسائل کا سامنا ہو یعنی اِنتہا پسندوں کی طرف سے جان و مال کا خطرہ ہو۔ اُنہیں بھی (سیاسی) مہاجرین کے طور پر نقد معاوضہ دینے کا سرکار نے حُکم جاری کِیا ہؤا ہے۔ مُجھے مہاجروں کے اِس طبقے کی طرف سے بھی ہمیشہ پریشانی کا سامنا رہا۔ جو حقیقی سیاسی کارکن تھے اور جن کے حفاظتی مسائل واقعی موجود تھے اُنہیں تو مہاجر کے طور پر نقد ادائگی بجا مگر اُس دَور میں ایسے لوگوں کا گویا ایک سیلاب آ گیا جو کسی نہ کسی سیاسی لیڈر سے چِٹھی لے کر آ جاتے تھے کہ صاحب فلاں فلاں شخص میرا سیاسی پیروکار ہے۔ جائز ناجائز میں تمیز کرنا لگ بھگ ناممکن ہو چکا تھا۔ جو بھی آتا سب سے پہلے کہتا "ہم نے ہندوستان کے لِئے خون دِیا ہے"۔

اُس وقت کے ایک اعلیٰ حاکم کے کُچھ سیاسی کارکن جو میرے محکمے میں آنے سے پہلے سے سیاسی مہاجروں کے ساتھ نقد معاوضہ لے رہے تھے اُن سے متعلق ایک دِن ایک اِطلاع مِلی کہ یہ تمام لوگ اب محکمہ جنگلات میں نگہبان (Forest Guard) کے طور پر بھرتی ہو چُکے ہیں اور اب یہ مہاجرین کے طور پر معاوضہ لینے کے حق دار نہیں ہیں کیوں کہ یہ لوگ سرکاری خزانے سے تنخواہ لے رہے ہیں۔ اعلیٰ حُکام کی منظوری سے اُن تمام لوگوں کا مہاجر معاوضہ بند کر دِیا گیا۔ اُس حاکم نے ایک دِن مُجھ سے زبردست جھگڑا کِیا اور کہا کہ آپ غریبوں کے مخالف ہیں۔ آپ نے غریبوں کے پیٹ پر لات ماری ہے اور جانے کیا کیا کہا۔ اُس حاکم کے نام نہاد سیاسی کارکنوں کو دوبارہ مہاجر معاوضہ مِلنے کا تو سوال ہی نہیں تھا کیونکہ وہ سرکاری ملازم کے طور پر تنخواہ لے رہے تھے لیکن اِتنا ضرور ہوا کہ اُس نے ہمیشہ میری آئیندہ

تقرریوں ترقیوں تعیناتیوں میں طرح طرح کے مسائل پیدا کِئے جس وجہ سے مُجھے کئی طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سِلسِلہ اُس وقت تک چلتا رہا جب تک وہ شخص وزیر رہا۔

میرے محکمہ رِلیف میں آتے آتے وزیرِ اعظم (ہند) کے ایک خصوصی اِمدادی پروگرام (Special Package) کے تحت کشمیری مہاجروں کے لِئے جموں کے پُر کھُو نام کے ایک کیمپ کے پاس ۸۰۰ ایک کمرے کے Fabricated Structures بنائے جا رہے تھے۔ یہ کمرے اُن مہاجروں کے لِئے تھے جو ابھی تک یا تو خیموں میں رہ رہے تھے یا اُنہوں نے سرکاری، نیم سرکاری عِمارتوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ محکمے کی طرف سے ایسے لوگوں کی فہرست تیار کی ہی جا رہی تھی جب کُچھ ملازموں کی مِلی بھگت سے کُچھ مہاجروں نے کمروں پر زبردستی قبضے جما لِئے۔ مَیں بہُت پریشان تھا مگر اعلیٰ حُکّام نے اِس بات کا کُچھ زیادہ خیال نہ کِیا۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ سرکاری عِمارتوں پر قبضے جوں کے توں برقرار رہے۔ پھٹے پُرانے خیموں میں رہنے والے بھی وہیں کے وہیں رہے اور کُچھ دوسرے مہاجروں نے زبردستی کمروں پر قبضے جما لِئے۔

اِس سِلسلے کی ایک اور بات مُجھے یاد آتی ہے کہ اعلیٰ سرکاری حلقوں کی طرف سے مُجھ پر دباؤ ڈالا گیا تھا کہ مَیں اِن ۸۰۰ کمروں میں سے کُچھ ایک کمرے مُسلم سیاسی مہاجروں کے نام الاٹ کر دوُں۔ مَیں نے اعلیٰ حُکّام کی یہ بات ماننے سے صاف اِنکار کر دِیا اور کہہ دِیا کہ اگر سرکار کی پالیسی یہی ہے تو مُجھے یہاں سے تبدیل کر دِیا جائے۔ بعد میں چاہے سیاسی کارکُنوں کو بھی کمروں کی الاٹ منٹ کر دی جائے۔ مُجھے اِس وجہ سے بالواسطہ بِلا واسطہ سرکاری عتاب کا بھی شِکار ہونا پڑا۔ لیکن اگر مَیں اُس وقت اُن (مُسلم) کشمیری سیاسی

کارکُنوں کو بھی مہاجر پنڈتوں کے ساتھ کمرے الاٹ کر دیتا تو (میرا ماننا تھا) پنڈت اور مُسلم مہاجروں کے بیچ کئی طرح کے مسائل پیدا ہو جاتے کیونکہ ابھی تک زیادہ تر پنڈت مہاجروں میں کشمیر کے مُسلم سماج کے تئیں غم وغُصّے کے زبردست جذبات موجود تھے اور وہ سوچتے تھے کہ اُن کی ہجرت کی وجہ اِنتہا پسندوں کے ساتھ ساتھ عام کشمیری مُسلم بھی تھے۔ بے شک مُجھے نوکری میں کئی طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا (کیونکہ اعلیٰ حکومتی حلقوں میں میرے خِلاف اِس وجہ سے سخت ناراضگی تھی) مگر آج بھی کشمیری پنڈت مہاجر ہی نہیں بلکہ دوُسرے کئی مُثبت رویّہ رکھنے والے حلقوں میں بھی میری اِس مُدبّرانہ حکمتِ عملی کی تعریف کی جاتی ہے۔

محکمہ رِلیف میں کام کر کے مُجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر سرینگر اور کِسی حد تک اننت ناگ وغیرہ قصبوں سے تعلّق رکھنے والے کشمیری پنڈت زیادہ تر سرکاری محکموں میں اور سول سیکریٹیریٹ میں ملازمین کے طور پر کام کرتے رہے ہیں جبکہ دور دراز (خاص طور سے کپواڑہ وغیرہ) عِلاقوں میں اور خاص طور سے دیہی عِلاقوں میں کشمیری پنڈت لوگ زمین دار اور دوُسرے چھوٹے موٹے کام کرنے والے بھی موجوُد رہے ہیں۔ شہری عِلاقوں میں رہنے والے پڑھے لکھے چُست وچالاک لوگوں کی وجہ سے سارے کے سارے کشمیری پنڈت طبقے کا بظاہر تاثر ایک چالاک اور خود پرست طبقے کا بن چُکا تھا جب کہ اصلیت اگر اِس کے بالکُل اُلٹ نہیں ہے تو کم سے کم اِس سے الگ ضرُور ہے۔ مَیں بذاتِ خود اِس اصلیت سے دوچار ہوُا کہ کپواڑہ، اننت ناگ، پلوامہ، بڈگام وغیرہ کے دوُر دراز گاؤں کے کئی کشمیری پنڈت سیدھے سادے شریف اُلنفس اور دوُسروں کے لِئے ہمدردی بھرا دِل رکھنے والے بھی ہیں۔

اُن دِنوں میرے دفتر میں آ کر کشمیری مہاجر جب اپنی ہجرت کے قصّے سُناتے اپنے بُرے دِنوں اور کالی راتوں کا ذِکر کرتے تو مجھے اپنے والدین اور کُچھ دوُسرے بزرگوں کے سُنائے ہوئے وہ قصّے یاد آ جاتے جو ۱۹۴۷ء میں ہندو سِکھ مہاجروں کے پاکستان کے قبضے والے کشمیر کے عِلاقوں سے سرحد کے اِس طرف کی ہجرت سے متعلق تھے۔ مَیں اکثر سوچنے لگتا کہ آج بھی پونچھ مظفر آباد اور میرپور وغیرہ کے لاکھوں ہندو سِکھ مہاجرین جموں اور ہندوستان کے کئی دوُسرے عِلاقوں میں بھٹک رہے ہیں۔ جہاں آج کشمیری پنڈت مہاجروں کو ۵۰۰۰ روُپے فی کُنبہ ماہانہ معاوضہ اور مُفت راشن مِل رہا ہے وہیں ۱۹۴۷ء کے اِن مہاجروں کو سرکار نے کُل وقتی معاوضے کے طور پر صِرف ۳۵۰۰ روُپے فی کُنبہ دے کر اُن کی طرف سے مُنہ موڑ لیا۔ سیالکوٹ وغیرہ پاکستانی علاقوں سے آئے ہوُئے مہاجرین ۶۵ سال تک ریاست میں رہنے کے باوجود نہ یہاں زمین خرید سکتے ہیں اور نہ سرکاری نوکریاں ہی حاصِل کر سکتے ہیں۔ یہ مہاجر آج تک اپنی حتمی باز آبادکاری کے لِئے بے سوُد لڑ رہے ہیں۔ ریاستی سرکار کے کانوں پر جوُں تک رینگ رہی ہے نہ بھارت سرکار ہی اِن بے بس لاچار اور سیاسی سطح پر کمزور ہندوستانیوں کے بارے میں کُچھ سوچ رہی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے تعلق سے بھارت سرکار کی پالیسی ویسے بھی یہی ہے کہ بھارت مُخالف عناصِر کو ہر طرح سے بھارت کے ساتھ جوڑنے کی کوشِش جاری رکھی جائے۔ جو پہلے سے ہی بھارتی ہے اُس کے بارے میں کِسی قِسم کی فِکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لہٰذا جموں و کشمیر میں رہنے والے ہند حمایتی ہمیشہ محسوس کرتے رہے ہیں کہ اُن کے ساتھ ہر طرح سے تفرقہ آمیز سلوک جاری رکھا جا رہا ہے۔

سال ۱۹۹۹ء ادبی اعتبار سے میرے لِئے ایک اہم سال تھا۔ میری پیدائش ۲۶

جولائی ۱۹۴۹ء کی ہے۔ ۲۶ جولائی ۱۹۹۹ء کو مَیں اپنی عُمر کے پچاس سال مکمل کر چُکا تھا۔ اِسی سال (یعنی ۱۹۹۹ء جولائی ۲۶) کے دِن میری غزلوں کا پہلا دیونا گری رسم الخط کا مجموعہ ''کیکٹس اور گُلاب'' شائع ہوُا۔ اُسی سال میری کُچھ نظموں کا ترجمہ عزیز (بھوپیندر) پرِ ہار نے کِیا۔ یہ نظمیں The Third Strand کے نام سے Writers' Workshop Calcutta نے شائع کی تھیں۔ دی تھرڈ سٹرینڈ ایک نہایت خوبصورت سبز کاغذ پر چھپی ہوئی بنگال کی زرہس ساڑھی کے کپڑے کی جلد بندی والی کِتاب ہے۔ جِلد پر عنوان کے الفاظ بھی سنہری پانی سے چھپے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں کِتابیں میری شاعری کی (اُردُو کے روایتی ادبی حلقوں سے باہر) دوُر دوُر شہرت کی باعث بنی ہیں۔

۲۱/۲۰/۱۹ نومبر ۱۹۹۹ء کو دہلی میں ساہتیہ اکادمی کے دفتر میں ''آزادی کے بعد اُردُو شاعری'' پر سہ روزہ سیمینار منعقد ہوُا۔ اِس سیمینار میں مقالات کے عِلاوہ ہندوستان کے ۴۵ مُنتخب شاعروں کو ''مَیں اور میری آواز'' کے تحت اپنی بات کہنے کا موقع دِیا گیا۔ اس پروگرام میں شمولیت میرے لِئے باعثِ فخر تھی۔ ساہتیہ اکادمی اپنے تمام پروگراموں کے مشمولات کو کتابی صورت میں شائع کرواتی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اُردُو دُنیا کے بہُت بڑے نقاد و مُحقق ہیں۔ آپ کی اُردُو سے متعلق خِدمات گِنتی سے پرے پھیلی ہوُئی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر رہتے ہوئے اُنہوں نے اکادمی میں اُردُو زبان و ادب کی حیثیت (Position) اِتنی مستحکم بنادی ہے جِسے اُردُو والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ مُجھے اِس بات کا بھی ملال ہے کہ نارنگ صاحب اور (شمس الرحمٰن) فاروقی صاحب کے درمیان بحث و مباحثہ کے سِلسِلے آئے دِن زور پکڑتے جارہے ہیں۔ جہاں فاروقی صاحب نے میرے ادبی ذوق کے پروان چڑھنے میں میری رہنمائی کی ہے وہیں نارنگ صاحب نے ساہتیہ اکادمی اور

دُوسرے کئی ادبی حلقوں میں میری پذیرائی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ نارنگ صاحب کا یہ احسان مَیں کبھی نہیں بھلا سکتا۔

کو بکو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

(پروین شاکر)

کیونکہ مَیں اِن دونوں معتبر ادبی شخصیتوں کا برابر کا احترام کرتا ہوں۔ اِس لئے مَیں کبھی کِسی نام نہاد ادبی کیمپ میں داخِل نہ ہو سکا۔ شجاع خاورؔ کا ایک شِعر یاد آتا ہے

ہم صوفیوں کا دونوں طرف سے زیاں ہُوا
عرفانِ ذات بھی نہ مِلا رات بھی گئی

میری حسرت ہے کہ فاروقیؔ صاحب اور نارنگؔ صاحب پھر اُسی طرح گھی شکّر نظر آئیں جس طرح اُن دِنوں تھے جب پہلی بار فاروقیؔ صاحب نے سرینگر میں مجھے نارنگؔ صاحب سے مِلوایا تھا اور نارنگؔ صاحب نے مُجھ سے ایک غزل سُننے کے بعد کہا تھا ''امکانات ہیں''۔

رِلیف آرگنائیزیشن میں ایک Missionery Spirit کے ساتھ کام کرتے ہوئے پریشان حال لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے مَیں نے سَوا دو سال نِکالے۔ میری کارکردگی سے اکثر و بیشتر کشمیری مہاجرین بہت خوش تھے مگر اعلیٰ حکمران میری آزادانہ کارکردگی سے زیادہ خوش نہیں تھے۔

جولائی ۱۹۴۹ء کی ہے۔ ۲۶ جولائی ۱۹۹۹ء کو مَیں اپنی عُمر کے پچاس سال مکمل کر چُکا تھا۔ اِسی سال (یعنی ۱۹۹۹ء جولائی ۲۶) کے دِن میری غزلوں کا پہلا دیوناگری رسم الخط کا مجموعہ ''کیکٹس اور گُلاب'' شائع ہوُا۔ اُسی سال میری کُچھ نظموں کا ترجمہ عزیز (بھوپیندر) پرِہار نے کِیا۔ یہ نظمیں The Third Strand کے نام سے Writers' Workshop Calcutta نے شائع کی تھیں۔ دی تھرڈ سٹرینڈ ایک نہایت خوبصورت سبز کاغذ پر چھپی ہوئی بنگال کی زریں ساڑھی کے کپڑے کی جلد بندی والی کِتاب ہے۔ جِلد پر عنوان کے الفاظ بھی سنہری پانی سے چھپے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں کِتابیں میری شاعری کی (اُردُو کے روایتی ادبی حلقوں سے باہر) دوُر دوُر شہرت کی باعث بنی ہیں۔

۲۱/۲۰/۱۹ نومبر ۱۹۹۹ء کو دہلی میں ساہتیہ اکادمی کے دفتر میں ''آزادی کے بعد اُردُو شاعری'' پر سہ روزہ سیمینار منعقد ہوُا۔ اِس سیمینار میں مقالات کے عِلاوہ ہندوستان کے ۴۵ مُنتخب شاعروں کو ''مَیں اور میری آواز'' کے تحت اپنی بات کہنے کا موقع دِیا گیا۔ اس پروگرام میں شمولیت میرے لِئے باعثِ فخر تھی۔ ساہتیہ اکادمی اپنے تمام پروگراموں کے مشمولات کو کتابی صورت میں شائع کرواتی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اُردُو دُنیا کے بہُت بڑے نقاد و محقق ہیں۔ آپ کی اُردُو سے متعلق خِدمات گِنتی سے پرے پھیلی ہوُئی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر رہتے ہوئے اُنہوں نے اکادمی میں اُردُو زبان و ادب کی حیثّیت (Position) اِتنی مستحکم بنادی ہے جِسے اُردُو والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ مُجھے اِس بات کا بھی ملال ہے کہ نارنگ صاحب اور (شمس الرحمٰن) فاروقی صاحب کے درمیان بحث و مباحثہ کے سِلسِلے آئے دِن زور پکڑتے جارہے ہیں۔ جہاں فاروقی صاحب نے میرے ادبی ذوق کے پروان چڑھنے میں میری رہنمائی کی ہے وہیں نارنگ صاحب نے ساہتیہ اکادمی اور

دُوسرے کئی ادبی حلقوں میں میری پذیرائی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ نارنگ صاحب کا یہ احسان مَیں کبھی نہیں بھُلا سکتا۔

کو بکو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

(پروین شاکر)

کیونکہ مَیں اِن دونوں معتبر ادبی شخصیتوں کا برابر کا احترام کرتا ہوں۔ اِس لِئے مَیں کبھی کِسی نام نِہاد ادبی کیمپ میں داخِل نہ ہوسکا۔ شجاع خاورؔ کا ایک شِعر یاد آتا ہے

ہم صوفیوں کا دونوں طرف سے زیاں ہُوا
عرفانِ ذات بھی نہ مِلا رات بھی گئی

میری حسرت ہے کہ فاروقیؔ صاحب اور نارنگؔ صاحب پھِر اُسی طرح گھی شکّر نظر آئیں جِس طرح اُن دِنوں تھے جب پہلی بار فاروقیؔ صاحب نے سرینگر میں مجھے نارنگؔ صاحب سے مِلوایا تھا اور نارنگؔ صاحب نے مُجھ سے ایک غزل سُننے کے بعد کہا تھا ''امکانات ہیں''۔

رِلیف آرگنائیزیشن میں ایک Missionery Spirit کے ساتھ کام کرتے ہوئے پریشان حال لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے مَیں نے سَوا دو سال نِکالے۔ میری کارکردگی سے اکثر و بیشتر کشمیری مہاجرین بہت خوش تھے مگر اعلٰی حکمران میری آزادانہ کارکردگی سے زیادہ خوش نہیں تھے۔

رہے ہم سے خفا خفا حاکم

ہم رہے اپنی حکمرانی میں

اُسی زمانے میں غالباً ۱۹۹۹ء کے کِسی مہینے میں دس پندرہ دِن کی چھٹّی لے کے انو اور چوچو کے ساتھ میں نے نیپال کی سَیر کا پروگرام بنایا۔ دہلی سے لگ بھگ دو گھنٹے کا ہوائی سفر کر کے ہم کاٹھ منڈوُ پہنچے۔ ہوائی اڈّے سے باہر نِکلتے ہی ایک عجیب اپناپن دِکھائی دِیا نیپال کے لوگوں میں بھی اور زمین میں بھی۔ جانے کیوں مُجھے یوں لگا جیسے مَیں کِسی بیرونی مُلک کا سفر کر کے اپنے وطن میں واپس آرہا ہوں۔ تمام تر مرد و زن اِس محبت سے مِل رہے تھے جیسے ہمارے کوئی قریبی رِشتہ دار ہوں۔ نیپال کے بازاروں میں ہندوستانی روپیہ شان سے چلتا تھا۔ اُس زمانے میں بھارت کے ایک روپے کے بدلے نیپالی Currency میں ایک روپیہ ساٹھ پیسے مِلتے تھے۔ وہاں کے دوکاندار وغیرہ ہندوستانی روُپے میں لین دین کرنا زیادہ پسند کرتے تھے بنسبت نیپالی روُپے کے۔ اکثر بازاروں میں اور بازاروں کے ساتھ لگتے گھروں میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کو مَیں نے ہمیشہ بڑے محبت بھرے انداز میں میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے اور مُجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پایا۔ جب مَیں نے اِس بات کا ذِکر انُو اور چوچو سے کِیا تو چوچو نے جو اُن دِنوں 10-9 برس کی تھی بڑی تنک مزاجی سے بس ''اونھ'' کہا۔

بعد میں ٹیکسی کار کے ذریعے نیپال کی پوکھراں جھیل کے لِئے روانہ ہوتے ہوئے ہمارے گائڈ مسٹر رانا نے بتایا کہ نیپال کے لوگ سرداروں (سِکھوں) کو بڑی عِزّت کی نِگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ سرداروں نے نیپالیوں کو گاڑی چلانا (Motor Driving) سِکھایا ہے

اور سرداروں نے ہی سب سے پہلے نیپالیوں کو کام کاج کے لِئے اپنی گاڑیوں میں India لے جانا شروع کِیا تھا۔ یہ سُن کر مجھے خیال آیا کہ جموں کشمیر میں اور خاص طور پر صوبہ جموں میں سِکھوں کا سب سے بڑا پیشہ بس، ٹرک اور ٹیکسی وغیرہ چلانا ہی رہا ہے۔ پچھڑے ہوئے لُٹ لُٹا کر پاکستانی مقبوضہ کشمیر سے مہاجر بن کر۔ ۱۹۴۷ء میں صوبہ جموں میں آ بسنے والے سِکھ کنبوں کے لِئے سِوائے موٹر گاڑی سیکھنے اور چلانے کے اور کوئی دُوسرا پیشہ آسان نہ تھا۔

سیاسی سطح پر ایک معمُولی اقلیت ہونے کے ناتے سِکھوں کا جموں کشمیر میں کوئی والی وارث نہیں ہے۔ دُوسرے کہاں اِس مارا ماری کے عہد میں کِسی پر رحم کھاتے ہیں۔ مُجھے یاد ہے کاٹھ مانڈُو کے ایک شاپنگ مال میں انوُ اور چوُ چوُ دُکانوں میں خریداری کر رہی تھیں اور مَیں ایک جگہ بیٹھنے کی ایک میز پر قریب قریب سُستا رہا تھا جب ایک نہایت خوبصورت نیپالی (ہندو) عورت جو عُمر میں ۳۵/۳۰ برس کی رہی ہوگی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور مُجھ سے مخاطب ہوُئی، ''آپ اِنڈیا میں کہاں رہتے ہیں''؟ میں نے جواباً کہا، ''جموں میں......پنجاب کے قریب'' وہ بولی، ''آپ مُجھے اپنی گاڑی میں دِلّی تک ساتھ لے جائیں گے؟ میرے پتی دو سال پہلے دِلّی گئے تھے کام کرنے کے لِئے، آج تک اُن کا کُچھ پتہ نہیں۔ مَیں اُنہیں ڈھونڈنا چاہتی ہوں''۔ اُس نے مُجھے سردار (سِکھ) دیکھ کر ٹرک ڈرائیور سمجھ لیا تھا۔ میرے دِل سے آواز آئی، ''کاش مَیں واقعی ٹرک ڈرائیور ہوتا اور اُسے دِلّی تک ساتھ لے جاتا''، مگر ہمیں ہوائی سفر کرنا تھا۔ مَیں نہ چاہتے ہوُئے بھی اُس سے معذرت کرنے کے سِوا اور کچھ نہ کر سکا۔ آنکھوں میں البتہ آنسوُ ضرُور آ گئے۔ یہ وہی دَور تھا جب اپنے مُلک ہندوستان میں ہی سِکھ (سردار) کو دیکھتے ہی لوگ سوچتے اور بولتے بھی تھے کہ آ گیا اُگروادی (دہشت گرد)'' اپنے مُلک میں اعتبار گنوا اور لٹا چکے لوگوں کے لِئے نیپال میں وہ اعتبار دیکھ کر جو عجیب

وغریب خوش کن کیفیت مُجھ پر طاری ہوئی وہ آج بھی طاری ہے اور عُمر بھر طاری رہے گی۔

اُس وقت مُجھے یاد آیا کہ کِس طرح دِلّی ہوائی اڈّے پر نیپال کے لِئے جہاز پر جانے سے پہلے کُچھ حاکموں نے مُجھے پریشان کیا۔ مُجھ سے شناختی کارڈ مانگا گیا تو مَیں نے اپنا سرکاری Identity Card دِکھایا جِس کے مطابق مَیں جمّوں کشمیر سرکار کا Relief Comissioner تھا۔ متعلقہ حاکم جو مُجھے دیکھ کر ہی گویا نالاں تھے بولے کوئی اور شناختی کارڈ دِکھایئے۔ مَیں نے کہا ''صاحب مَیں جمّوں کشمیر کا سرکاری افسر ہوُں اور یہ میرا سرکاری شناختی کارڈ ہے'' وہ بولے ''یہاں جمّوں کشمیر کا کارڈ نہیں چلتا بھارت سرکار کا کوئی شناختی کارڈ دِکھایئے۔ مَیں نے اپنا بڑا Attathcie Case کھولا اور اُس میں سے اپنا PAN کارڈ نِکالا جِس پر وہ صاحب خاموش ہو گئے، لیکن انُو کا شناختی کارڈ جو اُن کا Driving licence تھا اُسے دیکھ کر بِپھر پڑے اور بولے یہ اِن کا licence کیسے ہوسکتا ہے۔ اِس میں تو بال کٹے ہوُئے ہَیں جب کہ اِن کے لمبے بال ہَیں۔ اِتنی دیر میں لمبی قطار میں پیچھے کھڑے لوگوں نے اُس حاکم پر چِلاّنا شرُوع کر دِیا۔ کُچھ ایک نے تو کہا سردار جی اِسے کُچھ دے دِلا کر نِکل جایئے۔ اُس حاکم کو شاید شرم آ گئی یا دُوسرے لوگوں کے غُصّے سے ڈر کر اُس نے ہمیں جہاز کی طرف پیش قدمی کرنے کی اجازت دے دی۔ سارا مسئلہ میری داڑھی اور پگڑی کا تھا لیکن مَیں اِن چھوٹی چھوٹی رِعایتوں کے لِئے اپنا مذہب تو نہیں بدل سکتا۔

یاد رہے کہ شادی سے پہلے انُو کے بال کٹے ہوُئے تھے اور اُن کے Driving licence پر اُسی زمانے کی تصویر تھی۔

نیپال میں ہم نے بھگت پُور نام کی مندروں سے بھر پور وہ بستی بھی دیکھی جہاں دیو

آنند کی مشہورِ زمانہ فلم ''ہرے راما ہرے کرِشنا'' کی کافی شوٹنگ ہوئی تھی اور خاص طور سے کِشور کُمار اور لتا منگیشکر کا گایا ہوا ''کانچی رے کانچی رے پریت میری سانچی رُک جانہ جا دِل توڑ کے'' نغمہ فِلمایا گیا تھا۔ نیپال کے گوری شنکر پربت پر جاپتی ناتھ کا مندر، بودھ ناتھ کا مندر، ماؤنٹ ایورسٹ، پوکھراں جھیل، نیپال کے مرد نیپال کی عورتیں نیپال کے بچّے ہمیشہ میرے دِل میں رہتے ہیں اور جہاں بھی مَیں جاتا ہوں میرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دِل میں خواہش ہے کہ ایک بار پھِر سے نیپال کا سفر کرُوں۔ دیکھیئے کب یہ خواہش پوری ہو۔

وہی اِک جُستجُو دشت وجبل کی
وہی کاغذ پہ اِک نقشہ ہمارا

☆☆☆

باب-۱۳

دسمبر ۱۹۹۹ء تک رلیف کمشنر رہنے کے بعد میرا تبادلہ دوبارہ سِول سیکریٹیریٹ میں ایڈیشنل سیکریٹری محکمہ مال (Revenue Deptt) کے طور پر ہو گیا۔ سِول سیکریٹیریٹ میں کام تو بنیادی نوعیت کا اور بڑا اہم (Important) ہوتا ہے لیکن فیلڈ پوسٹنگ کے مقابلے میں تھوڑا آرام بھی رہتا ہے۔ صُبح دفتر میں آیئے شام تک گھر چلے جایئے اور پھر اگر دفتر میں کوئی خاص کام نہ ہو تو سنیچر کے دِن بھی چھٹّی کا لُطف اُٹھایئے اور گھر کے کام کاج پر بھی دھیان دیجئیے جب کہ فیلڈ میں نہ دِن ہوتا ہے نہ رات نہ سنیچر نہ ایت وار۔ صُبح شام کام ہی کام۔

سیکریٹیریٹ کے محکمہ مال میں مَیں نِسبتاً کم پریشانی کے عالم میں کام کر رہا تھا اور تھوڑا بہُت انُو اور چوُ چوُ کی طرف بھی دھیان دے رہا تھا جب شاید سرکار کے اعلیٰ ترا اور اعلیٰ ترین حُکام کو اِس بات کا اندازہ ہو گیا کہ سرکار کا ایک افسر کُچھ آرام سے دِن گزار رہا ہے۔ سیاسی طور پر کمزور اور بے آسرا افسر لوگ اپنے جیسے ساتھی افسروں میں بیٹھ کر جب کبھی گفتگو کرتے ہیں تو ایک جُملہ اکثر دُہرایا جاتا ہے کہ سرکار کو اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی افسر اپنی موجودہ تعیناتی پر بہُت خوش ہے تو اُسے فوراً وہاں سے تبدیل کر دِیا جاتا ہے اور اگر یہ پتہ چلے کہ کوئی افسر اپنی پوسٹنگ پر پریشان ہے تو اُسے وہیں سڑنے دِیا جاتا ہے۔

مُشکل سے میرے آٹھ مہینے پورے ہوئے تھے محکمہ مال میں جب میرا تبادلہ Himalyan Wool Combers نام کے ایک خودمُختار (Autonomous) صنعتی

ادارے (Corporation) میں ایم۔ڈی (Managing Director) کے طور پر کر دِیا گیا۔ ساتھ ہی سرکار نے اُس ادارے کو بند (Close) کرنے کا حُکم بھی جاری کر دِیا۔ یعنی مُجھے اُس نیم سرکاری ادارے کو باقاعدہ اور قانون کے مُطابق بند کرنے کے لِئے ایم۔ڈی۔ لگایا گیا تھا۔ سرکار کے خودمُختار اداروں کو قائم کرنا تو بڑا کام ہوتا ہی ہے مگر اُنہیں قانونی طور پر بند کرنا اُس سے بھی بڑا اور مُشکل کام ہوتا ہے۔ شاید کُچھ اعلیٰ حُکّام نے سوچ لِیا تھا کہ کم سے کم ایک اُونٹ تو پہاڑ کے نیچے آیا یعنی یہ بیتابؔ نام کا اکڑ پھوں شاعر افسر تو لگ گیا اِس کام پر جہاں سے فارغ ہونا اُس کے لِئے سُبکدوشی (Retirement) سے پہلے مُمکن ہی نہ ہوگا۔

کِسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''مدّعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو منظورِ خُدا ہوتا ہے۔'' میری قانون کی پڑھائی کام آ گئی اور آٹھ مہینے کے اندر اندر مَیں نے Himalaya Wool Combers کو بند کرنے کی تمام قانونی کاروائی مکمّل کر لی اور سُرخرُو ہو کے مَیں پھر سے سرکار کے سر چڑھ بیٹھا۔

ریاست جموّں و کشمیر میں ہمالین وُول کمبرس ایک اکیلا صنعتی کارخانہ/ادارہ تھا،جس میں بھیڑ بکری کی اُون سے دھاگے کے گولے (Wool Tops) تیار کِئے جاتے تھے۔ مُجھے بتایا گیا تھا کہ ۷۹-۱۹۷۸ء کے آس پاس اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے بڑے شوق (Ambition) سے اپنی دیکھ ریکھ میں بڑی عمدہ جرمن (German) مشینری منگوا کر یہ کارخانہ لگوایا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ دراصل ریاست کے بھیڑ بکری پالنے والے پچھڑے ہوئے گوجر بکروال اور گدّی طبقے کی بہبود و بہتری چاہتے تھے۔ ریاست جموں و کشمیر میں پیدا

ہونے والی عُمدہ سے عُمدہ اُون جو بھیڑ بکریوں سے برآمد ہوتی ہے اُس کا صحیح مالی فائیدہ گوجر بکروال گدّی اور دُوسرے بھیڑ بکری پالنے والوں کو پہنچانے کا اور پچھڑے ہوئے اِن طبقوں کی خوشحالی کا جو خواب شیخ محمد عبداللہ نے دیکھا تھا اُسے کِس بے دردی سے Himalyan Wool Combers میں وقتاً فوقتاً آنے والے اَفسروں اور دوسرے ملازموں نے مِل جُل کر تحس نحس کر دِیا تھا۔ اِس کا اندازہ مُجھے اِن آٹھ مہینوں میں بخوبی ہو گیا۔ اگر میری تقرّری یہاں نہ ہوئی ہوتی تو نِظام (Administration) کے اِس پہلوُ کا مُجھے کبھی تجربہ نہ ہوتا۔ مَیں خدا میں بے اِنتہا یقین رکھتا ہوں اور مُجھے یقین ہے کہ اُس نے مُجھے زِندگی نظام اور دُنیا کی یہ عجیب و غریب تصویر دِکھانے کے لِئے ہی میرا تبادلہ یہاں کروایا تھا۔ جس کے لِئے مَیں اُس کا ہمیشہ مشکوُر رہوُں گا۔

جو کارخانہ 70-60 کارکنوں اور ملازموں اور کامگاروں کے ساتھ بخوبی چل سکتا تھا اُس میں ملازموں کی تعداد ۱۷۰ کے قریب پہنچ چُکی تھی۔ جو بھی افسر اِس ادارے میں آیا وہ اپنے سگے سمبندھیوں اور چہیتوں کو ادارے میں نوکری پر رکھنے کا فریضہ انجام دینا نہ بھولا۔ ایک سے ایک اَن پڑھ اور نا اہل کارکُن تکنیکی عُہدوں پر تعینات کر دِیئے گئے تھے۔ ''آمدنی اُٹھنّی خرچہ روپیہ نتیجہ ٹھن ٹھن گوپال''۔ اِس پر طُرّہ یہ کہ کارخانے سے تیار شدہ اُون کے گولوں (Wool tops) کی چوری کے واقعات ایک عام بات ہو چُکی تھی۔ عُمدہ ترین جرمن (German) مشینری جو شیخ محمد عبداللہ نے ۷۹-۱۹۷۸ء میں کروڑوں روپے کی لاگت سے منگوائی تھی اب تک بُری طرح زنگ آلودہ اور جام ہو چُکی تھی۔ مُجھے یہ بات لِکھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہو رہی کہ کارخانے یعنی شیخ محمد عبداللہ کے خواب کی یہ ہتک آمیز حالت دیکھ کر مَیں کئی بار دیر دیر تک روتا رہا ہوں لیکن افسوس کہ مشینوں کی طرح چلنے والے اور لمحہ لمحہ

لوٹ کھسوٹ کی دوڑ میں شامل چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسروں اور سیاسی رہنماؤں کو اِس بات کی ذرا بھر فِکر نہیں تھی بلکہ کسی کے پاس اِس بات کی طرف دھیان کے لئے فُرصت ہی نہیں تھی۔ سرکار کسی نہ کسی طرح اس مصیبت سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔

۱۹۴۷ء کے بعد وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے ہندوستان میں سماج وادی (Socialist) انداز میں ترقّی اور عوامی بہبودی کے ایک خواب کی تعبیر کی کاوِشوں کے ایک حِصّے کے طور پر صنعتی (اور دوسری) سطح کے خود مختار ادارے قائم کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح جموں وکشمیر میں بھی صنعتی (اور کُچھ دوسرے) خود مختار اِدارے سرکار نے قائم کِئے۔ SICOP, SIDCO, JKI, J&K Minerals Tawi Scooters وغیرہ وغیرہ خود مختار ادارے اِسی سِلسلے کی کڑیاں ہیں۔ خود مُختار ادارے قائم کرنے سے سرکار کی مُراد یہ تھی کہ اِن اداروں میں سرکاری محکموں کی طرح سرکاری دخل اندازی نہ ہو (یا پھر کم سے کم ہو) اور یہ ادارے اپنے اخراجات اپنے کاروبار کے منافعے میں سے پورے کریں اور وافر منافع بھی کمائیں۔ لیکن خود مختاری یعنی سرکاری دخل اندازی نہ ہونے کا اکثر Corporations کے عُہدے داروں نے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے بد نظمی کی اِنتہا بلکہ لوٹ کھسوٹ کی اِنتہا کر دی جس کی بدترین مثال Himalayan Wool Combers کے انجام کی صورت میں میرے سامنے تھی۔

جموں کشمیر میں دو ایک Industrial Corporations کو چھوڑ کر باقی سبھی صنعتی اور دُوسرے خود مختار ادارے گھاٹے میں چل رہے ہیں اور اپنے ملازموں کی تنخواہوں کے لِئے سرکار سے بھیک مانگنے (Budgetary Support) پر مجبور ہیں۔ ریاست

جموں و کشمیر میں JKI, J&K Minerals اور State Road Transport) (Corporation(S.R.T.C. اِس بدنظمی اور بدحالی کی بدترین مِثالیں ہیں۔

پنڈت جواہر لعل نہرو نے مُلک کی ترقّی کے لِئے معاشی (Economic) سطح پر جو Socialist ماڈل (Nehruvean Model) پیش کِیا تھا اُس کے پرخچے اُڑانے میں اِن خود مختار اداروں (جنہیں Public Sector Undertakings بھی کہا جاتا ہے) نے بھی اپنا حِصّہ بخوبی ادا کِیا ہے۔ شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ۹۰-۱۹۸۹ء میں سوویت لینڈ کے اشتراکی نظام کے زوال کے ضِمن میں ہندوستان بھی سوشلزم کا راستہ چھوڑ کر پونجی واد (Captialism) کے امریکی راستے پر گامزن ہو گیا اور Globalization اور Liberalization نام کی امریکی ریل گاڑیوں پر سوار ہو گیا۔

ہمالین وُول کمبرس کو بند کرنے کے تمام اِنتظامات کے ساتھ ہی مَیں نے ملازموں کے لِئے بھی ایک Golden Hand Shake نام کی سکیم تیار کی جِس کے تحت اِن ملازموں کی نوکری سے برخاستگی کے عِوض میں اچھی خاصی مالی اِمداد دینے کا عہد تھا۔ سُنا ہے کہ بعد میں سرکار نے اِس سکیم کو کُچھ دوُسرے خستہ حال خود مختار اداروں کے ملازموں پر لاگو کرنے کے بارے میں بھی سوچنا شروع کر دِیا تھا۔ اِس ادارے میں اپنا کام تمام کر کے بلکہ اِس ادارے کا کام تمام کر کے مَیں پھِر (ایک مسئلے کی طرح) سرکار کے سامنے تھا۔

ایک خوشخبری یہ تھی کہ عَین اُسی زمانے میں یعنی اوائل ۲۰۰۱ء میں میری (نسیم لنکر اور کُچھ دوُسرے ساتھیوں سمیت) آئی۔اے۔ایس (اِنڈین ایڈمِنسٹریٹو سروس) میں تقررّی ہو گئی۔ ریاستی سِول سروس (ہر ایک ریاست میں) سے کُچھ افسر اپنی اچھی کارکردگی کی بِنا

پر ترقی دے کر آئی۔اے۔ ایس میں شامل کر لِئے جاتے ہیں۔ ہمیں آئی اے ایس میں ۱۹۹۳ء سے سینئرٹی دی گئی۔

سرکاری محکموں میں کاغذ، قلم، قلم دان اور دوسری ضرُوری اشیائے ضرُورت مہیّا کرنے کے لِئے سرکار کا ایک محکمہ ہے۔ جِسے محکمہ سٹیشنری اینڈ آفِس سپلائیز کہا جاتا ہے۔ سرکاری دفتروں میں Stationery Items مہیّا کرنے کی غرض سے اِن اشیاء کی خرِیداری کے لِئے سرکار نے ایک Purchase Committee بنا رکھی ہے۔ سرکاری چھاپہ خانوں (Govt. Presses) کے لِئے کاغذ اور مشینری وغیرہ کی خرِیداری بھی اِسی کمیٹی کے ذریعے کی جاتی ہے۔ ڈائریکٹر سٹیشنری اینڈ آفِس سپلائیز اِس کمیٹی کا سربراہ ہوتا ہے۔ سرکاری چھاپہ خانوں کے سربراہ، محکمۂ صنعت و حرفت کے Joint Director اور سِول سیکریٹرئیٹ کے ایک مالی صلاح کار اِس کمیٹی کے دُوسرے ارکان ہوتے ہیں۔

سُنا ہے کہ اپریل ۲۰۰۱ء میں محکمہ انسدادِ رِشوت ستانی (Anti Corruption Deptt.) نے کِسی شکایت کی بنا پر اِس کمیٹی کے کُچھ ارکان کو پکڑ لیا تھا۔ رِہائی کے بعد خوف کی وجہ سے کمیٹی کے تمام ارکان نے سرکاری خرِیداری سے متعلق کام کرنے کے معاملے میں ہاتھ کھڑے کر دِئے جبکہ سرکاری محکموں میں سٹیشنری سے متعلق اشیاء کی مُسلسل ضرورت رہتی ہے۔ ایسے میں سرکار کو ڈائریکٹر سٹیشنری اینڈ آفِس سپلائیز کی آسامی کے لِئے کوئی بلی کا بکرا درکار تھا۔ مَیں Himalayan Wool Combers کو بند کرنے کا کام ختم کر کے سرکار کے سامنے کھڑا تھا۔ لِہٰذا بلی کے لِئے بکرا موجود تھا۔

ڈائریکٹر سٹیشنری اینڈ آفِس سپلائیز کے عُہدے پر مَیں نے دو سال کام کِیا۔ تمام

Items کی خریداری بھی شان سے کی۔ دفتروں میں تمام ترItems با قاعدہ مہیّا بھی کی جا رہی تھیں۔ سرکاری چھاپہ خانوں کے لِئے اِس دوران میں کاغذ اور مشینری وغیرہ کی خریداری بھی خوب ہوتی رہی۔ سرکاری محکموں میں خریداری کے لِئے فوٹوسٹیٹ مشین ، Fax مشین وغیرہ بھی اُس دَوران میں منظور (Approve) کی گئیں۔ ہر کام قاعدے اور قانون کے عَین مطابق ہوتا رہا۔ محکمہ انسدادِ رشوت ستانی یا کِسی ایسی دُوسری ایجنسی کی طرف سے کِسی قِسم کی پریشانی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ڈائریکٹر سٹیشنری کے طور پر بھی مُجھے سِول سیکریٹریٹ کی طرز پر دربار موو کے ساتھ گرمیوں کے چھ مہینے سرینگر اور سردیوں کے چھ مہینے جموں میں رہنا پڑتا۔

دربار موو جموں وکشمیر کی ایک پُرانی اور عجیب وغریب بلکہ مضحقہ خیز قِسم کی رِوایت ہے۔ پورے کا پورا سِول سیکریٹریٹ اور دُوسرے (ریاستی سطح کے) محکموں کے سربراہان اپنے عملے فعلے اور پورے دفتری ساز وسامان کے ساتھ چھ مہینے کے لِئے اپریل کے مہینے میں جموں سے سرینگر کے لِئے روانہ ہو جاتے ہیں اور پھر اکتوبر کے مہینے میں واپس سرینگر سے جموں کے لِئے چل پڑتے ہیں۔ ایک پوری کی پوری سرکار چھ چھ مہینوں کے بعد خانہ بدوشوں کی طرح سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سن ۱۹۴۷ء سے پہلے یعنی آزادیٔ ہند سے پہلے مہاراجہ لوگ پورے سرکاری عملے فعلے کے ساتھ سردیوں میں جموں اور گرمیوں میں سرینگر رہتے تھے۔ گرمیوں میں جموں میں گرمی بہُت زیادہ ہوتی ہے اور سردیوں میں کشمیر میں برفباری کی وجہ سے سردی بہُت زیادہ ہوتی ہے۔ سردیوں میں سردی سے اور گرمیوں میں گرمی سے بچنے کے لِئے مہاراجہ لوگ پورے ٹھاٹھ باٹھ سے ''دربار موو'' کِیا کرتے تھے۔ آج اُسی روایت کا بھرپُور فائدہ آج کے راجے مہاراجے یعنی افسر شاہ، وُزراء و اُمرا اُٹھا رہے ہیں بے روک

ٹوک۔ صدیوں پُرانی یہ رِوایت آج جمہوری حکومتوں میں بھی جوں کی توں برقرار ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں ٹرکوں کاروں اور دوُسری گاڑیوں کا قافلہ پوری جمہوری سرکار کو سر پر اُٹھائے ہوئے جموں سے سرینگر اور سرینگر سے جموں کے لِئے ہر چھ مہینے کے بعد روانہ ہو جاتا ہے۔ کروڑوں اربوں روپے کی فضول خرچی ہر چھ مہینے کے بعد ایک پرانی شاہی روایت کو قائم رکھنے کے لِئے کی جاتی ہے۔ فضول خرچی اور پھر کرپشن یعنی کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔

اب تو دربار موو کا ایک سیاسی پہلو بھی نِکل آیا ہے۔ صوبہ جموں اور صوبہ کشمیر کے درمیان عِلاقائی عدم توازن ((Regional Inbalances)) کے اِلزام در اِلزام ایک عام بات ہے۔ کئی بار کُچھ خرمند دیوانے دربار کو جموں یا سرینگر میں سے ایک جگہ مُستقل طور پر قائم کر دینے کے بارے میں سوچتے بھی ہیں۔ لیکن پھِر سوال یہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ اگر دربار یعنی دارلخلافہ جموں میں رکھا جائے تو کشمیر کے سیاسی حلقوں کی طرف سے مخالِفت ہوگی اور اگر سرینگر میں رکھا جائے تو جموں کے سیاسی حلقے اِس کی مخالِفت کریں گے۔ للہذا یہ کروڑوں اربوں کی فضول خرچی ہر چھ مہینے کے بعد پورے ٹھاٹھ باٹھ سے ہو رہی ہے اور شاید ہوتی رہے گی۔

اُنہی دِنوں سری نگر میں میری دوست اور ساتھی آئی اے ایس افسر محترمہ نسیم لنکر نے دربار موو سے متعلق ایک عجیب و غریب واقعہ مُجھے سُنایا۔ دربار موو کے دِنوں میں دفاتر کی مِسلیں (Files) وغیرہ لوہے کے صندوقوں (Trunks) میں بند کر کے ٹرکوں پر لادی جاتی ہیں۔ سری نگر میں ایسے ہی ایک دِن نسیم سیکریٹیریٹ میں اپنے کمرے سے باہر آ رہی تھی۔ اُس کے آگے آگے صندوق اُٹھائے ہوئے دو مزدور چل رہے تھے۔ ایک مزدور ادھیڑ عُمر کا تھا

دوسرا کچّی عُمر کا لڑکا۔لڑکے نے ادھیڑ عُمر مزدُور سے کہا،''چاچا! یہ لوگ صندوقوں میں سامان بند کر کے کہاں جا رہے ہیں؟ ادھیڑ عُمر مزدُور نے جواباً کہا،''بیٹا یہ حاکم لوگ ہیں سردیوں میں برفباری برداشت نہیں کر سکتے اِس لِئے جموں چلے جاتے ہیں۔تا کہ کڑا کے کی ٹھنڈ سے محفوظ رہیں۔''لڑکے نے پھر کہا،''چاچا! یہ تو چلے جاتے ہیں لیکن ہم لوگوں کو کِس کے سہارے چھوڑ جاتے ہیں؟ ہمیں بھی تو ٹھنڈ لگتی ہے؟ ہمارے پاس تو کوئلہ بھی نہیں ہوتا اور بجلی بھی سردیوں میں بند رہتی ہے۔''ادھیڑ عُمر مزدُور نے پھر جواب دِیا،''بیٹا یہ حاکم لوگ ہیں۔اِن کے پاس بڑے بڑے سرکاری کام ہوتے ہیں کرنے کے لِئے۔اِنہیں بڑے کاموں سے ہی فُرصت نہیں مِلتی اِس لِئے اِنہیں ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں کے چھوٹے موٹے کاموں کے لِئے وقت ہی نہیں مِلتا۔تُم یہ فُضول کی باتیں چھوڑو اور صندوق کو ٹرک پر لا دو۔''

نسیم لنکر کے پاس ایک افسر کے عِلاوہ ایک حسّاس اِنسان کا دِل بھی ہے جِس نے دو مزدُوروں کی اِس گفتگو کو اِتنے دھیان سے سُنا ورنہ کہاں حاکم طبقہ (Elite Class) اور کہاں مزدور طبقہ۔کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔

نسیم بظاہر بے شک ایک افسر شاہ ہے لیکن بباطن وہ گویا ایک راہبہ ہے ایک سادھوی ہے۔کبھی کبھار میرا اُس کے اندر کے صوفی صِفت اِنسان سے سامنا ہوتا ہے۔بظاہر کڑک افسر اندر سے حد درجہ روحانیت سے اوت پروت شخصیت۔کئی بار تو اُس نے اپنے ایسے ایسے روُحانی (یعنی Metaphysical یعنی ادھیاتمک) تجربات بیان کِئے ہیں کہ جِن کا آگے بیان کرنا شاید ممکن ہی نہیں۔دراصل کشمیر میں ہر طرح کے سیاسی سماجی بھارت مخالف اور یہاں تک کہ اِنتہا پسندانہ ہنگاموں کے درمیان صوفیوں کا ایک طبقہ موجود ہے جو مُسلسل

اپنے اندرونی تجربات میں مصروف ہے۔

کیا بتائیں زمین والوں کو
تجربے اپنے آسمان کے ساتھ

کشمیر میں صوفیانہ موسیقی کا اپنا ایک مکمّل نظام ہے۔ بہُت ممکن ہے کہ یہ صوفیانہ موسیقی اپنے اصل میں ایران سے ماخوذ ہو۔ کشمیری صوفیانہ موسیقی کے پیرو کار گلوکار کشمیری، اُردُو اور فارسی میں صوفیانہ کلام گا کر پیش کرتے ہیں۔ رباب، سنتور، طبلہ اور سارنگی کا کشمیری صوُفیانہ نظام میں اپنا ایک مخصوص و مخلوُط آہنگ ہے جو سُنتے ہی بنتا ہے۔

کشمیر میں صوفیانہ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ وقتاً فوقتاً اپنے گھروں میں شام سے صوفیانہ شبِ موسیقی کا اہتمام کرتے ہیں جس میں دیر تک مخصوص کشمیری آہنگ کے تصوّف میں رنگے ہوئے سامعین رُوحانی سطح پر محظوظ ہوتے ہیں۔

نسیم کے ایک پھوپھا دانتوں کے ڈاکٹر محمد امین ہیں۔ ایک بار نسیم مُجھے میرے دانتوں کے عِلاج کے لِئے اُن کے پاس لے گئی۔ اُن کے ہاں مولانا رُوم، شیخ سعدی، غنی کاشمیری اور کُچھ دوُسرے فارسی صوفیا و شعرا سے متعلق کُتب کا انمول خزانہ دیکھ کر مَیں نے اُن سے اِس بارے میں دریافت کِیا تو معلوم ہوُا کہ تصوّف کے تعلق سے وہ فارسی شاعری کے اچھّے جانکار ہیں۔ گفتگو کے دَوران مَیں نے اُنہیں گورو گوبند سنگھ کے ایک درباری شاعر نند لعل گویا کا مندرجہ ذیل شِعر سُنایا۔

دِل اگر دانا بود اندر کنارش یار ہست
چشم گر بینا بود در ہر طرف دیدار ہست

ڈاکٹر صاحب اِس شعر پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ دیر تک اِسے دوہراتے رہے اور اُنہوں نے اپنی خاص ڈائری میں اِسے درج کر لیا۔ نسیم نے مُجھ سے کئی بار کہا کہ مَیں کشمیر میں منعقد ہونے والی صوفیانہ موسیقی کی شبانہ نشست میں کبھی اُس کے ساتھ چلوں لیکن زِندگی نِظام اور دُنیا کی اندھی دوڑ میں کبھی اِس کی فُرصت ہی نہ مِلی لیکن دِل میں زبردست خواہش ہے بلکہ حسرت ہے کہ زِندگی میں کم سے کم ایک بار ''حال'' کی اُس کیفیّت میں شمولیت کروں جِس کا ذِکر نسیم نے کئی بار کِیا ہے۔ مُجھے یاد ہے نسیم سے ایسی ہی کِسی گفتگو کے فوراً بعد میری مندرجہ غزل کے شِعر مُجھ پر نازل ہوئے تھے

سوچتا ہوں کہ ہوا ہو جاؤں
قَید سے آج رِہا ہو جاؤں

بھری دُنیا میں رہوں شامل بھی
اور دُنیا سے جُدا ہو جاؤں

بندگی میں رہوں چاہوں جب تک
اور جب چاہوں خُدا ہو جاؤں

کاش تو میری دُعا ہو جائے
اور مَیں تیری انا ہو جاؤں

شُعلہ ہو جائے سراپا میرا
مَیں اندھیرے میں ضِیا ہو جاؤں

نہ زمیں ہو نہ زمانہ بیتابؔ

مَیں خلاؤں میں خلا ہو جاؤں

ڈائریکٹر سٹیشنری کے عُہدے پر رہتے ہوئے جوُلائی (شاید ۲۰۰۱ء) میں مُجھے کُچھ دوُسرے ساتھی افسروں کے ساتھ مشہورِ زمانہ پہاڑی صحت افزا مقام مسوُری (اُترا کھنڈ) کی Indian Administrative Academy میں دو مہینے کے لِئے آئی اے ایس کے ایک ٹرینِنگ کورس کے لِئے جانے کا موقع مِلا۔ مسوُری اُس وقت بادلوں میں چھپا ہوُا لمحہ لمحہ برستی ہوُئی گھٹاؤں کا شہر تھا۔ دھُندلے بادل اکثر ہمارے کمروں کے اندر آ جاتے۔ مسوُری میں بارش ہو رہی ہو یا نہ ہو رہی ہو گھر سے باہر چھاتے کے بغیر کوئی نہیں نِکلتا۔ چھاتا اُن دِنوں اُس عِلاقے کے لوگوں کی شخصیت بلکہ جِسم کے ایک ضروُری حِصّے کی طرح ہوُا کرتا تھا۔ کُچھ دِنوں کے لِئے مَیں نے انو اور چوُچوُ کو بھی مسوُری کی آئی اے ایس اکادمی کے پانچ ستارہ ہوٹیل کی طرز کے کمرے میں اپنے ساتھ رکھّا۔ مسوُری میں ہم نے Deffence Research & Development Organisation (DRDO) کا ایک مرکز بھی دیکھا جِس کے سربراہ سابقہ صدرِ ہند اے پی جے ابوالکلام خود رہ چکے ہیں۔ (یاد رہے کہ اے پی جے ابوالکلام ہِندوستانی اٹامِک سائنس دان ہیں۔ مسوُری میں ہم نے مشہورِ زمانہ Kempty Fall بھی دیکھا۔

ہمارے ٹرینِنگ کورس کے ایک حِصّے کے طور پر ہم نے بنگلور، مَیسور، چینئی، انڈیمان نِکوبار، کلکتہ، تِری پورہ، گواہاٹی، شِیلانگ، پٹنہ صاحب اور دہلی (پارلیمنٹ) وغیرہ کا دَورا بھی کِیا۔ انڈے مان (Port Blair) جزیرے میں ہم نے وہ Cellular جیل بھی دیکھی

جس میں انگریز کالے پانی کے سزا یافتہ ہندوستانی مجاہدینِ آزادی کو رکھتے تھے۔ اُسی جیل میں ہم نے وہ کمرہ بھی دیکھا جس میں ویر ساورکر قید کاٹ چکے تھے۔ مَیں نے اُس کمرے میں ویر ساورکر کی دیوار پر بنی ہوئی بڑی تصویر کے ساتھ فوٹو بھی کھنچوایا۔

انڈے مان جزیرے کے ساتھ ہی Ross Island نام کا ایک چھوٹا سا جزیرہ بھی ہم نے دیکھا جس میں انگریزوں نے اپنے پینے کے لئے Mineral water کی فیکٹری لگا رکھی تھی جبکہ کالے پانی کی سزا پائے ہوئے ہندوستانیوں کو جیل کے اندر بنے ایک عدد کنوئیں کا گندہ اور کھارا پانی پینا پڑتا تھا۔

پورٹ بلئیر (انڈے مان) میں انڈے مان نِکوبار کے گورنر نے ہم (آٹھ) آئی اے ایس افسروں کو کھانے پر بُلایا اور اپنی سرکاری رہائش گاہ میں ہی ہمیں بڑے پردے (Big Screen) پر انڈے مان نِکوبار کے جزائر کے بارے میں ایک Documentary film کے ذرِیعے اِطلاعات فراہم کروائیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ انڈے مان نِکوبار کے سمندر میں ۵۷۲ چھوٹے بڑے جزیرے ہیں جن میں سے ۴۰ کے قریب جزیروں میں اِنسانی آبادی ہے، ۱۰ کے قریب جزیروں میں جدید تہذیب وثقافت موجود ہے جبکہ باقی جزیروں میں زیادہ تر آبادی پُرانی قبائلی طرز کی زِندگی گُزار رہی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ کُچھ جزیروں میں پُرانے چینی نسل کے اور کُچھ دوسرے جزائر میں پُرانے افریکی قبائل آباد ہیں۔ کُچھ ایک جزیروں میں ابھی تک کپڑا پہننے کا رِواج نہیں ہے۔ باہر کے لوگوں کو اُن جزیروں میں داخل نہیں ہونے دِیا جاتا۔ کوئی باہر سے اِن جزیروں میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہاں کے باشندے تیر برچھی بھالا وغیرہ اپنے روایتی ہتھیاروں کی بوچھار

کر کے دور سے ہی اُسے واپس بھگا دیتے ہیں۔ گورنر صاحب نے ہمیں بتایا کہ اب ایسے ایک آدھ جزیرے میں محکمہ سماجی بہبُود (Social Welfare) کی کارکُن عورتوں کو بھیج کر بچوں کو کپڑے پہنانے اور اُن کی تعلیم کے لِئے مدرسے (سکول) کھلوانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ نوکری سے سبکدوشی کے بعد مَیں نے جب ممبئی میں (Part time) قیام کرنے کا فیصلہ کِیا اور شغل کے طور پر یا زبان کا ذائقہ بدلنے کے لِئے بالی وُڈ کے لِئے کُچھ فِلمیں لِکھنا شرُوع کر دِیا تو ایک فِلم ایسے ہی ایک جزیرے سے متعلق بھی لِکھی۔ اِس فِلم میں غیر تہذیب یافتہ ایسے ہی ایک جزیرے میں تہذیب و ثقافت و تعلیم و معاشرتی بہبود کی روشنی پہنچانے کا پیغام موجود ہے۔ میری دِلی خواہش ہے کہ Welcome to Bingora نام کی اِس فلم کے لِئے مُجھے کوئی اچھا فِلم کار یا کوئی اچھی فِلم کمپنی مِل جائے تا کہ میرا یہ ایک Ambitious Project پائیہ تکمیل تک پہُنچ سکے۔

انڈے مان نِکو بار جزائر (دوہپ سموُہ) میں ہم نے کئی ایک چھوٹے بڑے جزیرے دیکھے۔ انڈے مان اور نِکو بار جیسے بڑے جزیروں کے عِلاوہ درمیانی سائز کے اور بالکل چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی ہم نے دیکھے۔ کشتی میں جب ہم سمندر کی سَیر کرتے تو یہ جزیرے ہمارے دائیں بائیں سے سامنے آتے اور پیچھے چھوٹتے چلتے جاتے۔ کئی جزیرے ہمارے شہروں کے سائز کے ہیں کئی محلّوں کے سائز کے اور کئی تو مکانوں (یا کم سے کم فارم ہاؤسوں) کے سائز کے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہاں سمُندر میں کئی بار کئی پُرانے چھوٹے بڑے جزیرے پانی میں ڈُوب جاتے ہیں اور کئی بار کئی نئے چھوٹے بڑے جزیرے بھی برآمد ہو جاتے ہَیں۔ کئی جزیروں کے ساتھ لگتے چھوٹے بڑے سمندری ساحلوں (Beaches) پر ہم نے خوب مزے کِئے۔ خوب صورت چھوٹے بڑے جزیروں کے خوبصورت ساحل،

صاف شفّاف پانی (Shallow waters) جِس میں نیچے Chorals صاف دِکھائی دیتے ہیں۔ پورٹ بلئیر (انڈے مان) میں جو سب سے پیاری اور خوبصورت بات مُجھے محسُوس ہوئی وہ ہے وہاں ہر طبقہ کے لوگوں کی عام بول چال کی زبان۔ وہاں ہر آدمی اِتنی پیاری ہندی (جِسے ہم اُردو بھی کہہ سکتے ہیں) بولتا ہے کہ اکثر یہ بات یاد ہی نہیں رہتی کہ ہم ہندوستان کے مرکزی ہندی اُردو عِلاقوں سے ہزاروں میل دُور بلکہ بِرصغیر ہندو پاک سے باہر سمندر میں موجود اِن جزیروں میں گھوم رہے ہیں۔ انڈے مان نِکو بار کی سرکاری زبان (Official Language) ہندی ہے۔

پورٹ بلئیر یعنی انڈے مان میں ایک اور بات نے مُجھے مسرّت آمیز لہجے میں متاثر کِیا۔ انڈے مان کی Cellular Jail میں انگریزوں نے جِن مجاہدینِ آزادی کو کالے پانی کی سزا دی تھی اُن کی فہرست وہاں دیوار پر موجود ہے۔ مُجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی اور فخر بھی محسوس ہوا کہ کالے پانی سزا یافتہ سِکھ مجاہدینِ آزادی کی تعداد اِس فہرست کے مطابق باقی تمام مجاہدین کے مقابلے میں بہُت زیادہ ہے۔ مُجھے بتایا گیا کہ کار نِکوبار یا شاید کِسی اور نام کے ایک جزیرے میں آج بھی خاصی تعداد میں سِکھ لوگ آباد ہیں اور یہ لوگ اُنہی کالے پانی سزا یافتہ مجاہدین کے کنبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہو گیا اور انگریز یہاں سے چلے گئے تو زیادہ تر کالے پانی سزا یافتہ مجاہدین انڈے مان نِکوبار میں ہی بس گئے۔ انڈے مان نِکوبار جزائر میں اِن مجاہدینِ آزادیِ ہند کے عِلاوہ جنوبی ہند کی ریاستوں کے اور کُچھ دُوسرے بھارتی عِلاقوں کے لوگ بھی آ کر بس گئے ہیں۔ اپنے اصل میں اِن سب کی اپنی زبانیں الگ الگ ہیں مگر یہاں یہ سب لوگ انڈے مان نِکوبار کی سرکاری زبان ہندی بڑے ٹھسّے کے ساتھ بولتے ہیں۔ آج پورٹ بلئیر

بجائے خود ایک چھوٹا بھارت (A Replica of India) ہے۔

انڈے مان نِکوبار کے بعد ہم لوگ براستہ کلکتہ تری پورہ بھی گئے۔ تری پورہ ایک چھوٹی سی بھارتی ریاست ہے۔ تری پورا اور بنگلہ دیش کی سرحد بہُت کھُلی ہوئی ہے۔ ہمیں وہاں بتایا گیا کہ بنگلہ دیش کے ہزاروں باشندے صُبح سویرے سرحد کے اِس طرف راجدھانی اگرتلا میں آجاتے ہیں۔ دِن بھر رِکشا چلاتے ہیں اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ شام تک دو چار سو پانچ سو روپے کما کر وہ لوگ واپس سرحد پار یعنی اپنے وطن بنگلہ دیش چلے جاتے ہیں۔

تری پورہ میں عِمارتی لکڑی سے بھرپور جنگلات ہیں جِن کی دیکھ ریکھ پر زیادہ مستعدی سے دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اِس سرکاری بھارت درشن نام کے دَورے پر ہمیں شیلانگ جانے کا موقع بھی مِلا۔ آسام کی راجدھانی گوہاٹی کے راستے ہم لوگ ٹیکسی کاروں پر میگھالیہ کی راجدھانی شیلانگ کے لِئے روانہ ہوئے۔

آسام کی سرحد سے جیسے ہی ہم میگھالیہ کے پہاڑی عِلاقے میں داخل ہوئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سامنے نظر آنے والے اونچے اونچے پہاڑ سرکار کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ اِنفرادی مالکان کی ذاتی جائدادیں ہیں۔ شیلانگ شہر کے بیچوں بیچ گزرنے والی ایک بڑی سڑک کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ وہ بھی کِسی کی ذاتی مِلکیتی جائداد کا حِصّہ ہے۔ میگھالیہ کے گورنر نے ہمیں چائے ناشتے پر مدعو کیا جِس دوران ہمیں اُنہوں نے بتایا کہ راج بھون (گورنر کی سرکاری رہائش) اور اُس سے منسلک زمین پر حقِ ملکیت کا دعویٰ ایک قبائلی سردار کے وارثوں نے عدالتِ عالیہ میں کر رکھا ہے اور یہ بھی کہ گورنر صاحب کوئی بار راج بھون خالی

کرنے کا نوٹس بھی مِل چکا ہے۔

شیلانگ میں ہمیں بتایا گیا کہ گارو، خاصی اور جے انتیا(Jayantiyo) نام کے تین بڑے قبیلوں والی اِس ریاست میں اکثر دُکانوں مکانوں اور دُوسری جائدادوں کی وراثتی ملکیت مردوں کے نہیں بلکہ عورتوں کے نام پر چلتی ہے۔ گھروں میں مالِک اور مُکھیا یعنی کرتا عورت ہوتی ہے نہ کہ مرد۔ شادی کر کے اکثر لڑکا ہی لڑکی کے گھر جاتا ہے اور وہاں جا کے عُمر گُزار دیتا ہے۔ وہاں کا سماج زیادہ تر عورت پردھان (Matriarchial) ہے۔ ایک مزیدار بات یہ بھی بتائی گئی کہ شیلانگ اور گردونواح میں اکثر لڑکوں کو لڑکیوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور گلیوں بازاروں میں لڑکوں کو لڑکیوں سے بچ بچا کر گُزرنا پڑتا ہے۔ اکثر لڑکے اکیلے گھومنے سے کتراتے ہیں۔

شیلانگ بادلوں اور سُندر لڑکیوں کا شہر ہے۔ ایک صحت افزا پہاڑی مقام ہے جِس کی سب سے اُونچی سطح پر ایک جھرنا(Water fall) ہے جو کِسی کی ذاتی مِلکیتی جائداد ہے جِس کے نزدیک جانے والوں سے اُس مالک کے کارِندے کُچھ پیسہ وصول کرتے ہیں۔

اِس دَورے کے آخر میں ہم نے پٹنہ میں گورو گوبند سِنگھ کی جائے پیدائش ہرمندر صاحب کا دیدار بھی کِیا۔ میرے لِئے تو یہ ایک تاریخی تیرتھ یاترا تھی۔ گورُو گوبند سِنگھ صاحب پیدا پٹنہ (بہار) میں ہوئے اور اُنہوں نے وفات ناندیڑ (مہاراشٹر) میں پائی۔ گورُو گوبِند سِنگھ نے اپنے پانچ پیارے بھی ہِندوستان کے پانچ الگ الگ عِلاقوں سے اور ہندوستانیوں کی الگ الگ ذاتوں (جاتیوں) سے چُنے۔ بیسویں صدی کی آٹھویں نویں دہائی میں سِکھوں کے لِئے الگ سے خالِصتان نام کے مُلک کے لِئے تحریک چلانے والوں سے مَیں

اکثر کہا کرتا ہوں کہ گورو گوبند سنگھ نے تو پورے ہندوستان کو ہی ہمارے لِئے خالصتان کا درجہ دِیا تھا۔

ہم آٹھ آئی اے ایس افسروں میں مَیں اکیلا سِکھ افسر تھا۔ دو تین مُسلمان افسر تھے۔ باقی ہندو۔ مُجھے یاد ہے پٹنہ صاحب میں گورُو دوارا جنم استھان گورُو گوبند سنگھ میں داخل ہونے سے ایک افسر نے (مجھ سے) معذرت کرلی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ اندر گورُ دوارے میں (گورُو) گرنتھ (صاحب) کے سامنے ہاتھ جوڑنے پڑتے ہیں اور ماتھا ٹیکنا پڑتا ہے۔ جِس کی اُن کا عقیدہ اِجازت نہیں دیتا۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ آپ اگر ہاتھ نہیں بھی جوڑیں گے یا ماتھا نہیں بھی ٹیکیں گے تو بھی یہاں آپ سے کوئی کُچھ نہیں کہے گا مگر اُس نے اندر نہ جانے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔ اُس وقت مُجھے لاہور کے صوفی فقیر سائیں مِیاں مِیر کا خیال آیا جِس کے ہاتھوں سِکھوں کے پانچویں گورُو ارجن دیو نے دربار صاحب امرتسر (Golden Temple) کی بنیاد (کی اینٹ) رکھوائی تھی۔ مُجھے اُس وقت کشمیر کی بابا ریشی، خانیار، چرارِ شریف وغیرہ زیارت گاہوں کی بھی یاد آئی جہاں لاکھوں کشمیری مُسلمان ہندو اور دوسرے لوگ روز اپنی طرح طرح کی مُرادیں مانگنے اور پانے کے لِئے جاتے ہیں۔ وہاں منتّیں مانگتے ہیں اور دُعائیں کرتے ہیں۔

☆☆☆

باب - ۱۴

جولائی ۲۰۰۳ء میں میرا تبادلہ صوبہ جموں کے محکمہ مُعاملاتِ صارفین اور عوامی تقسیم کاری کے سربراہ (Director Consumers Affairs & Public Distribution) کے طور پر ہوُا۔ ریاست جموں و کشمیر میں محکمہ خوراک اور سپلائیز (Food & Supplies) کو صوبہ جموں اور صوبہ کشمیر کے لِئے دو الگ الگ محکموں میں تقسیم کر دِیا گیا ہے۔ جموں میں یہ محکمہ صوبہ جموں کے تمام اضلاع میں خوراک سپلائیز کی دیکھ ریکھ کرتا ہے جبکہ کشمیر میں یہ محکمہ صوبہ کشمیر کے تمام اضلاع کے عِلاوہ لداخ کے ہر دو اضلاع (کرگل اور لیہہ) میں بھی خوراک سپلائی کا کام دیکھتا ہے۔ محکمہ خوراک سپلائیز کا نام بدل کر عوامی تقسیم کاری (Public Distribution) کر دِیا گیا ہے۔

محکمہ مُعاملاتِ صارفین کو بھی اِسی محکمے کے ایک حصّے کے طور پر چلایا جا رہا ہے۔ حالانکہ آج کی تاریخ میں مُعاملاتِ صارفین کا حلقہ محکمہ خوراک سپلائیز کے حلقے سے کہیں بڑا ہو چُکا ہے۔ صارفین کے حقوق (Consumers' Rights) کی دیکھ بھال کرنا، صارفین کی شِکایات سُننا، اُن پر قانون کے تحت باقاعدہ عمل کرنا اور کبھی کبھی اِن مُعاملات کو سارفین کی جانب سے صارفین سے متعلق عدالتوں /Consumer' Forums) (Courts میں مقدمے کے طور پر پیش کرنا اِس محکمے کے فرائض میں شامل ہے۔ صارفین کے حقوق کی حِفاظت کے لِئے Consumers' Protection Act کے نام سے ایک قانون بھی موجود ہے جس کے تحت مُعاملاتِ صارفین سے متعلق تمام کاروائیاں کی جاتی

ہیں۔

آج دُنیا ایک گاؤں (Global Village) بن چُکی ہے اور Globalisation اور Liberalisation جیسی کھُلے بازار کی مغربی تراکیب نے برِ صغیر ہندو پاک کو بُری طرح اپنی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ ایسے میں مُعاملاتِ صارفین کے پلڑے کے لِئے ایک الگ محکمے کی ضرورت ہے جو اپنے آپ میں محکمہ خوراک سپلائیز کے مقابلے میں بہُت (زیادہ) بڑا ہونا چاہئیے۔ ہر نجی اِستعمال کی چیز سے متعلق مال بیچنے والے کی طرف سے کِسی قِسم کے دھوکے یا زیادتی کے مُعاملے میں یہ محکمہ ذمہ دارِ عمل آوری بن جاتا ہے۔

ایسے مُعاملات آج کی دُنیا میں ہماری عام زِندگی میں اِتنے زیادہ ہیں کہ جِن کے لِئے گاؤں قصبہ شہر یہاں تک کہ شاہراہوں پر بنی چھوٹی بڑی دُکانوں کے لِئے محکمے کے پیروکاروں کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں مُعاملہ یہ ہے کہ محکمہ خوراک سپلائیز کے پچاس ساٹھ برسوں سے چلے آرہے محدود ملازمین کو اپنے کام کے عِلاوہ صارفین کے مُعاملات بھی نمٹانے پڑتے ہیں۔ ہاتھی جیسا کام بِلّی جیسے محکمے کے سپُرد ہے۔ بلّی بھی ایسی کہ جو دُودھ کی دُکان پہ جائے تو دودھ خود پی جائے اور پنیر کی دُکان پر جائے تو پنیر خود کھا جائے۔

محکمہ خوراک سپلائیز اور مُعاملاتِ صارفین دو کا ایک (Two in one) کی صورت میں چوں چوں کا مُربہ بن کے رہ گیا ہے۔ بازار میں دُکان، دُکان میں منافع خور مال فروش کے منافعے کی مار جھیلتا ہؤا بیچارہ صارِف اور اوُپر سے محکمہٗ مُعاملاتِ صارفین میں کام کرنے والے خوراک سپلائیز کے Food Inspectors اور دُوسرے مُلازمین۔ بچپن

میں دو بلّیوں کے آپسی جھگڑے میں فیصلہ کروانے آئے بندر کے ذریعے پوری کی پوری روٹی کھا جانے کا قصّہ کتابوں میں پڑھا تھا۔ کچھ ایسی ہی بندر بانٹ محکمہ مُعاملاتِ صارفین عُرف محکمہ خوراک سپلائیز عُرف محکمہ عوامی تقسیم کاری میں روایتاً یعنی رسوماً جاری ہے۔

آج جبکہ انا ہزارے جیسے سماجی کارکُن ہندوستان میں رِشوت ستانی (Corruption) کے خاتمے کے لِئے جا بجا جلسہ جلوس کا اہتمام کرتے نظر آتے ہیں تو مَیں اکثر دیکھتا ہوں کہ دِن بھر دفتر میں دُکان میں کاروبار میں دھڑلّے سے رِشوت وصول کرنے والے ہمارے ہم وطن شام کو (اور کبھی کبھی چھٹّی لے کے) انا ٹوپی پہن لیتے ہیں اور اونچا اونچا ترنگا جھنڈا لہراتے ہوئے رِشوت ستانی کے خِلاف نئے سے نئے گیت گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رِشوت بے ایمانی بدنیتی اور خود نا اعتمادی جیسی بدعتیں ہم ہندوستانیوں کے اندر اپنی جڑیں اِتنی گہرائی تک مضبوط کر چکی ہیں کہ اب اگر رام، کرشن یا کوئی اور اوتار (پیغمبر) بھی ہمارے درمیان اُتر آئے تو وہ بھی ہمیں سُدھارنے میں ناکام ہو کر مایوس واپس چلا جائے گا۔ ایسے ہی کِسی لمحۂ فِکریہ میں شاید مندرجہ ذیل نظم دِلِ بیتابؔ پر نازل ہوئی تھی ؎

پہلے پہل مَیں لباس پہن کر رکھتا تھا
کبھی بے لِباس نہیں رہتا تھا
دوسروں کے سامنے تو کیا
اکیلے میں بھی کم سے کم
چڈّی تو پہن کر ہی رکھتا تھا۔
لیکن جب سے اِس جنگل میں آیا ہوں

دیکھ رہا ہوں

شیر بھیڑیا لومڑی بندر

ریچھ جراف سبھی ننگے ہیں

یہاں تک کہ گیدڑ اور بھیگی بلّی بھی ننگے گھوم رہے ہیں

الف ننگے

اپنے اپنے کام میں مست

کسی کو فرصت نہیں کہ وہ یہ دیکھ سکے

یا اِس بات پر غور کر سکے

کہ مَیں جو یہاں بالِباس آیا تھا

اِس جنگل میں مَیں بھی ننگا ہو چُکا ہوں

شاید اِن کی دیکھا دیکھی۔

محکمہ خوراک سپلائیز میں راشن (گندم آٹا چاول) کے عِلاقائی محافظ کو Store Keeper کہا جاتا ہے۔ اکثر اوقات کئی کئی Store Keepers (سرکاری) راشن میں ہیرا پھیری کے مُلزِم پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک سُننے کو مِلتا ہے کہ فلاں فلاں عِلاقے میں Store Keeper نے پورے کے پورے Store کا ہی غبن کر لیا۔ اِس محکمے کے Store Keeper تحصیل سپلائی افسر اور ضِلعی سپلائی افسر ہمیشہ اپنے بہتر تبادلے کی کوشِشوں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسے محکموں میں تبادلے ایک کاروبار بلکہ ایک بڑی صنعت کا درجہ اختیار کر چُکے ہیں۔ اِس صنعت میں اُمراء و وُزراء، دلال، سیاسی رہنما اور نہ جانے کِس کِس قِسم کے صنعت کار اکثر شامِل رہتے ہیں۔ بڑے

افسروں (Gazzetted Officers) کے تبادلے تو سِول سیکریٹیریٹ میں کابینہ درجے کے وزیر کے حُکم سے ہوتے ہیں۔ چھوٹے ملازموں (Non Gazzetted Officers) کے تبادلے متعلقہ محکموں کے سربراہ کر سکتے ہیں لیکن دو سال سے پہلے اگر کِسی ملازم کا تبادلہ کرنا ہو تو ایسا متعلقہ کابینہ وزیر کے حُکم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ایک سال تک محکمہ خوراک سپلائی اور مُعاملاتِ صارفین میں میرا مُعاملہ ٹھیک رہا۔

خُدا خُدا کر کے ایک سال پانچ مہینے اُس محکمے میں گزارنے کے بعد سِول سیکریٹیریٹ میں سپیشل سیکریٹری محکمہ صنعت و حرفت کے طور پر میرا تبادلہ ایک اعلیٰ حاکم کے اُسی رِشتہ دار کی جگہ پر ہو گیا جِسے میری جگہ پر سربراہ محکمہ خوراک و مُعاملاتِ صارفین کے طور پر لایا گیا تھا، ''کُفر ٹوٹا خدا خدا کر کے''۔

۳۱ دِسمبر ۲۰۰۴ء کے دِن مَیں شام کے وقت جموں کے ''کے ایل سہگل ہال'' میں ایک ادبی پروگرام کی صدارت کر رہا تھا جب مُجھے انُو کا فون آیا کہ میرا تبادلہ (ٹی وی خبروں کے مطابق) سپیشل سیکریٹری صنعت و حرفت کے طور پر سِول سیکریٹیریٹ میں کر دِیا گیا ہے۔ فقیروں کا کیا ہے چِمٹا لے کے آئے تھے چِمٹا لے کر چل دِیئے۔ دُوسرے دِن یعنی ۲۰۰۵ء کے پہلے دِن ہی مَیں نے سِول سیکریٹیریٹ محکمہ صنعت و حرفت کا ایک کمرہ سنبھال لِیا۔

محکمہ خوراک سپلائی سے متعلق ایک اور بات جو مُجھے ہمیشہ یاد رہے گی وہ مِٹی کے تیل (Kerosene Oil) کی (Subsidised) سپلائی سے متعلق محکمے کی بد اِنتظامی ہے۔ مِٹی کا تیل کُچھ ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے ذریعے ریاست میں پہنچتا ہے جِسے آگے محکمے کے پرچون سپلائی مرکزوں تک پہنچایا جاتا ہے جو آگے صارفین تک سرکاری (Subsidised)

نرخ پر اِسے پہنچاتے ہیں۔ صوبہ جموں میں سب سے بڑا ضلع جموں ہے۔ لٰہذا سب سے زیادہ مِٹّی کا تیل ضلع جموں کے حصّے میں آتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شہر جموں (جواب تک ایک Metropolitan شہر کی حیثیت اختیار کر چُکا ہے) میں قریب قریب ہر گھر میں یا تو رسوئی گیس کا استعمال ہوتا ہے یا پھر چوری کی سرکاری بجلی پر چلنے والے رسوئی کے Electric Heater کا۔ مِٹّی کا تیل سرکاری ڈِپو پر کُچھ تو واقعی (چھوٹے موٹے) صارفین کو دِیا جاتا ہے اور باقی (یعنی زیادہ تر) یا تو موٹر گاڑیوں میں استعمال ہونے والے ڈیزل (Diesel) میں مِلایا جاتا ہے یا پھر سیدھے سیدھے ہی ڈیزل گاڑیوں میں اِستعمال ہوتا ہے۔ مِٹّی کے تیل کے اِس حمام میں اُوپر سے نیچے تک سب ننگے ہیں۔ ویسے رِشوت کے مُعاملے میں ایک کہاوت مشہوُر رہے کہ رِشوت اوپر سے نیچے کی طرف چلتی ہے۔

اِسی دَوران میں یعنی دِسمبر ۲۰۰۳ء میں میرا غزلوں پر مبنی شِعری مجموعہ ''موجِ ریگ'' منظرِ عام پر آیا تھا۔ اِس مجموُعے کے اِجراء سے متعلق ایک ادبی جلسہ جموں کلب میں مُنعقد ہوُا جس میں اُس وقت کے ریاستی چیف سیکریٹری ایس۔ ایس بلوریا، خوراک سپلائی کے وزیر، میرے اُستاد رہ چُکے سابقہ وزیر پونچھ کے جناب محمد دِین بانڈے، جگن ناتھ آزادؔ، پریم کُمار نظرؔ، کرشن کُمار طوُرؔ کے عِلاوہ ہِندی، پنجابی، اُردُو، ڈوگری، پہاڑی، گوجری وغیرہ زبانوں کے کئی ادباو شعرا نے حِصّہ لِیا۔ اِس پروگرام کی نظامت کا فریضہ پنجابی کی نامور شاعرہ افسانہ نِگار اور ناولسٹ سُر یندر کور نے انجام دِیا۔ ''موجِ ریگ'' پر Central Institute of Indian Languages, Mysore نے سال ۲۰۰۴/۲۰۰۵ کے لِئے ''بھارتی بھاشا سمّان'' نام کا ایوارڈ مُجھے دِیا تھا جس میں مبلغ ۲۵۰۰۰ روُپے نقد اِنعام بھی شامِل ہے۔ ''موجِ ریگ'' کی رسمِ اِجرا کا اہتمام Writers' Forum Jammu نام کی انجُمن کی طرف

سے کِیا گیا تھا۔ Writers Forum Jammu ہِندی، پنجابی، اُردُو، ڈوگری، گوجری، پہاڑی وغیرہ صوبہ جموں میں بولی جانے والی زبانوں کے ادب کی بہبُودی کے لِئے کام کرنے والی ایک رضا کارانہ (Registered) تنظیم ہے۔ جس کے صدر پنجابی کے نامور شاعر، افسانہ نِگار بلجیت رینہؔ ہیں اور اُن کی بیوی محترمہ سریندر کور نیرؔ اِس کی (سابقہ) جنرل سیکریٹری ہیں۔ اِس کے جنرل سیکریٹری ڈاکٹر اروِندر سِنگھ امنؔ ہیں جو آجکل ریاستی کلچرل اکادمی میں ایڈیشنل سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں اور پنجابی کے نامور ناقد اور ادیب ہیں۔ وہ ریاستی کلچرل اکادمی کے پنجابی ماہنامہ جریدے ''شیرازہ'' کی کئی سالوں تک ادارت بھی کر چکے ہیں۔ راج کُمار چندنؔ جو اُردُ شاعر و نقاد ہیں اور کافی عرصے تک ادبی ماہنامہ العطش نِکالتے رہے ہیں۔ اِس انجمن کے نائب صدر ہیں۔ ہِندی کے ایک بہُت ہی پیارے شاعر سُدھیر مہاجن خزانچی ہیں جب کہ مُجھے بھی اِن لوگوں نے سرپرست کے طور پر اپنے ساتھ رکھا ہے۔

اُسی زمانے میں (اِس وقت مُجھے تاریخ یاد نہیں آ رہی) ہم لوگوں (مَیں نے انو اور چوُ چوُ نے) نے ملیشیا اور سِنگاپور کی سیر کے لِئے جانے کا پروگرام بنایا۔ دہلی سے کوالالمپوُر ہوائی سفر کے بعد ہم نے ملیشیا کی صاف شفاف سڑکوں اور کوالالمپوُر کے خوب سارے Fly overs پر سفر کا خوب لُطف اُٹھایا۔ ملیشیا میں سڑکوں کے کِنارے اوُنچے درختوں کے پتّوں کو پانی کی ٹینکیوں والی گاڑیوں کے ذریعے دھوتے ہوئے ملازمین کو دیکھ کر ہم حیران ہو گئے۔ ہمیں اپنے مُلک میں سڑکوں کے کِنارے دھول جمے درختوں کی بہُت یاد آئی۔ ملیشیا ایک مُسلم اکثریتی مُلک ہے جہاں دس فیصد کے قریب ہندوُ اور ۲۰/۱۵ فی صد بُدھِسٹ، چینی لوگ بھی آباد ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ انگریزی (رومن) کے حرف H کی شکل کا کوالالمپوُر کا

مشہوُرِزمانہ دوسطوُنی ٹوِن ٹاور (Twin Tower) آنند کرِشنن نام کے ایک ہِندوُ شخص کی ملکیت ہے جو ملیشیا کا (اُس وقت تک) دوُسرا یا تیسرے نمبر کا امیر (تاجر) آدمی تھا۔

ملیشیا میں ہم نے مشہورِزمانہ اُونچا پہاڑی مقام Genting بھی دیکھا جہاں ہم کئی کِلو میٹر لمبی Cable Car کے ذریعے اوُنچے پہاڑوں کو چڑھتے ہوئے پہنچے تھے۔ Cable Car کے ذریعے پہاڑوں کے اُوپر سے گزُرتے ہوئے مُجھے کشمیر میں گلمرگ کی مشہورِزمانہ Cable Car یاد آئی۔ گلمرگ کے خوبصورت پہاڑوں کے اوُپر سے گزُرتے ہوئے چیڑ اور دیودار کے گھنے پہاڑوں کا خوبصورت نظارہ ملیشیا کی Genting کی Cable Car کے سفر میں کہاں- کہاں گلمرگ، کھِلن مرگ کے برف لدے خوبصورت سبز پہاڑ اور کہاں ملیشیا کے بے چیڑ بے دیودار نسبتاً کم تر جاذِب پہاڑ۔

سِنگا پور کے ہوائی اڈّے پر اُترتے ہوئے مُجھے محسوس ہوُا جیسے ہم ہندوستان کے کِسی معمولی شہر کے معمولی سے ایئر پورٹ پر اُتر رہے ہیں۔ بے شک سِنگا پور ایک خوشحال جزیرہ نُما مُلک ہے مگر وہاں مُجھے قدرت کی فِطری خوبصورتی کا فقدان بہُت بُری طرح محسوس ہوُا۔ بے شک Rassa Santossa ایک جزیرہ نُما خوبصورت ہوٹل اور چھوٹے سے ساحِل (Beach) کا خوبصورت مقام ہے مگر سِنگا پور میں کُچھ دِن رہ کے مُجھے محسوس ہوُا کہ اگر ہم انڈے مان نِکو بار کے چھوٹے بڑے ۵۷۲ جزائر میں سے کُچھ ایک کو develope کر کے بین الاقوامی سیر و سیاحت کے لِئے اِستعمال کریں تو ہمارے ہاں کئی کئی سِنگا پور قائم ہو سکتے ہیں۔ سِنگا پور سے بھی بہتر خوبصورت جزائر وہاں موجود ہیں۔ صاف شفّاف پانی اور الگ الگ نسلوں کی اِنسانی آبادی کے حامِل مُختلِف النوع جزائر۔ اُوپر سے تاریخی اہمیت کی

حامِل کالے پانی کی (Celluler) جیل تھی۔

سِنگا پور میں Mustafa Market نام کا ایک ہندوستانی محمّد مُصطفیٰ کا قائم کردہ ایک ہی چھت کے تلے موجود بازار (Shopping Mall) بھی ہم نے دیکھا جس میں لگ بھگ ایک لاکھ دوکانیں ایک ہی چھت کے نیچے موجود ہیں۔

اُسی زمانے میں مَیں اور انو بنگلور، مَیسوُر کے راستے تامِل ناڈو کا پہاڑی مقام اُوٹی دیکھنے گئے۔ چوُچوُ ہمارے ساتھ نہیں تھی کیونکہ وہ اِس دَوران اپنے سکوُل کے کِسی Touring Troup پر تھی۔ ''اُوٹی'' چیڑ وں اور دیوداروں سے پُر ایک ٹھنڈا پہاڑی مقام ہے جو کشمیر کے پہاڑی مقامات اور جموں کے پتنی ٹاپ سے مِلتا جُلتا ہے۔ اُوٹی کے ہوٹلوں کے کمروں میں لکڑی سے جلنے والی بُخاریاں دیکھ کر ہمارا بچپن سے قائم شُدہ یہ خیال ہوا ہو گیا کہ ٹھنڈے پہاڑی مقامات صِرف جموں و کشمیر یا ہماچل پردیش میں ہی ہوتے ہیں۔ ''اُوٹی'' میں ہمیں ہندی فِلموں کے کئی مناظر (Scenes) کی locations دِکھائی گئیں جِن کے بارے میں ہم ہمیشہ یہی سمجھتے رہے تھے کہ یہ مقامات ہماچل پردیش یا پھِر جموں کشمیر سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

اُنہی دِنوں جموں کشمیر کے ایک سابقہ چیف مِنسٹر (مرحُوم) صادِق صاحب کے فرزندِ ارجمند جناب رفیق صادِق نے مجھے فون پر بتایا کہ مُجھے ۲۰۰۵/۲۰۰۴ء کے لِئے صادِق میموریل ادبی ایوارڈ کے لِئے مُنتخب کِیا گیا ہے۔ جموں کے ہوٹیل سِوائے میں ایک بڑے اہتمام میں یہ ایوارڈ سماجی زِندگی سے متعلق کُچھ دوسری شخصیات کے ساتھ ساتھ مُجھے بھی دِیا گیا۔ محکمہ صنعت و حرفت میں مُجھے کُچھ دوُسرے کاموں کے عِلاوہ ریاست میں جابجا موجود

معدنیات (Minerals) سے متعلق مُعاملات اور پاڈر (کشتواڑ) کی مشہوُرِ زمانہ نیلم کی کان (Blue Saphire Mines) کا کام کار بھی دیکھنا تھا۔ سنگِ مرمر، Magnasite قیمتی نیلم قیمتی اور دوُسرے پتھّروں کی کان کنی کے لِئے زمینیں عارضی طور پر ٹھیکے پر دینے کا کام بھی مُجھے دیکھنا تھا۔

مُجھے یاد ہے پاڈر (کشتواڑ) کی نیلم کی کان (Saphire Mines) سے جموں و کشمیر مِنرلز (J&K Minerals) نام کے سرکاری اِدارے نے جو نیلم کے ٹکڑے لائے تھے اُنہیں ہم لوگوں نے عِلاقائی ریسرچ لیباریٹری (Regional Research Laboratories) میں تیزاب (Hydrocholoric Acid) میں ایک کمیٹی کی دیکھ ریکھ میں اور پوری حفاظت میں دھلوایا تھا۔

نیلم کی دھُلائی کے لِئے بنائی گئی کمیٹی کا صدر (Chairman) بھی مَیں ہی تھا۔ نیلم کی کان ضِلع کشتواڑ کے پاڈر نام کے ایسے عِلاقے میں موجود ہے جو ایک طرف ہماچل پردیش تو دوُسری طرف لداخ کے عِلاقہ زنسکار کے ساتھ جا لگتا ہے۔ اُونچے برفانی کٹھن پہاڑ کی اندرونی رگوں میں پائے جانے والے قیمتی پتھّر (نیلم) کی کانکنی نہایت ہی مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن کام ہے۔ جموں کشمیر مِنرلز (J&K Minerals) نام کا خود مُختار ادارہ سرکار کی طرف سے اِس قیمتی پتھّر کی کان کنی کا کام کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کان یعنی پہاڑ کے اندرونی حصّوں میں آکسیجن (Oxygen) کی کمی کی وجہ سے کانکنی کے لِئے زیادہ دیر اندر رہنا مُشکل ہوتا ہے۔ دس بیس مِنٹ میں جو ٹکڑے ہاتھ لگ جائیں لے کر کھُلی ہوا میں سانس لینے کے لِئے یہ لوگ دوڑ کر باہر آجاتے ہیں۔ لہٰذا کانکنی کا کام بہُت ہی کٹھن اور سُست رفتار

ہے۔نیلم کے پہاڑوں کے اِرد گرد حفاظتی دستے (پولیس وغیرہ) چوکسی کے ساتھ پہرہ دیتے ہیں لیکن پھر بھی نیلم کی چوری چھپے کانکنی اور سمگلنگ کی شکایات ہمیشہ موصول ہوتی رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہماچل پردیش کی طرف سے کُچھ ماہر پہاڑی کانکن آتے ہیں اور نیلم کی چوری چوری کانکنی کر کے چلے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اِس کام میں چوکیداری اور پہرے داری کرنے والوں کے سمیت کُچھ دوسرے لوگ بھی شامِل ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جموں و کشمیر مِنرلز (J&K Minerals) نام کے سرکاری خُود مُختار ادارے کے ذریعے کی جانے والی کانکنی چوری چھپے کی جانے والی کانکنی کے مقابلے میں دس فیصد سے بھی کم ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں ہندوستان کے سابقہ وزیر داخلہ (Home Minister) مفتی محمد سعید نے پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی نام کی نئی سیاسی پارٹی کے جھنڈے تلے اسمبلی اِنتخابات میں حِصّہ لیا اور شیخ محمد عبداللہ کی قائم کردہ نیشنل کانفرنس کو پٹخنی دے کر حزبِ مُخالف میں بیٹھنے پر مجبور کر دِیا تھا۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں ہی کشمیر میں یہ معجزہ (پہلی بار) ہُوا کہ شیخ محمد عبداللہ کے بیٹے ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اپنی ٹنمرگ (گلمرگ) کی مضبوط سیٹ سے الیکشن ہار گئے اور پوتے یعنی ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے بیٹے اور سیاسی جانشین عُمر عبداللہ گاندربل کی اپنی مضبوط خاندانی سیٹ سے اپنی پہلی الیکشن ہار گئے۔ گانگریس اور پی ڈی پی نے مِلی جُلی سرکار بنائی۔ پہلے تین سال پی ڈی پی کے مُفتی صاحب چیف مِنسٹر رہے باقی تین سال کانگریس کے غُلام نبی آزاد۔

یہاں یہ ذِکر ضروری محسوس ہو رہا ہے کہ کانگریس پارٹی نے ہی ۱۹۷۵ء میں اپنے عملی تعاون سے شیخ محمد عبداللہ کو ۲۲ برس کے وقفے کے بعد دوبارہ ریاست میں چیف مِنسٹر

کے عُہدے پر تعینات کیا تھا۔ یہ وہی کانگریس پارٹی ہے جس نے اپنے عملی تعاون کے ذریعے ۱۹۸۴ء میں شیخ محمد عبداللہ کے سیاسی جانشین بیٹے اور اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر فارُوق عبداللہ کو پٹخنی دے کر شیخ محمد عبداللہ کے داماد جی۔ ایم۔ شاہ کو وزیرِ اعلیٰ کی کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ اِسی کانگریس پارٹی نے ۱۹۸۷ء میں نام نہاد راجیو - فارُوق سمجھوتے (Rajiv-Farooq Accord) کے تحت ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اپنے عملی تعاون سے پھر سے وزیرِ اعلیٰ بننے میں مدد کی تھی۔ اِسی کانگریس پارٹی نے اب اکیسویں صدی کے پہلے پہلے سالوں میں ڈاکٹر فارُوق عبداللہ کے بھائی اور بیٹے کو الیکشن ہارتے ہوئے دیکھ کر مُفتی محمد سعید کی نئی پارٹی کے ساتھ مِل کر حکومت بنائی تھی۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی آگے چل کر ۲۰۰۸ء میں کانگریس پارٹی اور نیشنل کانفرنس نے پھر سے ایک بار مِلی جُلی حکومت بنالی اور عُمر عبداللہ کو ریاست کا وزیرِ اعلیٰ بننے میں کانگریس نے اپنا عملی تعاون پیش کیا۔ جبکہ فارُوق عبداللہ کو مرکز میں وزیر کا عہدہ پیش کر دیا گیا۔ اِس طرح سے جموں کشمیر میں حکومت سازی ہمیشہ Musical Chairs نام کے کھیل کی طرح رہی ہے۔

ایک طرف ریاست میں ۱۹۴۷ء سے کشمیر کا بنیادی مسئلہ ہندوستان پاکستان کے درمیان بدستور مستقِل تنازعوں کا مرکز بنا ہُوا ہے بلکہ ۱۹۸۹-۹۰ء سے ریاست اِنتہا پسند تحریکوں میں بُری طرح پھنسی ہوئی ہے اور ایک اندازے کے مُطابق (ہند حمایتی اور ہند مخالف کُل مِلا کر) ۷۰-۸۰ ہزار سے زائد لوگ اپنی جانیں گنوا چکے ہیں تو دُوسری طرف کُرسی بازوں کا Political Musical Chairs کا کھیل مُسلسل جاری ہے۔ کبھی تو لگتا ہے کہ بنیادی مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی کِسی کو فِکر ہی نہیں ہے اور کیا مرکزی کیا ریاستی تمام سرکاریں اپنا اپنا وقت نِکال کر چلتی بننے میں ہی اپنا بھلا سمجھتی ہیں۔ مُفتی محمد سعید نے وزیرِ اعلیٰ

ہوتے ہوئے جب پہلی بار ہندوستانی کشمیر اور پاکستانی کشمیر کے درمیان لوگوں کی آمدورفت اور تجارت کی غرض سے سرحد کے آر پار راستے کھلوا دِیے تھے تو اِتفاقاً اُسی زمانے میں میری مندرجہ ذیل غزل کے اشعار مُجھ پر نازل ہوئے تھے ؎

راستے تو کئی کھُلے ہیں مِیاں
ہمیں کُچھ بند ہو چُکے ہیں مِیاں

سمت کیسی یہاں سفر کیسا
بھیڑ میں ہم بھی چل رہے ہیں مِیاں

دُوسروں سے خود اپنے کوچے میں
ہم پتہ اپنا پوچھتے ہیں مِیاں

تُم جہاں ہم کو ڈھونڈتے ہو ابھی
ہم وہاں سے گزر چُکے ہیں مِیاں

تُم کِسی نام سے پُکارو ہمیں
ہم تو پہچان کھو چُکے ہیں مِیاں

دھُند میں کُچھ نظر نہیں آتا
پیچھے مُڑ کر جو دیکھتے ہیں مِیاں

محکمہ صنعت و حرفت میں ایک سال گزارنے کے بعد میرا تبادلہ سِول سیکریٹیریٹ میں ہی سپیشل سیکریٹری محکمہ اِطلاعات کے طور پر کر دِیا گیا۔ اُن دِنوں محکمہ اِطلاعات چیف

منسٹر کے اپنے محکموں میں شامل تھا۔ چیف منسٹر غلام نبی آزاد صاحب سے پہلی سرکاری میٹنگ میں مجھے اندازہ ہُوا کہ وہ کسی زمانے میں جموں کے کالج میں ہمارے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک بہُت ہی دھُندلی سی یاد ہے جس میں ایک بہُت معمُولی سالڑکا دھُندلے دھُندلے نقش ونگار کے ساتھ پردۂ تصوّر پراُبھرتا ہے۔

محکمہ اطلاعات میں جاتے ہی میری ترقی ہوگئی اور مَیں اُسی محکمے میں سپیشل سیکریٹری سے سیکریٹری یعنی انفارمیشن سیکریٹری بنا دِیا گیا۔ اُن دِنوں لیبر اینڈ ایمپلائمنٹ کا محکمہ بھی چیف منسٹر کے پاس ہی تھا۔ چیف منسٹر کے دِل میں جانے کیا خیال آیا کہ اُنہوں نے مجھے محکمہ اطلاعات سے ہٹا کر ریاست کا لیبر کمِشنر (Labour Commissioner) بنا دِیا۔ محکمۂ اطلاعات میں میرے ایک ڈیڑھ سال کے قیام کے دَوران (اُس وقت کے) چیف منسٹر کے پرنسپل سیکریٹری انل گوسوامی آئی اے ایس نے میرے کام کی بہُت سراہنا کی اور میرا حوصلہ بہُت بڑھایا۔ مَیں انل گوسوامی کے ساتھ کِئے ہوئے ایک سال کے کام کو کبھی نہیں بھُلا سکتا جس کے دَوران اُنہوں نے چیف منسٹر کے سامنے میرا اچھا تاثر پیش کِیا۔ انل گوسوامی کا چہرہ مُجھے ہمیشہ ایک نیک اور ہمدرد دوست کے چہرے کی طرح یاد آتا ہے۔ وہ ایک نیک شفیق اور صاف ستھرے افسر ہیں۔

محکمہ اطلاعات کے تعلق سے یاد آتا ہے کہ یہ میری اُس محکمے میں تیسری تعیناتی تھی۔ سب سے پہلے جب مَیں انڈر سیکریٹری ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ (۸۴-۱۹۸۲ء) تھا تو چار مہینے کے لئے مُجھے اپنے محکمے کے علاوہ انڈر سیکریٹری محکمہ اطلاعات کا (Additional) کام بھی دیکھنا پڑا جس کے دوران اُس وقت کے Commmr./Secy Information

جناب او۔این۔دھر نے میرے کام کی نسبت سے میری بہت سراہنا کی۔ اُس دوران محکمہ اِطلاعات میں انڈر سیکریٹری ہی ایک عدد افسر ہُوا کرتا تھا۔ دُوسری بار میں جے ڈی اے سے تبدیل ہو کر ڈِپٹی ڈائریکٹر محکمہ اِطلاعات رہا اور تیسری بار میں نے سپیشل سیکریٹری اور سیکریٹری کے طور پر محکمۂ اِطلاعات میں کام کِیا۔

مَیں نومبر ۱۹۷۷ء میں نظامیہ (Administration) کی نوکری میں آیا تھا۔ سرکاری نوکری میں ضروری (Inevitable) تِکڑم بازیاں، سِیاست دانوں کے تلوے چاٹنا، تبادلوں کے لِئے بڑے حُکّام اور سیاسی بڑے بھائیوں کی خوشنودی حاصِل کرنے کے ہر طرح کے حربے اِستعمال کرنا، سالانہ خُفیہ رِپورٹ لِکھوانے کے لِئے اپنے سے اُوپر والے افسروں کی چمچہ گیری کرنا یا اُنہیں تحفے تحائف دینا۔ دفتری مُعاملات میں کبھی کبھار اَیسے کام کرنے کے لِئے مجبور ہو جانا جنہیں دِل بالکل قبول نہ کرتا ہو۔ اپنے حق میں کِسی قِسم کی سیاسی پُشت پناہی کا نہ ہونا۔ ایک بہُت ہی معمولی اقلیت سے تعلق رکھنا (جِس کے لِئے کئی بار اپنے اکثریتی طبقوں کی مضحکہ خیزیوں کا سامان بننے کو روکنے میں ناکام رہنا)، کئی بار اپنے اُوپر کام کرنے والے حُکّام اور سیاسی رہنماؤں کے نااہلیت سے بھرے ہوئے (کئی بار بیوقوفانہ) احکام کو ماننے پر مجبور ہو جانا۔ بعض اوقات جانتے ہوئے بھی اعلیٰ حُکّام کی ذاتی اغراض سے بھری ہوئی چالوں کا حِصّہ بننے پر مجبور ہونا، وغیرہ وغیرہ جیسے مُعاملات نے پچھلے کُچھ برسوں سے مجھے اندر ہی اندر کاٹنا شروع کر دِیا تھا۔ اندر کی آواز کو نظر انداز کرنا میرے لِئے شرُوع سے ہی آسان نہیں تھا مگر پچھلے کُچھ برسوں سے (شاید میری عُمر کے پچاس سال پورے ہونے کے وقت سے ہی) میرے دِل میں زہر کے اِس سمندر سے باہر نِکل جانے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ سبکدوشی کا وقت قریب آ رہا تھا لیکن اب ایک ایک لمحہ اِس ماحول میں اور بھی

مُشکلیں پیدا کر رہا تھا۔ میری شاعری جو زِندگی کے کھٹّے میٹھے کڑوے کسیلے تجربات سے ہی ماخوذ ہے۔ اُس میں میری سوچ جا بجا دیکھنے کو مِل جاتی ہے۔

مَیں جِسم سے شامِل ہوں مگر قافلے والو
جو رُوح کی پوچھو تو یہ ہلکان بہُت ہے

ہم کو خاموش نہ جانو صاحب
اندر اِک شور بپا رہتا ہے

قہقہے رہتے ہیں روشن بیتابؔ
دِل ہی کمبخت بُجھا رہتا ہے

شہرت ہے کہ بھرپور تشخّص ہے ہمارا
رہ رہ کے مگر آتا ہے اندر کا خلا یاد

سود کیا زِیاں کیسا زِندگی کے سودے میں
بھاؤ تاؤ کیا کرتے ہم تھے کون سوداگر

یاد ہوگا تجھے اے گردِ سفر
مُجھ سے بچھڑی تھی مِری ذات کہاں

ہم جِسم کو بچا نہ سکے گرد سے مگر
یہ تو کِیا کہ رُوح کو مَیلا نہیں کِیا

بس ہو گئے تھے اپنے رویّے سے جنفی

رِشتہ بھی ہم نے شہر سے توڑا کبھی نہ تھا

میری انا کا مول وہ دے بھی تو کِس طرح

یہ قتل وہ ہے جِس کا کوئی خونبہا نہیں

اِک بار ہاتھ لگ گئے اُس اندھی بھیڑ کے

واپس نہ لوٹ پائے ہم اپنی پناہ میں

اِس بھیڑ میں ہے فِکر کِسے کِس کو خبر ہے

مَیں جِسم سے شامِل ہوں مگر دِل سے جُدا ہوں

صُبح سویرے دفتر کے حِساب سے اُٹھنا، تیار ہونا، وقت کی پابندی سے دفتر کے لِئے روانہ ہونا، رات کو اگلے دِن کی دفتری کاروائیوں کے حِساب سے وقت دیکھ کر سونا۔ مختصر یہ کہ اپنی مرضی کا سونا نہ جاگنا، اُٹھنا نہ بیٹھنا، یہاں تک کہ اپنی مرضی کا سوچنا بھی لگ بھگ زِندگی سے غائب تھا۔ میرے اندر کا شاعر جو ایک مُفکّر بھی ہے اِن سب مُعاملات و مسائل سے آزادی چاہنے لگا تھا۔ دِل میں اپنی مرضی سے سونے جاگنے اُٹھنے بیٹھنے کھانے پینے کی خواہش ٹھاٹھیں مارنے لگی تھی۔ یعنی میرے اندر کا شاعر اور مُفکّر میری افسری پر بھاری پڑنے لگا تھا۔ مَیں اکثر سوچنے لگا تھا کہ مَیں جب چاہوں سوؤں، جب چاہوں جاگوں، صُبح تیار ہو کر جدھر دِل چاہے اُدھر چل پڑوں، کبھی دِن بھر کبھی رات رات جانے انجانے راستوں پر گھومتا پِھروں اور پیچھے کوئی پریشانی نہ ہو۔ کبھی میرے دِل میں خیال آتا کہ مَیں انو اور چوُچوُ کو ساتھ لے کر دُنیا کی سَیر پر نِکل جاؤں۔ آسمانوں میں اُڑوں، سمندروں میں تیرتا پِھروں، میرے شِعری

مجموعے ''فلک آثار'' میں شامل ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' عنوان کی میری مندرجہ ذیل نظم اِسی کیفیت کی نمائندگی کرتی ہے۔

خراب سے خراب راستوں پر فرّاٹے سے دوڑ سکنے والی
بڑھیا موٹر کار کے سٹیرئینگ پر میرا ہاتھ ہو
ٹینکی پیٹرول سے لبالب ہو
کچی پکی ان دیکھی انجانی سڑکوں پر
جب چاہوں جِدھر چاہوں نِکل جاؤں
آگے ہی آگے
جہاں چاہوں تیز رفتار سے چلوں
جہاں چاہوں خراماں خراماں
کِسی من بھاونی سہاونی لبھاونی بستی یا وادی میں
کِسی خوبصورت آبشار کِسی شفاف ندی
کِسی اچھی صورت کِسی اچھی سیرت کے قریب
جب چاہوں رُک جاؤں
کاش! کبھی یہ سب ہو
اور واپس پہنچنے کی کوئی جلدی نہ ہو

ہمارے لمبے نوکری کے عرصے (Service Career) کے دَوران کئی بار ہماری باہمی گفتگو میں نسیم (لنکر) بھی مُجھ سے لگ بھگ ایسے ہی خیالات کا اِظہار کر چکی ہیں۔

مُجھے یاد ہے ایک بار نسیم نے ایک مخصوص کیفیت میں کہا تھا کہ وہ چاہتی ہے ایک موٹر وین(Van) خرید کر اُس کے اندر اپنے گھر کو مُنتقِل کر دے۔ دُنیا میں یہاں وہاں جہاں جی چاہے گھومتی پھرے اور زِندگی اِسی عالم میں گُزر جائے۔

باب - ۱۵

جون ۲۰۰۶ء میں میرا تبادلہ ریاست کے لیبر کمِشنر کے طور پر ہو گیا تھا۔ لیبر کمِشنر کا دفتر سِول سیکریٹیریئیٹ سے باہر ہوتا ہے لیکن دربار موو کے ساتھ چلتا ہے یعنی سردیوں میں جموں گرمیوں میں سرینگر۔ لیبر کمِشنر ہماری ریاست میں چیف انسپیکٹر فیکٹریز کے طور پر بھی کام کرتا ہے جب کہ بھارت کی دوسری کئی ریاستوں میں چیف اِنسپیکٹر فیکٹریز کا الگ سے اپنا ایک محکمہ ہے۔ ہماری ریاست میں لیبر کمِشنر کو نیم سرکاری/غیر سرکاری تجارتی اور دوسرے ہر قِسم کے (تعلیمی وغیرہ) اداروں کے ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ (Provident Fund) کمِشنر کے طور پر بھی کام کرنا پڑتا ہے جب کہ بھارت کے دوسرے تمام عِلاقوں کے لِئے ایک ہی مرکزی پراویڈنٹ کمِشنر ہے جو دہلی سے کام کرتا ہے۔ اِس طرح لیبر کمِشنر کو ایک نہیں بلکہ تین تین عُہدوں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ حالانکہ نیلی آنکھوں والے لڑکوں (Blue eyed boys) کے لِئے لیبر کمِشنر کی پوسٹ (بڑی) غیر اہم ہے لیکن سیاسی پُشت پناہی کے بغیر نظامیہ میں زِندہ رہنے (Survive) والے چھوٹی سی اقلیت سے تعلق رکھنے والے ایک افسر کے لِئے یہ بھی غنیمت ہے۔

کشمیر میں لیبر کمِشنر کا دفتر سرینگر کے سِول سیکریٹیریٹ سے مُتصِل بٹ مالوُ بس اڈّے کے اندر واقع ہے۔ عِلاقہ بٹ مالو سرینگر میں اِنتہا پسندی کا اڈہ سمجھا جاتا ہے جہاں آئے دِن بم دھماکے اور گولہ باری کے واقعات رُونما ہوتے رہتے ہیں۔ مُجھ سے پہلے جو صاحب لیبر کمِشنر تھے وہ خوف کے مارے اپنا دفتر کہیں اور لگاتے تھے۔ مُجھ سے بھی کُچھ

ملازمین نے کہا جناب یہاں خطرہ ہے آپ اپنا دفتر سِول سیکریٹریٹ کے کِسی کمرے میں ہی رکھیں لیکن مَیں نے ضِد کر کے اپنے اصل دفتر یعنی بٹ مالوُ میں ہی بیٹھنا مناسب سمجھا۔ مَیں نے کہا جب میرے ماتحت کام کرنے والے ساتھیوں کو کوئی خطرہ نہیں تو مُجھے کیا خطرہ ہے۔ بعد میں معلوم ہوُا کہ لیبر کِمشنر کے کِسی اور جگہ بیٹھنے کی بدولت دفتر میں کئی ملازمین اپنی من مرضی کے مُطابق آتے جاتے تھے اور اپنی سہولیت کے مُطابق ہی کام کرتے تھے۔ میرے بٹ مالوُ دفتر میں بیٹھنے سے ایسے لوگوں کے لِئے کئی قِسم کی پریشانیاں پیدا ہوگئیں۔ لہٰذا وہ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگا کے مُجھے بٹ مالوُ میں اَپنے دفتر میں بیٹھنے کے بجائے کہیں اور بیٹھنے کی صلاح دیتے رہے لیکن مَیں نے بھی اُن کی ایک نہ مانی۔

میرے بٹ مالوُ دفتر میں ہی بیٹھنے کے فیصلے سے مزدوُروں کی تنظیموں، نیم سرکاری ملازمین کی انجمنوں اور دوُسری Trade Unions کے لوگ بہُت خوش ہوئے بلکہ اُن لوگوں کا کہنا تھا کہ اُن کی یہ دیرینہ خواہش بلکہ مانگ رہی ہے کہ لیبر کِمشنر بٹ مالوُ میں یعنی اپنے اصل دفتر ہی میں بیٹھا کرے۔ اپنے سکوُل کالج کے دِنوں میں کیونکہ مَیں بائیں بازوُ کی انجمنوں سے متعلق رہا ہوُں۔ اِس لِئے بھی trade unions کے لوگ مُجھ سے بہُت خوُش تھے۔

لیبر اینڈ ایمپلائمنٹ کا محکمہ پہلے چیف مِنسٹر غُلام نبی آزاد کے پاس ہی تھا لیکن کُچھ عرصہ بعد یہ محکمہ جموں سے تعلق رکھنے والے ایک سینئیر کانگریسی وزیر پنڈت منگت رام کے پاس آگیا۔ پنڈت منگت رام جموں کے ایک ہرمن پیارے رہنما ہیں اور عوام سے زبردست رابطہ رکھتے ہیں۔ یہ اُن کی طبعیت کے عین مُطابق بھی ہے اور اُن کی سیاسی ضروُریات کے

مُطابق بھی ہے۔

جِس سرکاری حُکم سے میرا تبادلہ لیبر کمِشنر کے طور پر ہُوا تھا اُسی کے ذریعے ریاست سے باہر کی کِسی ریاست سے تعلق رکھنے والے ایک افسر کا تبادلہ کمِشنر سیکریٹری لیبر اینڈ ایمپلائمنٹ کے طور پر ہوا۔ مُجھے معلوم ہُوا کہ وہ صاحب پہلے بھی دو ایک بار لیبر سیکریٹری رہ چکے ہیں اور محکمے کی ہر اُونچ نیچ سے بخوبی واقف ہیں یعنی محکمے کے پُرانے کھِلاڑی ہیں۔ وہ نام نِہاد دلِت جاتی سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے (سِکھ) مذہب میں ذات پات کے لِئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ گورُو نانک نے کہا ہے

نیچاں اندر نیچ ذات نیچی ہوں اتی نیچ
نانک تِن کے سنگ ساتھ وڈیاں سوں کیا ریس

گورُو گوبِند سِنگھ نے خالصہ پنتھ قائم کرتے وقت جو پانچ پیارے چُنے تھے اُن میں ایک نائی (حجام) اور ایک جھیور جیسی چھوٹی ذات (جاتی) سے تعلق رکھنے والے شخص تھے۔ سِکھ مذہب میں جِتنی عِزّت برہمن ذات سے تعلق رکھنے والے بھائی ستی داس اور متی داس کی ہے (جو گورُو تیغ بہادر کے ساتھ چاندنی چوک دہلی میں شہید ہو گئے تھے) اُتنی ہی عِزّت گورُو تیغ بہادر کا سر (اُن کی شہیدی کے بعد) گورُو گوبند سِنگھ کے پاس پہنچانے والے چھوٹی ذات سے تعلق رکھنے والے بھائی جیتا کی ہے جِس کے لِئے گورُو گوبند سِنگھ نے کہا تھا۔

رنگھریٹے (چھوٹی ذات کے) گورُو کے بیٹے

یہ سب کہنے سے مُراد یہ ہے کہ مَیں نے کبھی ذات پات کے تفرقے کو نہیں مانا بلکہ ہمیشہ اِس بدعت کے خِلاف آواز اُٹھائی ہے۔ اُس کمِشنر سیکریٹری لیبر اینڈ ایمپلائمنٹ کے

ساتھ اِس مُعاملے میں میرا ہمیشہ زبردست اِختلاف رہا۔ مُجھے جب کبھی اُن کے دفتر میں محکمے سے متعلق مُعاملات کے سِلسلے میں جانا پڑتا وہ محکمے کے کام کاج کے بارے میں بہُت کم بات کرتے اور اپنی ذات کے عِلاوہ دوُسری ذاتوں (جاتیوں) کے خِلاف پراپیگنڈہ شروُع کر دیتے جِسے مَیں ہمیشہ بکواس نامہ کہا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر میرا سر درد کرنے لگتا بلکہ کئی بار تو مَیں اپنے سر کو پتھر کر لیتا اور اُن صاحب کا لیکچر ختم ہونے پر باہر جا کر کھُلی ہوا میں سانس لیتا۔ سُنا ہے کہ اُنہوں نے خود کِسی نام نِہاد اوُنچی ذات کی لڑکی سے شادی کر رکھّی ہے۔ مَیں کئی بار سوچتا تھا کہ شاید وہ گھر کا غُبار دفتر میں نِکالتے تھے۔ مَیں اِس اصول کا سختی سے پیروکار رہوں کہ جِتنی نام نِہاد اوُنچی ذات والوں کی نام نِہاد چھوٹی ذات والوں کے لِئے نفرت قابلِ مذمّت ہے اُتنی ہی قابلِ مذمّت نام نِہاد چھوٹی ذات والوں کی نام نِہاد اُونچی ذات والوں سے نفرت بھی ہے۔ کاش کوئی صُبح ایسی آئے کہ مَیں بِستر سے اُٹھ کر باہر نِکلوُں اور پاؤں کہ ہندوستان میں ذات پات کی بِدعت کا قلع قمع ہو چُکا ہے۔

اُن کِمشنر سیکریٹری صاحب کی ایک اور بات میرے لِئے بڑی کوفت ساماں تھی۔ مَیں جب بھی اُن کے دفتر جاتا وہ اپنے مہنگے مہنگے قلم (Pens) مُجھے دِکھاتے اور اُن کی تعریف میں قصیدے پڑھتے۔ اکثر اُن کے پانچ پانچ دس دس ہزار روُپے کے، کئی بار اُس سے بھی قیمتی مہنگے مہنگے قلم (Pens) کی سیاہی اُن کے ہاتھوں پر گِر جاتی اور اُن کے ہاتھوں کو رنگ دیتی۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر اپنے پی اے سے اِصرار کرتے کہ وہ قلم (Pen) بنانے والی کمپنی والوں سے قلم کے ناکارہ ہونے کی شکایت کرے بلکہ اُنہیں سختی سے ڈانٹے۔ مَیں نہیں جانتا کہ اُن کے پی اے نے کبھی اُن کمپنیوں سے شِکایت کی یا نہیں (اور اُنہیں ڈانٹ پلائی یا نہیں) لیکن اُن صاحب کے ایسے ڈرامے مَیں نے کئی بار دیکھے ہیں۔ اِس کے عِلاوہ وہ

اپنے قیمتی سے قیمتی کپڑوں کے بارے میں لمبے لمبے لیکچر بھی اپنے سرکاری کاموں کے لِئے مخّتص دفتر میں ہی دینا کبھی نہ بھولتے جب کہ مَیں ہمیشہ بازار سے سستے سے سستے کپڑے خرید کر پہننے میں کبھی شرم محسُوس نہ کرتا۔

اُن کی خوش نودی حاصِل کرنے والے کئی مُلازمین ہمیشہ اُن کی ہاں میں ہاں مِلاتے لیکن ایسے موقعوں پر میرے چہرے پر نمودار ہونے والے کڑوے کسیلے تاثرات کو وہ کبھی پسند نہ کرتے۔ میرا خیال ہَے کہ وہ اَپنے اندر کے احساسِ کمتری کو چھپانے کے لِئے بڑھیا بڑھیا کپڑے اور بڑھیا سے بڑھیا قلم کا سہارا لیتے تھے۔ مَیں کبھی اُن کا نیلی آنکھوں والا لونڈا (Blue eyed boy) نہ بن پایا۔ حق کی تو یہ ہے کہ مَیں اپنی بتّیس سال کی لمبی نوکری کے دَوران کِسی کا بھی نیلی آنکھوں والا لونڈا (Blue eyed boy) نہ بن سکا۔

ذرا جُھک جایئے جزا ہے بہُت
ہاں مگر راہ میں انا ہے بہُت
ہیں تقاضے کُچھ اور گردِش کے
ہیں کُچھ اِس دِل کی خواہشات الگ
ہر قدم ایک اِمتحان کے ساتھ
زِندگی ہم نے کی ہے شان کے ساتھ
قصور ایسا تھا ورنہ کیا ہمارا
فقط اپنی طرح سے سوچتے تھے

ساتھ اِس مُعاملے میں میرا ہمیشہ زبردست اِختلاف رہا۔ مُجھے جب کبھی اُن کے دفتر میں محکمے سے متعلق مُعاملات کے سِلسلے میں جانا پڑتا وہ محکمے کے کام کاج کے بارے میں بہُت کم بات کرتے اور اپنی ذات کے عِلاوہ دوُسری ذاتوں (جاتیوں) کے خِلاف پراپیگنڈہ شروُع کر دیتے جِسے میَں ہمیشہ بکواس نامہ کہا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر میرا سر درد کرنے لگتا بلکہ کئی بار تو مَیں اپنے سر کو پتھر کر لیتا اور اُن صاحب کا لیکچر ختم ہونے پر باہر جا کر کھُلی ہوا میں سانس لیتا۔ سُنا ہے کہ اُنہوں نے خود کِسی نام نہاد اوُنچی ذات کی لڑکی سے شادی کر رکھّی ہے۔ مَیں کئی بار سوچتا تھا کہ شاید وہ گھر کا غُبار دفتر میں نِکالتے تھے۔ مَیں اِس اصول کا سختی سے پیروکار ہوں کہ جِتنی نام نِہاد اوُنچی ذات والوں کی نام نِہاد چھوٹی ذات والوں کے لِئے نفرت قابلِ مذمّت ہے اُتنی ہی قابلِ مذمّت نام نِہاد چھوٹی ذات والوں کی نام نِہاد اوُنچی ذات والوں سے نفرت بھی ہے۔ کاش کوئی صُبح ایسی آئے کہ مَیں بِستر سے اُٹھ کر باہر نِکلوُں اور پاؤں کہ ہندوستان میں ذات پات کی بِدعت کا قلع قمع ہو چُکا ہے۔

اُن کِمشنر سیکریٹری صاحب کی ایک اور بات میرے لِئے بڑی کوفت ساماں تھی۔ مَیں جب بھی اُن کے دفتر جاتا وہ اپنے مہنگے مہنگے قلم (Pens) مُجھے دِکھاتے اور اُن کی تعریف میں قصیدے پڑھتے۔ اکثر اُن کے پانچ پانچ دس دس ہزار روُپے کے، کئی بار اُس سے بھی قیمتی مہنگے مہنگے قلم (Pens) کی سیاہی اُن کے ہاتھوں پر گِر جاتی اور اُن کے ہاتھوں کو رنگ دیتی۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر اپنے پی اے سے اصرار کرتے کہ وہ قلم (Pen) بنانے والی کمپنی والوں سے قلم کے ناکارہ ہونے کی شکایت کرے بلکہ اُنہیں سختی سے ڈانٹے۔ مَیں نہیں جانتا کہ اُن کے پی اے نے کبھی اُن کمپنیوں سے شِکایت کی یا نہیں (اور اُنہیں ڈانٹ پلائی یا نہیں) لیکن اُن صاحب کے ایسے ڈرامے مَیں نے کئی بار دیکھے ہیں۔ اِس کے عِلاوہ وہ

اپنے قیمتی سے قیمتی کپڑوں کے بارے میں لمبے لمبے لیکچر بھی اپنے سرکاری کاموں کے لِئے مختّص دفتر میں ہی دینا کبھی نہ بھولتے جب کہ مَیں ہمیشہ بازار سے سستے سے سستے کپڑے خرید کر پہننے میں کبھی شرم محسُوس نہ کرتا۔

اُن کی خوش نودی حاصِل کرنے والے کئی مُلازمین ہمیشہ اُن کی ہاں میں ہاں مِلاتے لیکن ایسے موقعوں پر میرے چہرے پر نمودار ہونے والے کڑوے کسیلے تاثرات کو وہ کبھی پسند نہ کرتے۔ میرا خیال ہَے کہ وہ اَپنے اندر کے احساسِ کمتری کو چھپانے کے لِئے بڑھیا بڑھیا کپڑے اور بڑھیا سے بڑھیا قلم کا سہارا لیتے تھے۔ مَیں کبھی اُن کا نیلی آنکھوں والا لونڈا (Blue eyed boy) نہ بن پایا۔ حق کی تو یہ ہے کہ مَیں اپنی بتّیس سال کی لمبی نوکری کے دَوران کِسی کا بھی نیلی آنکھوں والا لونڈا (Blue eyed boy) نہ بن سکا۔

ذرا جھک جایئے جزا ہے بہُت
ہاں مگر راہ میں انا ہے بہُت

ہیں تقاضے کُچھ اور گردِش کے
ہیں کُچھ اِس دِل کی خواہشات الگ

ہر قدم ایک اِمتحان کے ساتھ
زِندگی ہم نے کی ہے شان کے ساتھ

قصور ایسا تھا ورنہ کیا ہمارا
فقط اپنی طرح سے سوچتے تھے

اُن کِمشنر سیکریٹری صاحب نے محکمے میں اپنے تجربے کی بِنا پر ایک طرح کا جاسُوسی کا جال بچھا رکھا تھا جو اُنہیں محکمے کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے ملازم کی کارکردگی کی رِپورٹ دیتا تھا۔ مَیں دو سال لیبر کِمشنر رہا۔ دو سال ہی وہ بھی کِمشنر سیکریٹری لیبر اینڈ ایمپلائمنٹ رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُنہوں نے کبھی مُجھے میری من مرضی کے مُطابق محکمے کو چلانے ہی نہیں دِیا۔ چیف اِنسپیکٹر فیکٹریز کے طور پر میرا کام صنعتی کارخانوں کا اکثر مُعائنہ (Inspection) کرنا بھی تھا۔ لیکن جِس دِن بھی میرا پروگرام صنعتی کارخانوں کی اِنسپیکشن کا ہوتا مُجھے سِول سیکریٹیریئیٹ سے فون آجاتا کہ اُس دِن کِسی خاص مسئلے پر میٹِنگ رکھّی گئی ہے۔ یہاں تک کہ کئی بار ایسے پروگرام کو بہُت حد تک خُفیہ رکھنے کے باوجود سِول سیکریٹیریئیٹ سے ایسے فون آجاتے۔ سِول سیکریٹیریئیٹ کی اکثر میٹِنگز (Meetings) میں اہم ترین فیصلہ اگلی میٹِنگ کی تاریخ کا مقرّر ہو جانا ہی ہوتا ہے۔ اُوپر سے میٹِنگ اگر اُن کِمشنر سیکریٹری صاحب کے ساتھ ہوتو اُس کا زیادہ حِصّہ اُن کے قیمتی قلم (Pens) اور قیمتی لِباس کی تعریف میں ہی چلا جاتا۔ کبھی کبھار مَیں یا میرا کوئی ڈِپٹی لیبر کِمشنر یا اسِسٹنٹ لیبر کِمشنر یا کوئی اِنسپیکٹر فیکٹریز (جو اِنجنیئر ہوتے ہیں) کِسی کارخانے پر اچانک چھاپہ مارنے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو کُچھ لوگ فرضی ناموں سے جھوٹی شِکایات کی عرضیاں کِمشنر سیکریٹری لیبر کے پاس داخل کروانا شرُوع کر دیتے۔ مَیں نے ایسے مُعاملات کی شکایات کئی بار لیبر منِسٹر سے اور ریاست کے چیف سیکریٹری سے بھی کی ہیں۔ لیکن کارِسرکار جِس طرح چلتا ہے اُسی طرح چلتا رہتا ہے۔ کارِسرکار کے سِلسلے میں کِسی پنجابی مسخرے نے کہا ہے:-

زِندگی جنون ہے۔ پاٹی (پھٹی) ہوئی پتلون ہے

ہنڈ دی اے ہنڈ ائی جا

نہیں تے ٹا کیاں لوائی جا

لیبر کمِشنر کے ساتھ ساتھ پراویڈنٹ فنڈ کمِشنر کے طور پر میرا کام نیم سرکاری اداروں اور تمام نجی (Private) اداروں کے ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کی دیکھ ریکھ کرنا بھی تھا۔ اِس محکمے میں بھی لیبر محکمے کی طرز پر ہی ایک ڈپٹی کمِشنر صوبہ جموں کے لِئے اور ایک صوبہ کشمیر کے لِئے موجود تھا۔ اِس کے عِلاوہ اِنسپیکٹر وغیرہ دُوسرے ملازمین بھی ساری ریاست میں پھیلے ہوئے اداروں کے مُلازمین کے پراویڈنٹ فنڈ پر نظر رکھتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سکول دوکان ہوٹل کارخانے سبھی غیر سرکاری ادارے آج ملازموں کے پراویڈنٹ فنڈ جمع کروانے کے محتاج ہیں۔ کُچھ اداروں کے مالکان بھی اِس مُعاملے میں کوتاہی اور ہیرا پھیری کر جاتے ہیں اور کبھی کبھار ملازمین خود بھی پراویڈنٹ فنڈ جمع کروانے سے کنّی کترا جاتے ہیں۔ قاعدے سے ہر ملازم کو اپنی تنخواہ کا ایک مخصوص فی صد پراویڈنٹ فنڈ میں جمع کروانا پڑتا ہے اور اِتنا ہی پیسہ ہر ماہ مالکانِ ادارہ اپنی طرف سے اُس میں جوڑ کر محکمے کے پاس جمع کرواتے ہیں۔ اِس طرح محکمہ کُل جمع رقم پر ایک مخصوص سالانہ سُود جوڑ کر ہر ملازم کے کھاتے میں جمع کرواتا ہے۔ یہ پیسہ اکثر و بیشتر جموں و کشمیر بنک میں رکھا جاتا ہے جِس پر بینک کی طرف سے محکمے کو اپنے قانون کے مطابق سُود مہیا کِیا جاتا ہے۔ جِس زمانے میں مَیں پراوی ڈینٹ فنڈ کمِشنر تھا جموں کشمیر بینک میں محکمے کا زاید از بارہ سو کروڑ روپیہ جمع تھا۔

ایک تو محکمے کے ملازمین کی تعداد بہُت محدود اوپر سے دُور دراز کے عِلاقوں تک جموں اور سرینگر سے محکمے کی نِگرانی اور کافی حد تک خود ملازمین کی پراویڈنٹ فنڈ جمع کروانے

میں بدنیتی ریاست میں اِس محکمے کو بڑی پریشانی آنے لگی۔ اِس ضمن میں ریاست کے نیم سرکاری خودمختار اداروں (Autonomous bodies) کا ذِکر کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ جے اینڈ کے منرلز (J&K Minerals) جے کے آئی (جموں اینڈ کشمیر اِنڈسٹریز) اورسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن جیسے کئی خودمختار اِدارے جوخسارے میں چل رہے ہیں اور ملازمین کی تنخواہوں کے لِئے سرکاری مدد پر اِنحصار کرتے ہیں اکثر ملازموں کے پراویڈنٹ فنڈ جمع کروانے میں ناکام رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ملازم (کئی بار) سُبکدوش ہوجاتا ہے اور اُس کو پراویڈنٹ فنڈ کا اپنا حق نہیں مِلتا۔ ایسی حالت میں ملازموں کی انجمنیں (Trade Unions) اپنے اداروں کے خلاف تو جلسہ جلوس نِکالتی ہی رہتی ہیں ساتھ میں پراوپڈنٹ فنڈ ڈیپارٹمنٹ کو بھی مُسلسل پریشان کرتی رہتی ہیں۔ افسوس کہ ایسے مُعاملات کے مُستقِل اور یکبارگی حل کی کِسی کو فکر ہی ہے نہ فُرصت۔

سُود در سُود چڑھتا جاتا ہے
قِسط کوئی ادا نہیں ہوتی

مَیں دوسال لیبر کمِشنر رہا۔ اِن دو سالوں میں میری ذاتی زِندگی میں کُچھ ایک خوش نما واقعات بھی رُونما ہوئے۔ ایک تو رہائش کے لِئے کشمیر کے مشہورِ زمانہ چشمہ شاہی سے مُنسلک ایک ٹورسٹ ہٹ (چشمہ شاہی ہٹ نمبر ٦) میرے حق میں الاٹ کر دِیا گیا۔ ایک خوبصورت دو کمروں کا ہٹ جِس کے آنگن میں ایک آڑو (Peach) کا اور ایک فالسے (Cherry) کا درخت تھا اور عُقب میں تین چار خوبانی (Apricot) کے درخت تھے۔ اِن تمام درختوں کا پھل بہت ذائقہ دار تھا۔ اِنتہا پسندی کے منفی اثرات کے ساتھ ساتھ

سرکاری افسروں کے حق میں ایک مثبت اثر یہ رہا ہے کہ اُنہیں سرینگر کے اچھے سے اچھے ہوٹلوں میں اور چشمہ شاہی کے Huts میں رہائش کی خوش بختی حاصل ہوسکی۔ جس ہٹ میں میرا قیام تھا اُس کا سَیر وسیاحت کے تجارتی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو روزانہ کرایہ چار پانچ ہزار روپے تو ضرور رہا ہوگا۔

سرینگر میں گورنر ہاؤس (Raj Bhawan) بھی اُسی علاقے میں ہے۔ انو تو اکثر میرے ساتھ ہی رہتی تھی۔ چوچو جو اُس وقت نوئیڈا کی ایمٹی (AMITY) یونیورسٹی میں ماس میڈیا کی گریجویشن کی پڑھائی کر رہی تھی وہ بھی اپنی چھٹیاں ہمارے ساتھ ہی گزارتی۔ کئی رشتہ دار دوست وغیرہ وہاں میرے پاس آتے تو ایک طرف ڈل جھیل ایک طرف قلعہ ہری پربت، ایک طرف درگاہ شریف حضرت بل، ایک طرف پری محل (پیر محل) اور ایک طرف شنکر آچاریہ کا مشہور زمانہ مندر سامنے دیکھ کر جھوم اُٹھتے۔ مجھے یاد ہے وہاں مجھے ڈاکٹر ستندر سنگھ نورؔ (پنجابی شاعر/ادیب اور اُس وقت کے ساہتیہ اکادمی دہلی کے نائب صدر) شریمتی اجیت کور (پنجابی ادیبہ) راشد انور راشدؔ، جاوید انور (مدیر ماہنامہ تحریکِ ادب وارانسی) ڈاکٹر دیپک سموہن (پنجابی ادیب) کے علاوہ دوسرے کئی شعرا ادبا کی میزبانی کا موقع ملا۔

میری قریبی دوست اور مشہور ہندی شاعرہ انیلہ چاڑک کو جس دن ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے اُن کے شعری مجموعے ''ننگے پاؤں زندگی'' کے لئے Best Book Award سرینگر کے سینٹور لیک ویو ہوٹل (Centaur Lake View Hotel) میں گورنر کے ہاتھوں ملا تھا اُسی دن میں نے اُنہیں رات کے کھانے پر چشمہ شاہی کے اپنے ہٹ میں بُلایا تھا۔ انیلہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھیں اور اُنہوں نے کھانے سے زیادہ اُس

ہٹ میں اپنے مختصر قیام کا لُطف اُٹھایا تھا۔ چشمہ شاہی کا ووٹ اُس کے اِرد گرد پھیلے ہوئے دوسرے ہٹ (Huts)، سامنے سرینگر کا Botanical Garden اور ساتھ میں مشہورِ زمانہ Tulip Garden اور رات میں روشنیوں سے لبریز جھیل ڈل کا صاف وشفّاف پانی۔ وہاں میرے پاس آنے والے اکثر لوگ کہا کرتے، ''بیتاؔب صاحب آپ تو جنت میں رہتے ہیں یعنی جنت نشین ہیں۔''

ایک دِن لیبر کمیشنر کے اپنے جموں کے دفتر میں مَیں بیٹھا ہُوا تھا جب یہ واقعہ پیش آیا۔ شاید نومبر۔ دِسمبر ۲۰۰۶ کا کوئی دِن تھا جب شام کے ساڑھے تین چار بجے دفتر کے کُچھ ملازمین میرے کمرے میں آئے اور مُجھے بتایا کہ افروزہ نام کی ایک ملازمہ دفتر میں اچانک بے ہوش ہوگئی ہے۔ چار بجے دفتر بند ہونے پر ایک اور ملازم کو ساتھ لے کر مَیں افروزہ کو اُس کے سرکاری فلیٹ میں چھوڑنے کے لِئے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ افروزہ Depression (نفسیاتی دباؤ) کی شکار ہے۔ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد میرے پُوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی کیونکہ اُس کی اپنی ماں گُزر چُکی تھی سوتیلی ماں نے ڈاکٹر بننے کے اُس کے خواب کو پُورا نہیں ہونے دِیا۔ کِسی طرح اُس نے BSC تک کی پڑھائی مُکمّل کر لی مگر سوتیلی ماں کے آگے اُس کی ایک نہ چلی اور اُس کی شادی اُس سے کافی بڑے ایک سرکاری ملازم سے کر دی گئی جو اب ریٹائیر ہونے والا تھا جب کہ اُس کی اپنی عُمر اُس وقت تیس پینتیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔

افروزہ کو مجبُوری میں BSC پاس ہوتے ہُوئے بھی Orderly یعنی چپراسی کی نوکری حاصِل کرنا پڑی۔

افروزہ ایک نہایت خوبصورت لڑکی تھی جو کسی طرح سے بھی شادی شُدہ دِکھائی نہیں دیتی تھی۔ حالانکہ اُس وقت اُس کی دس دس بارہ بارہ سال کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔

اِتفاق سے اُنہیں دِنوں اُفروزہ نے بتایا کہ اُس کی ماں کو مُنہ کا سرطان (Mouth Cancer) ہو گیا ہے اور Chandigarh میں اُس کا عِلاج چل رہا ہے۔ افروزہ نے اپنی سوتیلی ماں کے عِلاج کا ذِمہ لِیا۔ اپنا سارا جمع شُدہ G.P.Fund نِکالا اور چھُٹی لے کر سوتیلی ماں کے عِلاج کے لِئے تنِ تنہا نِکل پڑی۔ مَیں نے ایک دِن سہواً ہی افروزہ سے کہا جِس سوتیلی ماں نے تمہارے ساتھ اِتنے ظُلم کِئے تُم اُس کے لِئے اِتنا تردّد کیوں مول لے رہی ہو۔ افروزہ نے کہا، ''صاحب جی، بے شک سوتیلی ہے لیکن ماں تو ہے۔ اُس نے جو کِیا سو کِیا مَیں اُسے اِس حالت میں بے سہارا نہیں چھوڑ سکتی۔ افروزہ نے سارا جی پی فنڈ نِکالا، ہم لوگوں نے یعنی محکمے کے کئی ایک چھوٹے بڑے ملازموں نے بھی کُچھ پیسہ جمع کر کے اُسے دِیا اور وہ اپنی سوتیلی ماں کا عِلاج کروانے کے لِئے کُچھ دِنوں کی چھُٹی لے کر نِکل پڑی۔ افروزہ خوبصورت تو تھی ہی خُوب سیرت بھی تھی۔

محکمہ لیبر کا ایک دفتر دہلی میں بھی ہے۔ وہاں ایک کلرک کی پوسٹ کُچھ عرصے سے خالی پڑی تھی۔ جب محکمے کے دُوسرے کلرکوں اور میٹرک پاس ٹائیپ جاننے والے تمام چپراسیوں نے دہلی جانے جانے سے اِنکار کر دیا تو مَیں نے افروزہ کو دہلی اُس آسامی پر بھیج دِیا۔ مَیں نہیں جانتا کہ لیبر ڈیپارٹمنٹ سے میری تبدیلی کے بعد بھی وہ کلرک کی آسامی پر رہ سکی یا نہیں مگر مُجھے بذاتِ خُود یہ تسلّی تھی کہ مَیں نے ایک بی ایس سی پاس قابل لڑکی کو اُس کی عزّت بحال کرنے اور کِسی حد تک اُس کے Depression کو کم کرنے میں اُس کی مدد

کی۔افروزہ سری نگر کے ہمارے چشمہ شاہی ہٹ میں کئی بار اپنی بچّیوں کے ساتھ ہمارے پاس آتی رہی تھی اور انُو کے ساتھ بھی اچھی طرح گھُل مِل گئی تھی۔

محکمہ لیبر میں ہی سیما کھڑیال نام کی ایک لیبر افسر تھی جو Scating کی قومی بلکہ بین الاقوامی کھِلاڑی رہ چُکی تھی۔ محکمے کی اندرونی لاگت بازی کی وجہ سے کُچھ لوگ اُس کے خِلاف اکثر سِول سیکریٹرئیٹ میں شکائتیں کرتے رہتے تھے۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ Sports Quota کی بِنا پر Direct لیبر افسر بھرتی ہونے کی وجہ سے محکمے کے کئی لوگ اُس سے حسد کرتے تھے۔ مَیں نے اُسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں اور حالات کا مُقابلہ کرنے میں مدد دی۔ اُس کے خِلاف جھوُٹی شکائتوں پر زیادہ دھیان نہیں دِیا بلکہ اُسے ہر سطح پر مُعاملے کا اپنا پہلوُ رکھنے کی پُوری آزادی دی۔ میری اِس اخلاقی اور نفسیاتی مدد اور اپنی ہمّت کی وجہ سے سیما کھڑیال نام کی وہ خُوبصُورت شادی شُدہ لڑکی بعد میں Asstt. Labour Commr. کے عہدے پر ترقّی پانے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ حالانکہ اُس کے حاسدوں نے اُس کو بدنام کرنے کے لِئے کئی بار میرے نام کو بھی بیچ میں گھسیٹنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ کِسی نے کیا خُوب کہا ہے کہ

مُدّعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظُورِ خُدا ہوتا ہے

کشمیر ہماری دُنیا کی جنت ہے اِس میں کوئی شک نہیں اِسی لِئے تو کِسی نے کہا تھا ؎

اگر فِردوس بر روُئے زمیں است
ہمیں است و، ہمیں است و، ہمیں است

بُرا ہو مسئلہ کشمیر کا جس کی وجہ سے آئے دِن جنت میں جہنّم کے نظارے جا بجا دیکھنے کو مِل رہے تھے۔ گلیوں بازاروں جلسوں، جلوسوں، یہاں تک کہ مذہبی اِجتماعات میں بھی بم دھماکے، اِنتہا پسندوں اور حفاظتی دستوں کے درمیان اکثر ہونے والی گولہ باری، نام نہاد آزادی کے لیئے لڑنے والوں کی طرف سے جاری گوریلا جنگ کے عِلاوہ سیاسی چالوں نے کشمیر کو جنت سے جہنّم بنانے میں کوئی کسر نہیں رکھ چھوڑی۔ اکثر اوقات سرکاری کرفیو یا علیحدگی پسندوں کی طرف سے کِئے گئے بند ہڑتال کے اعلانات کی وجہ سے انو اور چوچو اکثر جنت میں گھُٹن محسوس کرتے۔ میرا زیادہ تر وقت تو دفتر میں گُزرتا لیکن چھٹّی کے دِن یوں محسوس ہوتا گویا ہم کوئی A Class قیدی ہیں جو کِسی بڑی خوبصورت جیل میں قیدِ تنہائی کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ چشمہ شاہی کے اُس ہٹ میں چھٹّی کے ایک دِن جب شہر میں سرکاری کرفیو تھا یا شاید اِنتہا پسندوں کی طرف سے مکمّل بند کا اعلان کِیا گیا تھا، مَیں نے اپنے آنگن میں آڑو کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر مندرجہ ذیل نظم کہی تھی:-

جنت میں نظر بند رہو\
شہر پناہ سے باہر مت نِکلو\
شہرِ پناہ سے باہر مت جھانکو\
شہرِ پناہ سے آگے مت سوچو\
اِس سے آگے دوزخ ہے فقط دوزخ\
کِتنی محبت سے کِتنی مُشکل سے کِتنی حسرت سے\
جنت میں جگہ پائی تھی

مگر یہاں زِندگی کرنا کِتنا مُشکل ہے لگ بھگ ناممکن

آج اپنی تمام تر کاوِشوں محنتوں مشقتوں پر رونا آتا ہے

کہ ہم نے کِس بہشت کے لِئے

اپنی تمام آسائشیں آرائشیں قربان کر دیں

جی میں آتا ہے شہر پناہ کو پھلانگ کر

پھر اِک بار اُسی بھیڑ میں شامل ہو جائیں

جِسے جنت کے شہریاروں نے جہنّم کا نام دے رکھّا ہے

(نظم - کہا یہی جنت ہے؟)

جنوری ۲۰۰۸ء میں ایک خوش کُن بات جو میری زِندگی میں رُونما ہوئی وہ آئی اے ایس کے Super time scale میں میری ترقی ہے جِس کے بعد میرا عُہدہ سِول سیکریٹیرئیٹ میں .Commr/Secy کے برابر ہو گیا۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ میرے دِل کے کِسی کونے میں میری دیرینہ بلکہ نوکری کے آغاز سے ہی خواہش بھی تھی کہ میری سُبکدوشی سیکریٹیرئیٹ میں کِسی محکمے کے .Commr/Secy کے عُہدے سے ہو۔ اِس سطح پر آنے کے بعد مَیں چاہنے لگا تھا کہ اب میرا تبادلہ سیکریٹیرئیٹ میں ہو جائے۔ یوں بھی اُس کِمشنر سیکریٹری لیبر کے عامرانہ روّیے کے سائے تلے مَیں نوکری سے سبکدوش ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اِس ترقی سے میری تنخواہ میں بھی کافی اضافہ ہوُا تھا۔ اُوپر سے جنوری ۲۰۰۶ء سے Sixth Pay Commission کی سفارشات کے تحت ہماری تنخواہوں میں اچھّے خاصے اِضافے کے بقائے بھی مِل گئے جو لاکھوں میں تھے۔

زِندگی میرے لِئے ہمیشہ اچھّے بُرے اثرات کا ایک مرکّب رہی ہے۔ کھٹّے میٹھے کڑوے کسیلے ہر قِسم کے تجربات وقتاً فوقتاً میری چھٹی حِس پر اپنے اپنے نِشان چھوڑتے رہے ہیں۔

حاصِلی لاحاصِلی اچھّی رہی
کُل مِلا کر زِندگی اچھّی رہی

لینا دینا اِک برابر ہو گیا
مائیگی بے مائیگی اچھّی رہی

اپنے پن کی زیرِ تہہ لہروں میں کہیں
جو رہی بے گانگی اچھّی رہی

ضابطوں پابندیوں کے درمیاں
اپنی آشُفتہ سری اچھّی رہی

ہَم سے ہی چارہ گری منسُوب تھی
اپنی خُود بے چارگی اچھّی رہی

اَے دِلِ بیتابؔ دُنیا سے تِری
عُمر بھر کی بے دِلی اچھّی رہی

دراصل شاعر کا دِل عام آدمی کے دِل کے مقابلے میں زیادہ حسّاس ہوتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی خوشی میں دِل شاعر کو بڑی سے بڑی خوشی مِلتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے غم میں

شاعر کا دِل حد سے زیادہ غمگین ہو جاتا ہے۔ صِرف اپنی ہی نہیں بلکہ دوسروں کی خوشی غمی کو بھی دِل شاعر اُسی شِدّت سے محسوس کرتا ہے۔ بڑا غم یا بڑی خوشی مِل جائے تو شاعر کا دِل جواب ہی دے جائے یعنی اُسے Heart Attack ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قریب قریب ہر شاعر کی شاعری میں خوشی کے اور غم کے احساسات جا بجا بخوبی مِل جاتے ہیں۔ حالانکہ میری زِندگی میں بڑے حادثات بھی رونما ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ ایک شاعر ہوتے ہوئے مَیں ہر تجربے ہر حادثے ہر المیے کو اُس کی اصلی حیثیت سے زیادہ کر کے محسوس کرتا رہا ہوں اور شاید میرے جیسے دُوسرے لوگ بھی اِن تجربات وحوادِث سے ضرور گُزرتے ہوں گے۔ بارہویں صدی کے پنجابی شاعر حضرت شیخ فرید الدّین گنج شکر کہتے ہیں:۔

مَیں جانیا دُکھ مُجھ کو دُکھ سبایا جگّ
اُچّے چڑھ کے دیکھیا گھر گھر ایہا اگّ

اُسی عہد میں یعنی ۲۰۰۸ء میں میرے دو شِعری مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آئے۔ ''نظم اِکیسویں صدی'' میری نظموں کا اِنتخاب تھا جِسے یو پی اُردو اکادمی نے ۲۰۰۹ء کے لِئے ایوارڈ بھی دِیا۔ اِس کے عِلاوہ میری غزلوں کا ایک اِنتخاب ''شہرِ غزل'' کے نام سے بحرُوفِ دیوناگری بھی شائع ہُوا۔ اِن دونوں کِتابوں کی رسمِ اجرا جموں کلب میں منعقد ہُوئی جِس میں خاص طور سے کرِشن کُمار طورؔ، پریم کمار نظرؔ اور ہندی کی مشہُور افسانہ نِگار اور نقاد ڈاکٹر اُرمِلا سریش (بھوپال) نے شِرکت کی تھی۔ ''شہرِ غزل'' کو بھارت سرکار کے سنٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ نے ہندی تر بھاشی لیکھک پُرسکار ۲۰۰۹ء دیا تھا جِس کے ساتھ ایک لاکھ رُوپے کا نقد اِنعام بھی شامِل ہے۔

میری لیبر کمشنر کے طور پر تعیناتی کے دَور میں ہی ۲۰۰۷ء کے اکتوبر مہینے میں میرے والِد تقریباً ۸۹ سال کی عُمر میں اِس جہانِ فانی کو خیر باد کہہ گئے۔ میرے والِد بذاتِ خود عِلم وادب کا خزانہ تھے۔ مَیں اپنے آپ کو اُن کا فنّی اور عِلمی وارث سمجھتا ہوں۔ مَیں نے دُنیائے شِعر وادب کی جو تھوڑی بہُت خِدمت کی ہے اُس میں میرے والِد کی بچپن میں مُجھے دی ہوئی غیر رسمی تعلیم کا بہُت بڑا حِصّہ ہے۔ پِتاجی کی وفات کے پورے چھ مہینے بعد یعنی مئی ۲۰۰۸ء میں میری والِدہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لِئے چَین کی نیند سو گئیں۔ یہ دونوں واقعات اندر اندر مجھے کاٹتے رہے ہیں۔ ماں باپ کی کمی اُن کے گُزر جانے کے بعد ہی محسوس ہوتی ہے۔ جب ماں باپ زِندہ تھے وہ مُجھ سے دُور رہے، مَیں اُن سے دُور رہا۔ جب سے وہ گُزر گئے ہیں دونوں ہر دم میرے ساتھ رہتے ہیں۔ میرے اندر میرے گھر کے اندر بھی اور میرے دِل کے اندر بھی۔ میری بیٹی رُوچکا (چوُچوُ) جِس کو کبھی اپنے دادا دادی کے نزدیک رہنے کا موقع نہیں مِلا وہ اُن کے جیتے جی بھی اُن کی کمی کو بہُت بُری طرح سے محسوس کرتی رہی ہے اور اُن کے گُزر جانے کے بعد بھی اُن کی کمی کو بُری طرح سے محسوس کر رہی ہے۔ البتہ مُجھے ایک بات کی دِلی تسلّی ہے کہ ماں اور باپ دونوں کی زِندگی کے آخری کُچھ سالوں میں مَیں نے اُن دونوں کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ پِتاجی تو کئی سالوں سے کئی طرح کی بیماریوں کی وجہ سے چلنے پھِرنے سے قریب قریب معذور تھے۔ ماتاجی بھی زِندگی کے آخری چھ مہینے بِستر پر ہی دراز رہیں۔ مَیں نے اُن کے آخری سالوں میں جی بھر کے مالی اور کئی اور طرح سے خوب خِدمت کی۔ انو اور چوُچوُ کو بھی آخری سالوں میں دونوں نے ڈھیر ساری دُعائیں دی ہیں۔ مُجھے یقین ہے وہ دونوں جاتے وقت ہم تینوں سے بہت خوش تھے اور جاتے جاتے بھی ہمیں آشیر واد دے رہے تھے۔ میرے باپ نے مُجھے بچپن سے جو غیر رسمی تعلیم دی ہے وہ

میری شاعری میں جابجا نمایاں ہے۔

اُسی زمانے میں مجھے دوبار اسمبلی اِنتخابات میں Election Commission of India کی طرف سے Election Observer کے طور پر کام کرنے کا موقع مِلا۔ پہلی بار ۲۰۰۷ء کے یو پی کے اسمبلی اِنتخابات میں پیلی بھیت کی اسمبلی سیٹ کے لِئے کام کرتے ہوئے مُجھے دو ایک مہینے یو پی اور اُترا کھنڈ کے بارڈر پر قائم پیلی بھیت ضِلع میں رہنے کا موقع مِلا۔ یو پی کے ضِلع پیلی بھیت اور اُترا کھنڈ کے ضِلع اودھم سِنگھ نگر آپس میں اِس طرح سے سٹے ہوئے ہیں کہ کئی بار اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ یو پی میں ہیں یا اُترا کھنڈ میں۔ ایک جیسے چاول اور گنّے کے کھیت، ایک جیسے چھوٹے ندی نالے، ایک جیسی زبان بولنے والے لوگ، بلکہ یہاں تک کہ دونوں ضلعوں میں سِکھ کِسانوں (Farmers) کے دُور دُور تک پھیلے ہوئے کھیت (Farms)۔ مُجھے بتایا گیا کہ پنجاب سے آئے ہوئے سِکھ کِسانوں نے کِسی زمانے میں یہاں آکر سانپ، بچھو، شیر، چیتا، بھیڑیا وغیرہ جانوروں سے بھرے ہوئے کٹھن سے کٹھن جنگلوں کو خوبصورت آبی زرخیز زمینوں میں بدل دِیا۔ اِن سِکھ کِسانوں کی ترائی کے اِس عِلاقے میں سیاسی سطح پر بھی اہم حیثیت ہے۔ مُجھے بتایا گیا کہ آج بھی خطرناک سے خطرناک جانور اکثر اِن کھیتوں میں آجاتے ہیں۔ یو پی اور اُترا کھنڈ کے اِسی عِلاقے میں مشہُورِ زمانہ Cobalt belt کا جنگل دُور دُور تک پھیلا ہُوا ہے۔

پیلی بھیت ضلعے سے قریب ہی نیپال کا مہندر نگر نام کا شہر آباد ہے۔ دِن بھر ایک ڈیم (Dam) کے آر پار لوگوں کا نیپال سے بھارت اور بھارت سے نیپال آنا جانا لگا رہتا ہے۔ پیلی بھیت اور اودھم سِنگھ نگر سے آئی ہوئی سبزیاں اور پھل نیپال کی دُکانوں پہ دیکھے جا

سکتے ہیں جبکہ کپڑا، بجلی کا سامان (Electronic Goods) کیمرہ، سکاچ وِسکی، وائین(Wines) اور جانے کیا کیا Foreign Goods مہیندر نگر سے پیلی بھیت ہندوستان جاتے ہیں۔ ایک دِن پیلی بھیت کے ایک سینئیر پولیس افسر ہمیں اپنے ساتھ مہندر نگر لے گئے اور وہاں ہم نے کُچھ خریداری بھی کی۔ مہندر نگر نیپال کے سیدھے سادھے شریف النفس لوگ مُجھے آج بھی یاد آتے ہیں۔

اُس وقت کے پیلی بھیت کے اخراجات کے Election Observer نونیت سونی ایک نہایت خوشدِل آفیسر ہیں۔ اُن کے ساتھ ہماری بہُت خوبصورت نِشستیں رہیں۔ نونیت سونی آج کل دہلی میں اِنکم ٹیکس کمشنر ہیں اور ہمارے بہُت اچھے دوست ہیں۔ پیلی بھیت کی اِلیکشن ختم ہونے پر مَیں دو ایک دِن کے لِئے نینی تال (اُترّاکھنڈ) کا خوبصورت صحت افزا مقام بھی دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ نینی تال ایک دِلکش پہاڑی مقام (Hill City) ہے جِس کے اندر اندر ایک بہُت خوبصورت جھیل ہے جِسے دیکھنے کے لِئے دوُر دوُر سے لوگ آتے ہیں۔ نینی تال کے آس پاس کچھ اور چھوٹی بڑی جھیلیں ہیں جِن میں بھیم تال سب سے بڑی جھیل ہے۔ نینی تال کے آس پاس کا پورا عِلاقہ بہُت خوبصورت پہاڑوں پر مُشتمل ہے۔ نینی تال میں سردیوں میں اچھی خاصی برف گرتی ہے۔

اِسی طرح قریب قریب ایک سال بعد یعنی اپریل ۲۰۰۸ء میں مُجھے کرناٹک اسمبلی اِنتخابات کے سِلسلے میں بنگلور اور میسوُر کے درمیان عین شاہراہ پر واقع ضِلع منڈیا میں الیکشن اوبزرور بن کر جانے کا موقع مِلا۔ الیکشن اوبزرور کا کام نیلی آنکھوں والے (blue eyed boys) لونڈے افسروں کے لِئے ناپسندیدہ ترین کام ہے۔ اکثر اوقات اُن کی جگہ پر سیاسی

طور پر بے یار و مددگار افسروں کو آگے کر دِیا جاتا ہے۔ بہر حال مِنڈیا میں اِلیکشن اوبزرور کے طور پر میں نے کرناٹک کی نہایت زرخیز زمینوں کا دَورا کِیا۔ اگر ناریل کے درختوں پر نظر نہ جائے تو اُس عِلاقے میں گنّے اور چاول کے کھیت بالکل پنجاب کے سرسبز کھیتوں کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ کرناٹک کا وہ عِلاقہ Sugar Bowl بھی کہلاتا ہے۔ جنوبی ہند کے اُس دیہی عِلاقے میں مُجھے اصل بھارت کے درشن ہوئے۔ آج کی تاریخ میں ہندوستان میں بنیادی ہندوستانی تہذیب وثقافت اگر کہیں زِندہ ہے تو وہ کرناٹک کے اُن دیہی عِلاقوں میں ہے۔

ضِلع مِنڈیا کی صدر اسمبلی سیٹ کے لِئے مَیں اِلیکشن اوبزرور تھا جبکہ اخراجات کی اوبزرور محترمہ وندنا ساگر تھیں۔ جو اُس وقت اندور میں ایڈیشنل کمِشنر اِنکم ٹیکس تھیں اور آج کل ممبئی میں کمِشنر انکم ٹیکس ہیں۔ وندنا اُس وقت قریب قریب چالیس برس کی ایک نہایت خوبصورت اپنے کام میں چاک وچوبند آفیسر تھیں۔ ہم لوگ ایک ہی مہمان خانے (Guest House) میں رہتے تھے۔ اِکٹھے کھاتے پیتے تھے، عِلاقے کے (Polling Booths) کا دَورہ اِکٹھے کرتے تھے۔ وندنا بنیادی طور پر چنڈی گڑھ کی ایک پنجابی لڑکی ہیں جو پہلے وندنا چاولہ تھیں۔ شادی کے بعد وندنا ساگر ہوگئی ہیں۔ ہمارے دو مہینے ساتھ ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کام کرنے اِنتخابی مراکز کا مُعائنہ کرنے اِنتخابات سے متعلق افسران کے کام کاج کی دیکھ ریکھ کرنے کے مُعاملات کے بیچ ہم لوگوں میں پیدا ہونے والے دوستانہ بلکہ محبانہ تعلقات دائمی حیثیت اِختیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وندنا نے ''شہرِ غزل'' نام کے میرے دیوناگری رسم الخط کے مجموعے کا مسوّدہ دیکھ لیا تھا جس کے بعد ہمارے درمیان شِعر وادب اور موسیقی کے بارے میں اکثر گُفتگو رہتی تھی۔

منڈیا اور میسور کے علاقوں میں اپنے کام کے سلسلے میں گھومتے ہوئے میں نے اپنی کئی نظمیں حاصل کی ہیں۔ دراصل اُس وقت تک کی میری نظموں کا انتخاب "نظم اکیسویں صدی" لگ بھگ چھپ چکا تھا اور اب تک مجھے لگنے لگا تھا کہ میں اس کے بعد نظم کے میدان میں کچھ زیادہ نہ کر سکوں گا لیکن جنوبی ہند کی رومانی اور روحانی (Metaphysical) فضاؤں نے مجھے بالکل الگ اور نئی قسم کی نظموں سے روشناس کروایا اور کسی حد تک ان نظموں کی تخلیق میں وندنا ساگر کے سُہاونے لُبھاونے من موہنے ساتھ کا بھی ہاتھ ہے۔ میں وندنا سے اس بات کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ اُس زمانے کی بلکہ منڈیا کے گیسٹ ہاؤس میں لکھی گئی نظم "میں اور میں اور میں" میرے شعری مجموعے "فلک آثار" میں شامل ہے ملاحظہ ہو:-

گاڑی پر افسرانہ ٹھاٹھ میں
اُس گاؤں میں داخل ہوتے ہی
میں نے دیکھا کہ ایک اور میں
سامنے سے بیل گاڑی کو ہانکتا ہوا
میری جانب چلا آرہا ہے
تھوڑا اور آگے جا کے میں نے دیکھا
کہ ایک اور میں ناریل کے پیڑ پر چڑھا ہوا
ناریل توڑ توڑ کر نیچے پھینک رہا ہے
تھوڑا اور آگے ایک بوڑھی بدصورت میں
ننگے پاؤں گنّے کاٹ کاٹ کر کھیت میں ڈھیر لگا رہی تھی
پھر تھوڑا اور آگے جا کر دیکھا

کہ بہُت سے چھوٹے چھوٹے بچّے بھری دوپہر میں
اور پسینے میں تربتر گندے میلے کپڑے پہنے ہوئے
ایک کچے کمروں والے سکول سے باہر آرہے تھے
گاؤں سے باہر آتے آتے
اِتنے مَیں دیکھ کر
مَیں اپنے مَیں کو بھول گیا
واپس اپنے اعلیٰ شان دفتر میں آکے
مجھے محسوس ہوا
کہ میرا اپنا مَیں تو
اُس گاؤں میں ہی کہیں چھوٹ گیا ہے
اور یہ مَیں جو میرے ساتھ ہے
یہ تو کِسی سرکاری افسر کا مَیں ہے

منڈیا میں کہی ہوئی میری زیادہ تر نئی نظمیں میرے شعری مجموعے ''فلک آثار'' میں شامل ہیں۔ منڈیا-میسوٗر کے اُن دو مہینوں نے جہاں مُجھے ''نظم اکیسویں صدی'' سے آگے کی نظمیں عطا کی ہیں وہیں وندنا ساگر جیسی ایک نہایت خوبصورت ہمدرد اور پیاری دوست بھی میری جھولی میں ڈالی ہے۔

منڈیا کے ساتھ لگتا شہر میسوٗر جنوبی ہند کا ایک نہایت خوبصورت شہر ہے۔ وندنا ساگر اور چندر ہاس دوٗبے نام کے ایک اور اِلیکشن اوبزرور کے ساتھ مَیں نے میسوٗر کے ورنداون

گارڈن، ایک بڑی خوبصورت جھیل جس میں طرح طرح کے پنچھیوں سے مُلاقات ہوئی (مَیں اُس جھیل کا نام بھول رہا ہوں) اور ''مدھر'' نام کے ایک چھوٹے قصبے سے کُچھ فاصلے پر سائبیریا سے چھ مہینے کے لِئے آنے والے سارس بھی دیکھے۔ سارس یعنی سائبیرین کرین چھ مہینے کے لِئے سائبیریا چلے جاتے ہیں پھر واپس آجاتے ہیں۔ وہاں ہمیں بتایا گیا کہ تین مہینے سے کم عُمر کے سارس کے بچّے اُڑ نہیں سکتے لہٰذا اُن کے والدین اُنہیں پیچھے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور جب چھ مہینے کے بعد وہ واپس آتے ہیں تو وہ بچّے اُڑنا سیکھ چُکے ہوتے ہیں۔

مُجھے وہاں تین مہینے سے کم عُمر کے سارس کے بچّے دیکھ کر سکھوں کے ایک مشہُور مذہبی کلام، ''رہ راس'' میں شامل پانچویں گورُو ارجن دیو کے مندرجہ ذیل مصرعے یاد آئے:-

کاہے رے من

چتویں اُدھم

جاں آہر

ہر جیو پریا

''سیل پتّھر میں جنت اُپائے

تاں کا رِزق آگے کر دھریا

اُوڈے اُوڈ آویں سے کوسا

تِس پاچھے بچرے چھریا

تِس کون کھلاوے کون چُگاوے

من میں سِمرن کریا''

وندنا ساگر کے ساتھ گزارے ہوئے وہ دِن رات میری زِندگی کا بیش قیمت اور نا قابلِ فراموش اثاثہ ہیں۔

میسوُر میں تو مَیں اِس سے پہلے بھی آچُکا تھا جب میرے شِعری مجموعے ''موجِ ریگ'' کو Central Institute of Indian Languages, Mysore کی جانب سے پچیس ہزار روُپے کا ''بھارتی بھاشا سمّان ۲۰۰۵/۲۰۰۴'' دِیا گیا تھا تو مَیں اور انو انسٹی چیوٹ کے خوبصورت مہمان خانے (Guest House) میں کُچھ دِن آکر رُکے تھے۔ مَیسوُر معتدل موسم والا اِتنا خوبصورت شہر ہے کہ وہاں کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ آدمی جموں کشمیر یا ہماچل پردیش کے کِسی شہر میں گھوم رہا ہے۔ مَیسوُر کے ساتھ لگتے جنگل پیچھے تامِل ناڈوُ تک چندن کی لکڑی سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ وہی عِلاقہ ہے جہاں سے چندن کی لکڑی کی سمگلنگ کی خبریں اکثر آتی رہتی ہیں۔

وندنا ساگر کے ساتھ رہتے ہوئے منڈیا۔ میسور میں مَیں نے جو نظمیں کہی ہیں اُن میں سے ایک نظم مَیں نے بعد میں جموں سے ٹیلی فون پر وندنا کو سُنائی تھی جِس کا عُنوان تھا ''میری نظموں میں کچھ نظمیں دراصل تُمہاری ہیں''۔

باب - ۱۶

میری دِلی خواہش کے مطابق جون ۲۰۰۸ء میں میرا تبادلہ سِول سیکریٹریٹ میں کمِشنر سیکریٹری ایڈمنسٹریٹو ریفارمز اِنسپیکشنز اینڈ ٹریننگز (Administrative Reforms Inspections & Trainings) کے طور پر ہو گیا۔ سِول سیکریٹریٹ میں یہ محکمہ نیلی آنکھوں والے لونڈوں (Blue eyed boys) کے لِئے غیر اہم ہوتا ہے لیکن سنجیدگی سے نِظامیہ (Administration) میں سُدھار کے خواہشمند افسر یہاں بہُت کُچھ مثبت نوعیت کا کام کر سکتے ہیں۔

سرکاری نوکری میں میری یہ آخری تعیناتی تھی۔ مئی ۲۰۰۹ء میں مُجھے سُبکدوش (Retire) ہونا تھا۔ اِس بیچ میں میرا اور تبادلہ ہونا ناممکن تھا کیوں کہ نیلی آنکھوں والا کوئی لونڈا (Blue eyed boy) اِس محکمے میں آنا پسند نہیں کرتا ورنہ میرا کہیں اور تبادلہ بھی عین مُمکِن تھا۔

اِس محکمے کے ذِمّے ایک کام تمام سرکاری محکموں کے قواعد وقوانین کو بنانے اور اُن میں ضرُوری تبدیلیاں (Amendments) کرنے کے تمام معاملات کی دیکھ ریکھ (monitoring) کرنا ہے۔ مَیں نے محکمے میں اپنی قلیل وقتی تعیناتی کے دوران کافی محکموں کے لعل تسمے (Red Tape) میں بندھے ہوئے قواعد و قانون کے معاملات کو سرے چڑھایا۔ مُجھے افسوس ہے کہ مُجھے وہاں کام کرنے کا زیادہ موقع نہیں مِلا ورنہ مَیں تمام بقایا (Pending) پڑے معاملات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ میرے ماتحت کام

کرنے والے چھوٹے بڑے ملازمین یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے کہ سرکار اِس محکمے میں اکثر ایسے افسروں کی تعیناتی کرتی ہے جو جلد ہی سبکدوش ہونے والے ہوتے ہیں۔ اگر کبھی کِسی دوُسری نوعیت کے یا نیلی آنکھوں والے لونڈے افسر کو یہاں تعینات کر دِیا جائے تو وہ جلد ہی اپنی جان یہاں سے چھڑانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اِس لئے قواعد و قوانین کے اکثر معاملات (Cases) لال تسمے (Red Tape) کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ مُجھے یاد ہے کہ میری سبکدوشی (Retirement) کے بعد ایک صاحب (جو اُس وقت محکمہ بجلی کے کِمشنر سیکریٹری تھے) کا تبادلہ میری جگہ پر کر دِیا گیا اور وہ لمبی چھٹّی لے کر ریاست جموں و کشمیر سے گدھے کے سر پر سینگ کی طرح سے غائب ہو گئے اور من مرضی کے کِسی محکمے میں اپنی تعیناتی کروانے کے بعد ہی واپس نمودار ہوئے۔

میرے محکمے کے ذِمّے ریاستی Board of Professional Entrance Examinations کی دیکھ ریکھ کرنا بھی تھا۔ پچھلے کُچھ عرصے سے اِس محکمے میں بڑے افسروں کے بے دِلی سے کام کرنے یا بالکل کام نہ کرنے کی وجہ سے BOPEE کا کافی کام General Administration Deptt نے سنبھال لِیا تھا۔ لٰہذا BOPEE دو ملاّؤں (محکموں) میں مُرغا حرام بنا ہُوا تھا۔ مَیں نے اعلیٰ حکّام سے گزارش کی تھی کہ BOPEE کو یا تو پوری طرح سے اے آر آئی محکمے کے ساتھ رکھّا جائے یا پِھر پوری طرح سے .G.A.D کے ساتھ۔ میری سُبکدوشی تک اِس معاملے کا نمٹارا ہونا تو ناممکن تھا ہی مُجھے یقین ہے بعد میں آنے والے افسروں کو بھی اِس بارے میں سوچنے کی فُرصت ہی نہ مِلی ہوگی۔ نظامیہ (Administration) میں میری ایسی کاوِشوں کے ردِ عمل کے طور پر مُجھے اکثر یہی سُننے کو مِلا ہے کہ، ''بیتابؔ صاحب تو شاعر ہیں وہ تو نظامیہ میں بھی شاعری ہی کرتے

ہیں''۔

میرا خیال ہے کہ شاعرانہ سچائی (Poetical Truth) ہی اصل سچائی ہوتی ہے ۔سیاسی سچائی (Political Truth) یا اِنتظامی سچائی (Administrative Truth) تو محض طلسماتی فریب سازی کے عِلاوہ کُچھ بھی نہیں۔

میری سبکدوشی قریب تھی لیکن مَیں نے اُس محکمے میں جی جان سے کام کِیا۔ مجھے اُس بُخار کا بھی تجربہ نہیں ہُوا جو سُنا ہے کہ نوکری سے سبکدوشی کے قریب سرکاری ملازموں خاص طور پہ بڑے افسروں کو اپنی جکڑ میں لے لیتا ہے۔ بلکہ مَیں تو پچھلے کچھ عرصے سے اپنی رُوح کی طرح اپنے جِسم کو بھی آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ لٰہذا میری اِس آخری محکمہ جاتی تعیناتی کے دوران میرے پر اور کُھل رہے تھے:۔

کچھ تو ہم پہلے سے بھی آزاد تھے
اور کچھ پرواز میں بھی پر کھُلا
بحر و بر ہو چکے نقشِ پا
فِکر کو آسماں چاہیئے

محکمہ اے آر آئی کے تحت آنے والے کاموں میں محکمہ سٹیشنری اینڈ پرنٹنگ کے معاملات بھی تھے۔ مَیں خود چونکہ ایک زمانے میں ڈائریکٹر سٹیشنری اینڈ آفس سپلائیز رہ چکا تھا اِس لِئے سرکاری چھاپہ خانوں (Govt. Press) اور سٹیشنری کے محکمے کے کئی بقایا (Pending) معاملات کو بھی مَیں نے پوری دِلچسپی کے ساتھ نمٹانے کی بھرپور کوشش کی۔

پچھلے چار پانچ سال سے جموں کے تر کُٹا نگر کے ساتھ لگتے دیہی عِلاقے میں دھیمی

رفتار سے تعمیر ہونے والا میرا مکان اب لگ بھگ تیار تھا۔ چھنّی ہمّت کے چھوٹے سے مکان میں ۱۴ سال کے سرکاری نوکری کی پریشانیوں سے لبریز تجربات کو پیچھے چھوڑ کر مَیں اپنی باقی زِندگی (Retired life) امن وچین سے گزارنا چاہتا تھا۔ دِسمبر ۲۰۰۸ء سے ہم لوگ وہاں جاکے بس گئے۔ چھنّی ہمّت کے مکان کے مقابلے میں یہ مکان قدرے کھُلا کھُلا ہے۔ کھُلا مکان کھُلی سوچ کھُلی زِندگی یہی میری سُبکدوش (Retired) زِندگی کا ایجنڈا تھا۔

میری بیٹی روچِکا (چوُچو) اب دہلی کے نزدیک نوئیڈا کی AMITY University میں ماس میڈیا میں گریجویشن کی تعلیم حاصِل کررہی تھی۔ اُس کی یہ پڑھائی مارچ ۲۰۱۰ء تک مکمّل ہونے والی تھی اور اُس کا اِرادہ Bolly wood (ہندوستانی فِلمی دُنیا) میں ڈائریکٹر بننے کا تھا۔ مَیں نے اُس کے ممبئ میں مستقِل قیام کے بارے میں بھی سوچنا شروُع کردِیا تھا۔ سُبکدوشی (Retirement) کے وقت جی پی فنڈ، گریچوئٹی، دس مہینے کی بقایا چھٹّیوں کے عِوض میں مِلنے والی تنخواہ اور وظیفے (Pension) کا کُچھ حِصّہ Commute کرواکے قریب قریب ۶۰/۷۰ لاکھ روپے مِلنے کی اُمّید تھی۔ لِہٰذا مَیں نے اور انوُ نے فیصلہ کِیا کہ اُسے ممبئ میں اپنا ایک چھوٹا موٹا فلیٹ لے کر دے دیں گے تاکہ اُسے کِرائے کے مکان میں نہ رہنا پڑے کیونکہ ممبئ میں روٹی تو مِل جاتی ہے رہنے کو جگہ نہیں مِلتی۔ کِرائے پر چھوٹے سے چھوٹا فلیٹ بھی بیس پچّیس ہزار روُپے ماہانہ سے کم نہیں مِلتا۔ مَیں نے اپنے دوست سُرجیت سِنگھ گھُمّن عُرف پنکی سے چوچو کے لِئے کوئی چھوٹا موٹا فلیٹ دیکھنے کے لِئے کہہ دِیا۔ پنکی تجارتی بحریہ (Merchant Navy) میں کپتان (Captain) ہیں اور میری اور انوُ کی مشترکہ دوست سویتا کے شوہر ہیں۔ سویتا پنجابی فِلموں کی ایک نامور اور خوبصورت گلوکارہ ہیں۔ اُنہوں نے فِلموں کے عِلاوہ غیر فِلمی نغمے غزلیں اور گیت بھی گائے

ہوئے ہیں۔ سویتا سے ہماری مُلاقات ۱۹۸۵ء میں ممبئی میں ہوئی تھی جب مَیں فروری مہینے کی پہلی تاریخوں میں آل اِنڈیا ریڈیو ممبئی کے آل اِنڈیا مشاعرے میں شرکت کی غرض سے انو کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ مجھے یاد ہے آکاش وانی تھیئٹر میں منعقد ہونے والے اُس مشاعرے میں سردار جعفری، مجروُح سُلطانپوری، کیفی اعظمی، جگن ناتھ آزاد، فضیل جعفری، پریم کمار نظر، آزاد گُلاٹی وغیرہ کے عِلاوہ اور کئی نامور شعرا نے حِصّہ لِیا تھا۔ سامعین میں اور کئی نامور ہستیوں کے عِلاوہ مشہور غزل گائک جگجیت سِنگھ بھی موجود تھے۔ سویتا جو کِسی زمانے میں نابھہ (پنجاب) میں آزاد گُلاٹی کی طالبہ (Student) رہ چُکی ہیں ریلوے سٹیشن پر آزاد گُلاٹی کو لینے آئی تھیں جہاں آزاد گُلاٹی صاحب نے اُن سے ہماری مُلاقات کروائی تھی۔ وہ مُلاقات آج ایک بہُت ہی قریبی دوستی میں بدل چُکی ہے بلکہ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ شاید سویتا اور پنکی سے ہمارا کوئی پچھلے جنموں کا سمبندھ (رِشتہ) ہے۔ پنکی کے تعلق سے مُجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ ایک بار ممبئی کے ایک عِمارت ساز (Builder) نے دھوکے بازی سے ایک فلیٹ کے لِئے اُن کی booking کو منسوخ کر دِیا تھا۔ یہ ایک دھوکہ دھڑی (Breach of Contract) تھی لیکن کیونکہ booking کے بعد مکانوں (Flats) کی قیمتیں بہُت بڑھ چُکی تھیں لہٰذا وہ بِلڈر بے ایمانی پر اُتر آیا تھا۔ پنکی نے مُجھ سے ذِکر کِیا تو مَیں نے پنڈت منگت رام جی سے (وہ اُن دِنوں لیبر مِنسٹر تھے اور مَیں لیبر کمِشنر) سے اِس سِلسلے میں مدد مانگی۔ پنڈت جی نے مہاراشٹرا کے اُس وقت کے چیف مِنسٹر وِلاس راؤ دیش مُکھ (جو مشہور فِلمی اداکار رِتیش دیش مُکھ کے والِد ہیں) کے نام چِٹھی لِکھ دی اور پنکی کے فلیٹ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ پنکی اِس واقعے کا ذِکر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ سویتا اور پنکی ہمارے لِئے ممبئی میں مناسب فلیٹ کی تلاش شروُع کر چُکے تھے۔

میرے لیبر کمشنر رہتے ہوئے ڈاکٹر ملوقہ سے میرا تعارف ایک عجیب و غریب انداز میں ہوُا۔ مزدوُروں اور دوُسرے کارِندوں کے لِئے قائم کِئے گئے مراکزِ صحت(Health Centres) میں سے ایک مرکز سرینگر شہر کے قمرواری عِلاقے میں اِنتہا پسندی کے عہدِ شباب سے بند پڑا تھا۔ اُس وقت کے ریاست کے وزیرِ زراعت غُلام حسن میر صاحب کی بہوُ ڈاکٹر ملوقہ کی تعیناتی اُس Dispensary میں ہوگئی۔ محکمہ بھی چاہتا تھا کہ دوُسری Dispensaries کی طرح وہ بھی کھُل جائے۔ ڈاکٹر ملوُقہ کی وہاں تبدیلی کا سرکاری حُکم بھی جاری ہوگیا لیکن کِسی وجہ سے وہ قمرواری کے اُس مرکزِ صحت میں اپنی کُرسی نہ سنبھال سکیں اور سِول سیکریٹیریئیٹ کی ڈِسپنسری میں ڈاکٹر کی خالی پڑی ایک آسامی اُنہوں نے پُر کردی۔ میرا تبادلہ بھی سِول سیکریٹیریٹ میں ہوگیا۔ ہماری پہلی مُلاقات سِول سیکریٹیریٹ میں ہوئی جب وہ ایک دِن میرے خون کے دباؤ (Blood pressure) کا معائینہ کرنے کے لِئے میرے کمرے میں آئیں۔ ڈاکٹر ملوقہ ایک نہایت خوبصورت خوش خلق خوش مِزاج معالج ہیں جو میری سبکدوشی تک میری ذِیابطیس (Diabities) میرے خون کے دباؤ(Blood Pressure) میری تیز ابیت (Acidity) اور میرے خون میں چکناہٹ (Cholestrol) وغیرہ کا مسلسل اور باقاعدہ خیال رکھتی رہی ہیں۔ آج بھی کبھی کبھار فون پر یا .S.M.S کے ذریعے میں اُن سے اپنی مُستقِل بیماریوں کے بارے میں مشورہ کرتا ہوں۔ مَیں نے اپنے شِعری مجموعے بھی ڈاکٹر ملوقہ کو پڑھنے کے لِئے پیش کِئے۔

نوکری سے میری سبکدوشی کا وقت روز بروز قریب آتا جارہا تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ چشمہ شاہی جیسے عِلاقے میں رہ سکنا میرے لِئے بعد میں کبھی ممکن نہ ہوسکے گا۔ اُس عِلاقے میں مُجھے پونچھ کا اپنا آبائی گاؤں کھڑی دھرم سال ہمیشہ یاد آجاتا۔ وہی خوبانی، زرد آلوُ، آلو بخارہ،

آڑو کے پھلدار درخت، وہی خوبصورت پہاڑی عِلاقہ وہی مٹّی کی سوندھی سوندھی خوشبو لیکن مجھے اِس بات کا ملال بالِکل نہیں تھا کہ بہُت جلد یہ صحت افزا خوبصورت رہائش گاہ مُجھ سے چھِن جانے والی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دِل میں ایک مسرّت کا عالم جنم لے رہا تھا کہ بہُت جلد مَیں غُلامی کی زنجیروں سے رِہائی پانے والا ہوں۔

کشمیر بے شک جنت ہے، بے نظیر ہے اور دُنیا بھر سے لوگ بے شک یہاں سَیر و سیاحت کی غرض سے بڑے شوق کے ساتھ آتے ہیں لیکن میری زِندگی کی ایک حقیقت جس کا ذِکر مَیں پہلے کبھی کِسی سے نہ کر سکا وہ یہ ہے کہ مَیں جب بھی سڑک کے راستے کشمیر آیا، جواہر ٹنل پار کرتے ہی یعنی صوبہ جموں کی حدوُد پار کر کے صوبہ کشمیر کے عِلاقے میں داخِل ہوتے ہی مَیں ہمیشہ ایک عجیب سی ذہنی کوفت اور تناوٗ (Tension) کا شِکار ہو جاتا رہا ہوں۔ دربار موو کے پورے پورے چھ چھ مہینے مَیں ہمیشہ اِسی ذہنی کوفت بلکہ اذیّت ناک کیفیت میں گُزارتا رہا ہوں۔ انو ہمیشہ کشمیر میں خوش رہی ہے لیکن میری بیٹی روچکا بھی میری طرح کشمیر میں کبھی خوش نہ رہ سکی۔ مجھے آج تک سمجھ نہ آ سکی کہ اِس کوفت کی وجہ کشمیر میں عام طور پر پایا جانے والا بھارت مُخالِف ماحول تھا یا نوکری کے دوران میرے ساتھ پیش آنے والے کئی کئی اعلیٰ حاکموں کے یا سیاسی رہنماؤں کے منفی رویّے تھے یا کشمیر سے متعلق میرے لاشعور میں پنہاں کوئی منفی رویّہ یا پھِر کچھ اور۔ کہنے میں بڑا عجیب لگتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مَیں اُس مسرّت آمیز کیفیّت سے کبھی محظُوظ نہ ہو سکا جس کو پانے کے لِئے دُور دُور سے سَیر و سیاحت کے متوالے کشمیر آتے ہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ میری اِس بات سے میرے بہُت سے دوست مُجھ سے خفا ہو سکتے ہیں لیکن اپنے اندر کی اِس حقیقت کا بیان اگر اپنی سوانح عُمری میں نہ کروُں تو یہ میری اپنی ذات کے ساتھ ایک بہُت بڑی بے ایمانی ہو گی۔

سبکدوشی سے پہلے کی میری سِول سیکریٹریٹ کی آخری پوسٹنگ کے دوران نسیم (لنکر) سے میری قریب قریب ہر روز مُلاقات ہوتی تھی۔ ہمارے درمیان اِنتظامیہ سے لے کر مذہب، سیاست تک یعنی قریب قریب دُنیا کے ہر معاملے پر گُفتگو رہتی۔ نسیم اُس وقت کمِشنر سیکریٹری محکمہ مکانات وشہری ترقی تھیں۔ اب تک مَیں سیکریٹریٹ میں انڈر سیکریٹری، ڈِپٹی سیکریٹری، ایڈیشنل سیکریٹری، سپیشل سیکریٹری، سیکریٹری اور کمِشنر سیکریٹری یعنی سیکریٹریٹ کے ہر ایک Administrative عہدے پر کام کر چُکا تھا۔ تین دہائیوں سے زیادہ عرصے کا پیشہ ایک طرح سے میری زِندگی کا حِصّہ بلکہ انداز بن چُکا تھا لیکن کیونکہ میرے اندر تبدیلی کے لِئے ہمیشہ اشتیاق رہا ہے اب مَیں سبکدوشی کے بعد ایک نئے انداز کی زِندگی کرنے کے لِئے تیّار تھا بلکہ بیتاب تھا۔ مَیں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ سبکدوش ہونے کے بعد مَیں کوئی کام کرُوں گا یا نہیں لیکن ایک آزاد اپنی طرح کی، اور لمحہ لمحہ وقت کی پابندی سے رِہائی پا چُکی زِندگی کا مُجھے بےصبری سے اِنتظار تھا۔

اوّل اوّل تو پر ہوں کھُلے
پھِر کھُلا آسماں چاہیئے

اور پھِر ایک دِن میرے دفتر کے میز پر پڑا کیلنڈر ۳۱ مئی ۲۰۰۹ء کی تاریخ دِکھا رہا تھا۔ میری ۳۲ سال کی نوکری کے آخری دِن بارہ ایک بجے تک مَیں دفتر کے بقایا پڑے (Pending) کام نِمٹاتا رہا۔ اُس کے بعد کُچھ دیر تک تک نسیم میرے پاس رہیں۔ ہمارے درمیان میری سبکدوشی سے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ لیکن مُجھے یاد ہے اُس دِن مَیں خوش وخرم تھا۔ نسیم کوشش کے باوجود اپنی اُداسی کو چھپا سکنے میں ناکام تھی۔ نسیم نے اُس دِن بھی دُنیا و کائنات

بے زاری، روحانیت اور تصوّف وغیرہ جیسے مضامین پر اِظہارِ خیال کیا۔ مُجھے کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ نسیم آج بھی میرے لِئے ایک دوست فلسفی اور رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اپنی نوکری کے آخری دو ڈھائی گھنٹوں میں مَیں نے حتی الوسع بقایا معاملات بھی نمٹائے۔ ساڑھے چار بجے کے قریب دفتر کے کُچھ ملازمین نے ایک ہار پہنا کر اور دو ایک تحائف دے کر مُجھے جذباتی (emotional) کرنے کی کوشش کی۔ وہ گاڑی تک الوداع کہنے کے لِئے میرے ساتھ آنا چاہتے تھے لیکن مَیں نے منع کر دِیا۔

خاموشی سے بلکہ بے خبری میں بتّیس سال کا جموں و کشمیر کے سیکریٹریٹ سے میرا تعلق منقطع ہو گیا۔ کوئی الوداعی کلمات نہ کوئی جلسہ نہ جلوس۔ کئی بار سوچتا ہوں کہ جتنا بے زار مَیں نوکری کے دَوران اعلیٰ حکمرانوں سے اور سیاسی بڑے بھائیوں سے رہا ہوں اُس سے بھی زیادہ مُجھ سے وہ (ایک) نِظام یعنی system تھا جس میں مَیں یقیناً ایک misfit تھا۔ انگریزی میں کہتے ہیں .A square peg in a round hole

مُجھے یاد ہے چندر پرکاش سِنگھ نام کا میرا دوست جو ہم لوگوں کے ساتھ نومبر ۱۹۷۷ء میں انڈر سیکریٹری بھرتی ہوا تھا۔ وہ ایم ایس سی کے امتحانات میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھا۔ نہایت شریف النفس اِنسان وہ کِسی محکمے میں ڈپٹی سیکریٹری تھا جب اُس کے بھیڑیا صِفت اعلیٰ حکمران نے اُس پر ایسا جھپٹا مارا کہ جسے اُس کی شرافت برداشت نہ کر سکی۔ وہ ذہنی امراض کا شِکار ہو گیا۔ کافی عرصہ عِلاج و معالجہ کے بعد قدرے بہتر ہُوا تو بدقسمتی سے اُس کی شریکِ حیات دو چھوٹے بچّے پیچھے چھوڑ کر وفات پا گئی۔ صدمے پہ صدمے نے اُسے کمزور بنانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھ چھوڑی۔ کئی سال کی چھٹّی کے بعد اُسے ہم لوگوں نے (خاص

طور سے نسیم نے اور مَیں نے) واپس نوکری Join کرنے کی تلقین کی تو وہ کافی گھبرایا ہؤا ڈرا ہؤا اور ذہنی طور پر کمزور دِکھائی دِیا۔ مَیں اور نسیم سانبہ (جموں) میں اُس کے گاؤں کیلی منڈی یا شاید کھیری منڈی بھی گئے اور اُسے منا کر Join کرنے کے لِئے سِول سیکریٹریٹ تک لے بھی آئے لیکن بات سِرے نہ چڑھ سکی اور وہ مُستقِل طور اِس نِظام (System) سے باہر (Out) ہوگیا۔ وہ انگریزی میں کہتے ہیں "Get Out"۔

مُجھے یاد ہے کہ اُن دِنوں سی پی سِنگھ مُجھ سے کہا کرتا تھا یہ لوگ مُجھے سِسٹم سے آؤٹ کرنا چاہتے ہیں۔ مَیں اُس سے پوچھتا ''کون لوگ''؟ وہ کہتا، ''سب، جو اُوپر بیٹھے ہیں''۔ مَیں اکثر اُسے جواباً کہا کرتا تھا ''اُوپر بیٹھے لوگوں کو کہاں فُرصت کہ وہ ایک سی پی سِنگھ کے بارے میں یہ سب سوچتے ہونگے''۔

اپنی سُبکدوشی کے بعد مَیں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید سی پی سِنگھ اُن دِنوں ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اب تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ میری نوکری جِسے مَیں نے ہمیشہ ذریعہِ روزگار سے زیادہ کُچھ بھی نہیں سمجھا اوپر والے حکمرانوں کے لِئے کہیں زیادہ اہم تھی اور میرا اُس پر آخر تک قائم رہنا اُن کے لِئے ناقابلِ برداشت مجبوری تھی۔

جموں کشمیر سِول سیکریٹریٹ کو ہمیشہ کے لِئے الوداع کہہ کر مَیں چشمہ شاہی اپنے ہٹ کے لِئے آتے ہوئے راستے میں ایک جگہ سبزی وغیرہ خریدنے کے لِئے رُکا تو اپنے سامنے تین مہینے پہلے سُبکدوش ہو چُکے کمشنر سیکریٹری اور سُبکدوشی کے دِن سے ہی J&K Public Service Commissioner میں رُکن (Member) کا عُہدہ حاصل کر چکے اپنے ایک قریبی دوست کو سوال صوُرت یا میرے کئی سوالوں کے جواب کی صورت

کھڑے پایا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ وہ دِن میری سُبکدوشی کا دِن تھا مگر ہمارے درمیان رسمی کلمات سے زیادہ کچھ بات نہ ہوئی۔

سُبکدوشی کے بعد بھی دو ایک مہینے ہم سرینگر میں ہی رہے۔ انو چاہتی تھی کہ گرمیاں سرینگر میں ہی کاٹ لی جائیں کیونکہ جموں میں اکتوبر تک اچھی خاصی گرمی رہتی ہے اور خاص طور سے جولائی اگست ستمبر میں ہوا میں ضرورت سے زیادہ نمی (Humidity) ہونے کی وجہ سے موسم گرم ہی نہیں بلکہ گھُٹن بھرا بھی ہوتا ہے۔ مَیں جلدی سے جلدی سرینگر سے نِکل جانا چاہتا تھا کیونکہ افسری ماتحتی (ضروری، مجبوراً، رسماً، فرشی اور فرضی قِسم کے) سلام، جی حضوری (بلکہ چمچہ گیری) وغیرہ سے پُر رسُومیاتی زِندگی سے جی بھر چُکا تھا

اور جھکوں اب اِتنا بھی مجبور نہیں
اندر اندر پہلے سے شرمِندہ ہوں
سوچتا ہوں کہ ہوا ہو جاؤں
قید سے آج رِہا ہو جاؤں
نئی ہستی ہو نیا عالم ہو
نئے موسم ہوں نیا ہو جاؤں
دستکوں پر بھی رہوں بند کبھی
کبھی آہٹ پہ بھی وا ہو جاؤں

پہلے مَیں نے سوچا تھا کہ سُبکدوشی کے بعد نوکری سے پیدا ہونے والے دباؤ (Pressure) اور تناؤ (Tension) نہیں رہیں گے اِس لِئے ہوسکتا ہے کہ مَیں

جنتِ کشمیر کے نظاروں کا لُطف زِندگی میں پہلی بار اُٹھالوں لیکن شاید پُرانے دباؤ اور تناؤ میری طبیعت پر پہلے سے اِتنا بوجھ ڈال چکے تھے کہ میری نظر نظّارہ ہائے کشمیر سے کوئی خاص فیض حاصِل نہ کرسکی۔

جھیل اُداس پہاڑ اُداس
صنوبر اُداس سبزہ اُداس
برف اُداس جھرنا اُداس
سفید پھول اُداس کاسنی اُداس
پیلے اُداس ہیں سبھی نیلے اُداس ہیں
کالے اُداس اور سنہرے اُداس ہیں
سَیر گاہ میں داخل ہوتے ہی
مُجھے محسوس ہُوا
جیسے مناظر کی اُداسی
میرے اندر بھی داخل ہونے لگی ہے
لیکن یہاں تھوڑے قیام کے بعد معلوم ہوا
کہ یہ میرے اندر کی اُداسی ہے
جو دراصل درخت پہاڑ جھیل سب کو
ایک ایک کر کے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے

بمُشکل دو ایک مہینے جنتِ بے نظیر کے بہترین رہائشی عِلاقے میں نِکال کر ہم نے

اپنا بوریا بِستر اپنی ماروتی آلٹو میں لادا اور سرینگر جموں شاہراہ پر فرّاٹے بھرنے شروع کر دِئے۔ جواہر ٹنل سے جموں کی طرف نِکلتے ہی فضا میں جیسے ذہنی تشفّی کے نغمے گونجنے لگے۔ بانہال سے رام سُو پھِر رام بن پھِر بٹوت پھِر پتنی ٹاپ جہاں ہم کُچھ دیر کے لِئے رُکے۔ پتنی ٹاپ بھی بذاتِ خود ایک نہایت خوبصورت صحت افزا پہاڑی مقام ہے۔ پہاڑ کی اِتنی بلند چوٹی پر اِتنا بڑا میدان (Plateau) اور پھِر اِتنے خوبصورت چیڑ اور دیودار کے آسمان کو چھوُتے ہوُئے درخت۔ کُچھ سال پہلے میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ایس پی سِنگھ (سرجن) اور میری بڑی بہن ست نام کور کے داماد ڈاکٹر دلجیت سِنگھ نے پتنی ٹاپ سے چار کلومیٹر بٹوت کی طرف جموں سری نگر شاہراہ پر ہٹ (Hut) بنانے کے لِئے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا جس میں مُجھے بھی حِصّے دار بنالِیا۔ مَیں نے بھی وہاں دو کمرے کا ایک ہٹ بنالِیا ہے تاکہ نوکری کے بعد کی زِندگی میں اُس ٹھنڈے پہاڑی صحت افزا مقام پر گرمیوں کے دِن تناؤ (Tension) دباؤ (Pressure) کے بغیر گُزارے جاسکیں۔ شام تک جموں پہنچتے پہنچتے میری مندرجہ ذیل غزل کے شِعر مُجھ پر نازِل ہورہے تھے۔

چار سُو پھیلا ہوُا کارِ جہاں رہنے دِیا
رُک گئے ہم اور ہر شے کو رواں رہنے دِیا

بال و پر قائم تھے ثابت ہمّتِ پرواز تھی
کُچھ زمیں راس آگئی تھی آسماں رہنے دِیا

زِندگانی ہوگئی گوشہ نشینی میں تمام
مِل تو سکتا تھا مگر سارا جہاں رہنے دِیا

اپنی خاطِر ہم نے اِک ننّھا جزیرہ چُن لیا
اور بحرِ بیکراں کو بیکراں رہنے دِیا

کُچھ مِزاج اپنا ہی تھا بیتابؔ اُن سب سے جُدا
بس اکیلے چل دِیے ہم کارواں رہنے دِیا

اسی قلم سے :-

۱۔ پیش خیمہ (شعری مجموعہ ۱۹۸۰ء)
(جموں کشمیر کلچرل اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۲ء)

۲۔ سراب در سراب (شعری مجموعہ ۱۹۸۴ء)

۳۔ خود رنگ (شعری مجموعہ ۱۹۹۵ء)

۴۔ دی تھرڈ سٹرینڈ (The Third Strand) (۱۹۹۹ء)
(مصنف کی نظموں کا انگریزی ترجمہ ناشر - رائٹرس ورکشاپ کلکتہ)

۵۔ کیکٹس اور گُلاب (۱۹۹۹ء - مصنف کی غزلوں کا مجموعہ بحروفِ دیوناگری)

۶۔ موجِ ریگ (مجموعۂ غزلیات ۲۰۰۳ء)
سینٹرل اِنسٹی چیوٹ آف انڈین لینگویجز میسور کا بھارتی بھاشا سمّان (۰۵-۲۰۰۴)

۷۔ نظم اکیسویں صدی (شعری مجموعہ ۲۰۰۸ء)
(یوپی اُردو اکادمی ایوارڈ - ۲۰۰۹ء)

۸۔ شہرِ غزل (مجموعۂ غزل بحروفِ دیوناگری ۲۰۰۸ء)
(سینٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ بھارت سرکار کا ہندی تر لیکھک پُرسکار - ۲۰۰۹ء)

۹۔ فلک آثار (شعری مجموعہ ۲۰۱۳ء)

۱۰۔ ایک جزیرہ بیچ سمندر (غزلیات ۲۰۱۹ء)

ملنے کا پتہ :-

۱۔ رائٹرس فورم 69/1A ساؤتھ ایکسٹینشن ترِکُٹا نگر جموں توی - ۱۸۰۰۱۲۔

خودنوشت نگاری کا فن اس لیے زیادہ مشکل ہے کہ اس کے رقم کرنے میں بیک وقت کئی تشویشات لاحق ہوتی ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب نے اپنی اس خودنوشت ''میرے حصے کی دنیا'' میں ان تشویشات کا سدباب کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے ایسے واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو ان کی زندگی، معاشرے میں ان کی اہمیت اور اثرات کی بھی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اس طرح اس تشویش کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ کوئی اہم واقعہ بیان ہونے سے رہ گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے کہیں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ واقعہ کو من وعن پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ تشویش بھی باقی نہیں رہتی کہ جذباتی طور پر یا کسی مصلحت کے تحت کسی واقعہ کو ترمیم واضافہ کے ساتھ اپنی زندگی کے مثبت پہلو کو نمایاں کرنے کے انسلاک کی غرض سے رقم کیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اسلوب ایسا ہے جو 'دل سے نکلے دل تک پہنچے' کے عین مصداق ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے اوصاف مل کر اس خودنوشت کو نہ صرف اول تا آخر دلچسپ بنائے رکھتے ہیں بلکہ اعلیٰ معیار کے ساتھ ہمیں زندگی کرنے کے متعلق کئی سبق بھی عطا کرتے ہیں کہ کن اقدام سے زندگی اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے پہلو نکلتے ہیں اور کن سے زندگی دشوار اور معاشرے کے لیے ضرر رساں ہو جاتی ہے۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی یہ خودنوشت جہاں ان کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے وہیں خودنوشت نگاری کے فن میں اہم اضافہ بھی۔ ''میرے حصے کی دنیا'' کے مطالعہ سے اس کی توثیق کی جا سکتی ہے۔

جاوید انور (ناشر)

ISBN 978-81-942142-0-05
978-81-942142-0-5

Tahreek-e-Adab Publication
Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata
Manduadeeh Bazar, Varanasi - 221103 (U.P.) INDIA
Cell : 0091-993-595-7330
e-mail : tahreekeadab2008@gmail.com